ایک معلم کی زندگی

ایک معلم کی زندگی

عبدالغفار مدھولی مدرس مدرسہ ابتدائی
جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر دہلی

حصہ اول

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ دہلی

بار اول (۵۰۰) سنہ ۱۹۴۳ء قیمت عہ

نذر

جامعہ کے بچوں کے لئے جن کے
کاموں کو سلسلہ وار جوڑنے سے "میری زندگی"
بنی ہے
اس فہرست میں اُس رازدار ساتھی
کا نام شامل کرنے کو جی چاہتا ہے جس نے مجھے
جامعہ پہنچنے میں مدد دی

عبدالغفار مُدہولی
۲۹؍اکتوبر ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

فہرست تصاویر

کُھٹ کُھٹ کئے جاؤ تو
کُچھ نہ کُچھ ہو ہی جاتا ہے
(ذاکر حسین خاں)

آپ کا ساتھی ، عبدالغفار مدھولی

تعارُف

جب میں چار برس کا تھا میرے ماموں (ارشاد الحق صاحب) بہانے بنا کر مجھے دہلی لائے اور جامعہ میں داخل کر دیا پہلی جماعت میں عبدالغفار صاحب پڑھایا کرتے تھے میں جب پہلے دن مدرسے گیا تو کچھ گھبرایا مگر ماسٹر صاحب نے مجھے ہر طرح سے بہلائے رکھا میرے ساتھ کبھی کھیلتے کبھی گانے لگتے اب مدرسے میں میرا جی لگنے لگا صبح صبح مدرسے جانے کی جلدی رہنے لگی جب میں مدرسے پہنچ جاتا تب اطمینان ہوتا۔ہم کبھی پڑھتے، کبھی لکھتے کبھی ماسٹر صاحب کے کندھوں پر چڑھ جاتے۔باری باری سے وہ ہمیں گود میں لئے لئے ساری اقامت گاہ میں گھومتے رہتے اور باتوں باتوں میں کبھی کچھ کبھی کچھ سکھا دیتے اسی طرح ہنستے کھیلتے سال گزر گیا اور میں پہلی سے

دوسری، دوسری سے تیسری یہاں تک کہ ثانوی اول رساتویں جماعت
میں آ گیا، اور اب ثانوی چہارم یعنی میٹرک کی جماعت میں ہوں
ماسٹر صاحب مدرسہ ابتدائی میں کام کرتے ہیں پھر بھی وہ
اپنے پُرانے شاگردوں سے ملنے کے لئے ہفتہ میں ایک دن منزل
ثانوی کی اقامت گاہوں میں چلے آتے ہیں اس دن کا ہمیں انتظار
رہتا ہے کیونکہ وہ ہمیں اسی طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح
مدرسہ ابتدائی کی طالب علمی کے زمانے میں، ماسٹر صاحب نے بچوں
کے لئے کئی کتابیں لکھی ہیں ان میں سے ایک کتاب جبکہ میں پہلی جماعت
میں تھا میرے نام منسوب کی ہے وجہ خود ہی بتلائی ہے یعنی بڑا ہو کر
یہ سمجھوں کہ چھوٹے بچوں کی ایسی ہی قدر کی جاتی ہے جیسے بڑوں کی
اور آج مجھ سے وہ کہنے لگے "میاں مصعب، تم اور تمہارے ساتھی
ہماری "کتاب زندگی" کے باب میں بڑا اچھا ہو اگر اس کتاب کا تعارف
بھی تم ہی اپنے دوستوں سے کرا دو۔" یہ کتاب ماسٹر صاحب کی آپ بیتی
ہی نہیں بلکہ جامعہ کی دلچسپ اور رواں کہانی ہے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء
سے آج تک یعنی اکیس سال کے حالات اور تعلیمی تجربوں کا نچوڑ
کہانی کی صورت میں ہے یقین ہے کہ بچے اور بڑے دونوں اسے دل
لگا کر پڑھیں گے۔"

ماسٹر صاحب نے یہ کتاب منزل ابتدائی کی اونچی جماعتوں اور ثانوی کے لڑکوں کو مخاطب کرکے لکھی ہے وہ اپنے عمل کے ذریعے، منزل ابتدائی کے بچوں کو تو بہت کچھ سمجھایا کرتے ہیں لیکن ان ہی کاموں میں پختگی منزل ثانوی میں جاکر پیدا ہوتی ہے یہ بہت اچھا ہوا کہ ماسٹر صاحب نے اپنے خیالات اور عمل کو تحریری شکل بھی دیدی ہے اس سے ثانوی کے طلبا کو اپنے کام پر غور کرنے کا موقع ملتا رہے گا

ماسٹر صاحب کے متعلق دو باتیں خاص طور پر ظاہر کردوں، ایک تو یہ کہ وہ بچوں سے محبت کرتے ہیں انھیں ہمیشہ خوش رکھتے ہیں دوسرے یہ کہ وہ اپنی دھن کے پکّے ہیں پچھلے دنوں میر انیس کا یہ شعر پڑھا

جب آپ روٹھتے ہیں تو مشکل سے منتے ہیں
اچھا سوار ہو جیے ہم اونٹ بنتے ہیں

تو مجھے اپنے بچپن کا وہ زمانہ یاد آگیا جب میں اُن کے کندھوں پر سوار ہوتا تھا تو وہ بہت خوش ہوا کرتے تھے، خدا انھیں دیر تک زندہ رکھے آمین

آپ کا ساتھی، مصعب الرحمٰن
ثانوی چہارم (میٹرک)
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، دہلی

۲۹ اکتوبر ۱۹۴۱ء

کہانی کیوں لکھی

بچّو! رات کی فرصت میں جب بھی موقع ملے اپنے شاگردوں کو قصّے کہانیاں سنایا کرتا ہوں ایک دفعہ جی میں آئی کہ جگ بیتی تو سنایا کرتا ہوں اس دفعہ "آپ بیتی" سنا دوں میں سناتا گیا لڑکے سنتے گئے، بیچ بیچ میں کبھی ہنستے تھے کبھی اُداس ہو جاتے تھے میں نے دل میں کہا لو بھائی یہ تو کہانیوں جیسا مزہ آ رہا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس طرح پورا ایک گھنٹہ گزر گیا، میں نے لڑکوں سے کہا "بھائی میں اب تھک گیا ہوں باقی حصہ پھر کبھی سناؤں گا" لڑکوں نے یہ بات یاد رکھی پھر سے جب موقع ملا تو کہنے لگے "ہاں صاحب باغیچہ میں اب سبزہ ہی سبزہ نظر

آنے لگا، پھر؟ میں نے اس سے آگے سنایا، جب اور جماعت
والوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی پیچھے پڑ گئے انھیں بھی سنایا، سال
شروع ہونے پر نئے لڑکے مجھ سے کہا کرتے ہیں

"سنا ہے، ماسٹر صاحب آپ "ثریا کی گڑیا" "نانی اماں کی
کہانی" اور "آپ بیتی" بڑے مزے سے سنایا کرتے ہیں!

"ہاں سنایا تو کرتا ہوں!"

"اس دفعہ ہم بھی سنیں گے اس جمعرات کو نہ بھولیے"

"سنا تو دوں لیکن پرانے لڑکے کہیں گے وہی پرانی
باتیں سنایا کرتا ہے" اس پر جماعت میں شور ہوتا ہے" جی نہیں
جی نہیں"

"ہم نے آپ سے کب کہا ہے یہ نہیں سنیں گے، خواہ مخواہ
کا الزام!"

بات یہ ہوتی ہے بھی پرانے لڑکے نئے لڑکوں کو اکسا
ہیں اور مجھے ہر سال آپ بیتی سنانی پڑتی ہے پھر لطف یہ
کہ جب سنا چکتا ہوں تو پرانے لڑکے کہا کرتے ہیں" صاحب
اس دفعہ آپ نے بھٹیاری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ کوئی کہتا
"اور جرمانے میں ایک ہفتہ تک دال کھانی پڑی اس کا

کہیں ذکر ہی نہیں آیا !"

میں کہتا ہوں "بھائی تمھارے جیسا دماغ کہاں سے لاؤں جو ایک ایک بات یاد رکھوں" اس پر طعنہ دیا کرتے ہیں "جی ہاں جب ہم بھولتے ہیں تو آپ کہا کرتے ہیں بڑی بات ہے اور جب خود بھولتے ہیں تو کہتے ہیں تمھارے جیسا دماغ کہاں سے لاؤں"

میں نے سوچا یہ ہر سال کا جھگڑا ٹھیک نہیں، اب کی دفعہ فرصت ملے تو اسے لکھ ہی لوں جس طرح اور کہانیاں کتابوں سے سُنایا کرتا ہوں یہ بھی سُنا دیا کروں گا یہ بھولنے بھلانے کا جھگڑا نہیں رہے گا، پھر باہر کے بچوں کا بھی خیال تھا خدا کے فضل سے یہ کام ہو ہی گیا ، لو سُنو ——————

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچپن کے حالات

میری پیدائش ۱۹۰۵ء عیسوی (مطابق ۱۳۲۳ھ ہجری) کی ہے مجھے بچپن ہی سے کھیل کود سیر تماشے کا شوق تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ پڑھنے لکھنے میں بھی جی لگتا تھا میرے ساتھی کھلنڈرے تھے ان کے ماں باپ چاہتے تھے کہ وہ بھی میری طرح رہا کریں جب کبھی میں اپنے ساتھیوں کے گھر جاتا تو ان کے ماں باپ کہا کرتے کہ اگر وہ میرے ساتھ رہیں تو پوچھ کچھ نہ ہوگی۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ طاقتور لڑکے جو مجھے تنگ کرتے تھے اب میری بات ماننے لگے

یوں تو سب ہی طرح کے کھیل تماشے دیکھا کرتا تھا مگر [illegible]

تماشوں کی نقل کا بڑا شوق تھا شاید اس لئے کہ اس کی نقل آسان تھی اور ماں باپ بھی خفا نہیں ہوتے تھے نرت اور سنگیت کی نقل سے غالباً میں اور میرے ساتھی بدنام ہو جاتے۔ نقل کسی بڑے بند احاطے میں اس اہتمام سے ہوتی تھی کہ شاید ہی کسی چیز کی کسر رہ جاتی ہو کرتب دکھانے والے طرح طرح کے جانور، مالک، ٹیبز پولیس، ٹھیکہ لینے والے، تماشہ دیکھنے والے، گاؤں کے افسر دنگا کرنے والے، صلح کرانے والے، سب کے سب محلے ہی کے لڑکے ہوتے تھے

ہماری ٹولیاں ہندو، مسلمانوں کے نام سے نہیں ہوتی تھیں بلکہ محلے کے رہنے والے ہندو مسلمانوں کے بچوں کی ملی جلی ٹولی ہوتی تھی، ہمیں تہوار کے آنے کی خوشی ہوتی تھی خواہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے، دُھول ایک غیر معروف (یا غیر مشہور) مقام ہے لیکن اُس زمانے میں وہاں محرم اور ہولی جس طرح منائی جاتی تھی اگر ان کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھوں تو الف لیلہ کی کہانی کا ایک حصہ معلوم ہو گا

دُھول (ناندیڑ) چار بڑے محلوں میں تقسیم ہے (۱) محلہ کوٹ (۲) محلہ پنجہ شاہ (۳) قاضی پورہ (۴) مفتی پورہ، ان سب کی آبادی آٹھ ہزار

ہے. جس طرح آجکل ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کے نام پر ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش ہوتی ہے، اسی طرح یہ چاروں محلے ہر کام میں اپنی برتری کا خیال رکھتے تھے فرق یہ تھا کہ برتری کی یہ کوشش آجکل کی طرح نفرت کے ساتھ نہیں بلکہ محبت کے ساتھ ہوتی تھی، اگر کبھی لڑائی ہوتی بھی تو محلے بندی کی بنیاد پر مذہب کا معاملہ بیچ میں آتا ہی نہ تھا یہی بات ہمارے کھیلوں میں بھی تھی.

ہر ایک محلہ کا ایک رنگ مقرر کر دیا گیا تھا (۱) لال (۲) نیلا (۳) گلابی (۴) ہرا، محرم کے زمانہ میں (پانچویں سے دسویں تک) ان ہی رنگوں کا مظاہرہ ہوتا تھا جسے "رنگ نکلنا" کہتے تھے بقرعید کے دوسرے دن سے راتوں کو اس کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں کسی احاطے میں تیاری کرنے والے بچے اور بڑے جمع ہو جایا کرتے تھے رنگ برنگ کے کاغذ اور بانس سے کوئی چار فٹ اونچے درخت (جھاڑ) بنا کر بانس کی دو چوکیوں میں لگا دیتے تھے ایک درخت کا وزن اتنا ہوتا کہ ایک بڑا لڑکا آسانی سے اٹھالیتا دیوالی میں چراغ جلانے کے لئے جس طرح کی قندیلیں بنائی جاتی ہیں ویسی ہی دو قندیلیں بنا کر ان میں ابھری ہوئی چار آنکھیں لگا دی جاتی تھیں ان قندیلوں میں آدمی کے قد کے برابر جوہی کے پھولوں کی لڑیوں کا

ایک سرا اوپر لٹکا کر نیچے ایک اور بڑے سے گھیرے میں دوسرا
سرا ٹانک دیا جاتا تھا۔ اِن کا نام "بیرق" رکھا گیا تھا گاؤدم شکل کی
ڈھال بنا کر اِس کے آس پاس خوبصورت جھالر لگا دی جاتی تھی
بیچ میں محلہ کا نام لکھ دیا جاتا تھا اسے "آفتاب گیری" کہتے تھے
اِن سب چیزوں کو علیحدہ علیحدہ چھڑیوں باندھ دیا جاتا تھا،
کپڑے کے دو چھوٹے سے جھنڈے بھی بنا لیتے تھے۔ سب سے
خوبصورت چیز "ٹنگری" بنائی جاتی تھی دو فٹ لمبی ایک فٹ
اونچی اور اتنی ہی چوڑی، اِس کے اوپر رنگ برنگا بہت قیمتی
کام ہوتا تھا۔ اوپر پھولوں کا چھوٹا سا گلدستہ لگا دیا جاتا۔ یوں سمجھو
کہ بہت ہی خوبصورت نمونے کا مزار تیار کیا جاتا۔ دو اچھے ناچنے
والوں کو جوگی بنایا جاتا تھا۔ سر پر رنگین ٹوپی آنکھوں کے اطراف
سنہری کاغذ، کانوں میں بالے، بدن پر کفنی، پیروں میں گھنگرو، اِن سب
چیزوں کی تیاری میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا کہ وہی
رنگ غالب رہے جو اس محلے کے لئے مخصوص ہے یعنی کسی ایسی
چیز کو دیکھنے سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فلاں محلے کی چیز ہے۔ شوقین
لوگ زیادہ تر لڑکے، اپنے کرتوں کو محلے کے رنگ میں رنگ لیتے
تھے، پانچویں کا دن گزرنے کے بعد رات کو "ماتا بابا" [illegible] ذات

کے بجانے والوں کا باجا جس میں بڑی سی ڈفلی، شہنائی، سُر
دینے والا .... شامل ہوتا ہے) تاشا، ہارمونیم، طبلہ
جوگی، قندیلیں، جھاڑ، جھنڈے، آفتاب گیری، ہنگری، مشعلیں
لے کر محلے کے لوگ کیا ہندو اور کیا مسلمان ایک ہی جگہ جمع ہو کر
جلوس کی شکل میں نعرے لگاتے ہوئے نکلتے ہیں۔ خیال تو کرو
آگے آگے تاشا پھر بانک باجا، سروں سے اوپر رنگ برنگ کی
وہ سب چیزیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے تمام لڑکوں کے ایک ہی
طرح کے کرتے گھنگھرو والے دو جوگی گانے والے چھوٹے اور
بڑے لوگ، لوگوں کا کثیر مجمع چلا جا رہا ہے پھر اس وقت تو
بڑا ہی لطف آتا ہے کہ سڑک کے ایک سرے سے ایک محلہ
کا رنگ آ رہا ہے تو دوسرے سرے سے دوسرے محلہ کا۔ دونوں
محلوں میں وہی چیزیں ہیں فرق صرف رنگ کا ہے پھر یہ لوگ
سڑک کے دونوں کناروں پر اپنے اپنے رستے چلے جاتے ہیں
شہر کے معزز لوگوں کے یہاں ان "رنگوں" کا استقبال ہوتا ہے
ایک وقت میں ایک محلہ کے لوگ ان کے احاطے میں جمع ہو جاتے
ہیں سامنے فرش پر گھر والے اور ان کے مہمان ہوتے ہیں کچھ
فاصلے پر یہ رنگ والے بیٹھ جاتے ہیں، ہارمونیم طبلہ کے ساتھ

گانے والوں کی جماعت خاص سُروں میں سوز پڑھتی ہے،
سامنے دونوں جوگی پیر ملا کر ناچتے ہیں ایک میزبان کے ہاں
ایک گھنٹہ تک یہ محفل رہتی ہے پھر بستی کے دوسرے میزبان
کے ہاں جاتے ہیں جن میں ہندو گھرانے بھی ہوتے ہیں، سب
میزبان ہندو بڑی عقیدت کے ساتھ ان گانوں کو سُنتے ہیں
بعض دفعہ اِن گانوں میں شہادت کی طویل داستان اِس خوبی
کے ساتھ بیان کی جاتی ہے کہ تمام لوگوں پر سنّاٹا چھایا رہتا ہے
صرف جوگی کے گھنگرو، طبلے، ہارمونیم کے سُر اور گانے والوں کی
آوازیں سنائی دیتی ہیں ہر ایک محلے والے یہ کوشش کرتے
ہیں کہ ہمارا کام دوسروں سے بڑھ کر رہے نویں کا دِن گزرنے
کے بعد رات کو آخری جلوس نکلتا ہے میزبان مناسب رقم
علیحدہ سے دے دیتے ہیں جس سے "رنگ" کا پورا خرچ
نکل آتا ہے، ہمارے محلہ کے اشرف خاں صاحب مرحوم
خاص "لے" میں جس عمدگی کے ساتھ شہادت کی داستان سازِ دُہل
کے ساتھ بیان کرتے تھے وہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ آپ طبلہ
کے ماہر بھی تھے

میں نے بچپن ہی سے اِن رنگوں میں خاص حصہ لیا ہے

بقرعید کا زمانہ آتے ہی جہاں کہیں بڑوں کو جمع ہوتے دیکھتا
وہیں چپکے سے بیٹھ جاتا اس خیال سے کہ شاید "رنگوں" کی
تیاری کا ذکر ہو، اگر گفتگو میں یہ بات نہ آتی تو اُداسی رہتی
لیکن جہاں کہیں ایسی گفتگو سُنی دوڑا ہوا ساتھیوں کے پاس جا کر
انھیں خوشخبری سناتا، جوں جوں بڑا ہوتا گیا اِن چیزوں میں عملاً
حصہ لیا، کئی سال جوگی بنا ہوں میرے ساتھی بہت اچھا ناچتے
تھے لیکن میرا ناچ بھی بُرا نہ ہوتا، بعض دفعہ بڑے لوگ رنگوں
کی تیاری میں پہل کرنے میں دیر لگاتے مجھے اِس سے بڑا غصہ
آتا، اِن لوگوں سے بحث کرتا کہ وہ دیر کیوں لگا رہے ہیں
وہ میرے ساتھیوں کی شکایت کرتے کہ یہ لوگ کام میں ڈھیل
ڈال دیتے ہیں، رنگ نکالیں تو کیسے نکالیں!! میں ساتھیوں
سے کہتا "کمبختو تمھارے ڈھیل ڈالنے سے کام خراب ہو رہا ہے
کہتے ہیں کہ اِس سال "رنگ نہیں نکلے گا" اِس سے ساتھیوں میں
کھلبلی مچ جاتی اور وعدے ہوتے کہ ہماری طرف سے کوتاہی نہ
ہوگی، جب میری عمر سولہ سترہ برس کی ہوئی تو بڑوں کی
خوشامد کرنے کی بجائے مجھے یہی اچھا معلوم ہوا کہ اس کام کی
پوری ذمہ داری اپنے سر لوں۔ ساتھیوں سے کام لینا جانتا تھا

میں نے اپنے ہم عمروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ہم خود ہی
اس کام کو چلائیں گے،، کام لینے میں اچھی خاصی
دردسری کرنی پڑتی تھی ایک ہی وقت میں کئی ٹولیاں پھول پتیاں
بنانے، گتے کاٹنے پھول پتوں کو جوڑنے، لڑیوں میں پرونے کا
کام کرتی تھیں۔ایک طرف سازوں کے ساتھ گانے کی مشق ہوتی تھی
لڑکے جس طرف دلچسپی زیادہ دیکھتے اُدھر ہی چلے جاتے۔ اگر
چُپ رہو تو ایک کام ٹھیک سے ہو جاتا ہے مگر دوسرے کام
رہ جاتے ہیں، اس لئے لڑکوں کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری
جگہ بٹھانا پڑتا تھا بعض دفعہ ساتھی کہتے "بھائی دو ایک گانے
سن لینے دو پھر پہلے سے زیادہ کام کریں گے" کبھی تو میں
خوشی سے اجازت دے دیتا کبھی غصے ہو کر منہ پھلائے ایک طرف
بیٹھ جاتا، اس پر لڑکے یہ کہتے ہوئے اپنی اپنی ٹولیوں میں چلے
جاتے "اچھا بھائی خفا نہ ہونا جتنی دیر گانا سنتے رہے اس کی
کمی تھوڑی دیر میں پوری کئے دیتے ہیں"

جلوس نکلنے کے دن تو میری حالت عجیب وغریب رہتی
خوشامد، ڈانٹ ڈپٹ، غصہ، سمجھانا غرض کہ جیسا آدمی سامنے
ویسا ہی کرنا پڑتا، کبھی معاملہ میں ناکامی ہوتی تو میں ہمت ہار کر بیٹھ جاتا

بیٹھتا تھا، کام لینے کے لئے کسی اور کے پاس چلا جاتا اس سے پہلا شخص اور بھی شرمندہ ہوتا اور میرے پیچھے پیچھے لگا رہتا شاید کوئی اور کام سپرد کروں اس طرح وقتی تکلیف بھی دور ہو جاتی اس میں ہمیں کامیابی ہوئی، پھر تو بڑے لوگ خود ہی ہمارا ہاتھ بٹانے لگے، البتہ اشرف خاں صاحب مرحوم کی بہت خوشامد کرنی پڑتی تھی کیونکہ ان سے اچھا گانے والا اور کوئی ملتا نہ تھا یہ لڑکوں کو سکھاتے بھی بہت اچھا تھے اچھی آواز والے کئی لڑکوں نے ان سے گانا بھی سیکھا ہے ان میں میرے ایک شاگرد امیر خاں صاحب بھی ہیں اشرف خاں صاحب میرے متعلق کہتے تھے کہ آواز بری نہیں ہے گانا نہیں جانتا مگر شوق ہے اس لئے سیکھنے والوں میں شریک کئے لیتا ہوں۔ ہمارے محلہ کا نام "محلہ کوٹ" ہے اور نشانی سرخ رنگ۔ رات کی روشنی میں یہ رنگ صاف نظر آجایا کرتا تھا

اس زمانہ میں دوسرے محلے کے لوگ ذرا سرچڑھا دکھایا کرتے تھے، میں نے بھی اپنے ساتھیوں میں اس کی کوشش کی مگر ہمارا محلہ پٹھانوں کا ہے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ لڑکوں کو لڑکیاں بنانے سے کیا فائدہ؟ "رنگ" لگانے کی ذمہ داری

رے لی تھی اس طرف توجہ کرنے کا زیادہ موقع بھی نہ ملا اور
ہاں دوسرے محلوں میں جوگی کے ساتھ جوگن بھی ہوا کرتی تھی
مگر ہمارے محلے والے ایسے اکھڑ کر دونوں ناچنے والے "جوگی"
ہی رکھتے تھے، کہتے تھے ہمارے بزرگوں نے کچھ سوچ کر ہی
جوگن کا رواج نہیں رکھا ہے ہم بھی ان ہی کی تائید میں دلیلیں
دیا کرتے تھے

ہولی سے کوئی بارہ دن پہلے پھاگن کی چاندنی راتوں
میں محلے کے لوگ "گھونسہ بازی" کی مشق کے لئے میدان میں
جمع ہو جاتے تھے دو فریق بنا کر درمیان میں رسّا تھام لیا جاتا
اسے "پیڑی" کہتے تھے بڑے بزرگ "چھٹے" (دیہاتی سگار)
سلگائے ٹولیوں میں بیٹھ جاتے اور کہتے

"ارے بھائی ابھی تو پہلی راتیں ہیں ہم لوگ سیکھے سکھائے ہیں
مشق تو تم جیسے چھوکروں کو کرنی چاہیئے جاؤ کھیلو ہم یہاں سے
دیکھ رہے ہیں" پھر یہ لوگ اپنے بچپن کے قصے کہانیوں میں
مصروف ہو جاتے ان میں سے چند ایک آدمی ہمیں سکھانے
کے لئے چلے آتے، رسّے کے قریب صف در صف آمنے سامنے
اس طرح کھڑے ہو جاتے کہ سب سے کم عمر یعنی دس بارہ سال کے

لڑکے آگے آگے پھر بڑوں کی قطاریں (یہ بھی عمر کے لحاظ سے)
پیچھے کھڑی ہو جاتیں۔ صرف چہرے اور پیٹ میں مارنے کی اجازت
نہ تھی اس بات کی پابندی بھی تھی کہ اپنے سے چھوٹی عمر والے پر
ہاتھ نہ اٹھائیں، ان پابندیوں پر اعتبار تھا اس لئے چھوٹے
بڑے بے دھڑک "پیڑی" کے قریب جمع ہو جاتے تھے کھلانے
والا کہتا فلاں شخص ابتدا کرے بس حکم ملتے ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر
پہلے ایک شخص گھونسے مارتا پھر دوسرا تیسرا چوتھا ذرا سی دیر
میں دنا دن کی آوازیں شروع ہو جاتیں کھیلنے والوں کو پچھلی قطار
والے شور مچا کر ہمت دلاتے ہیں چھوٹے لڑکوں کا جی بھرتے ہی
وہ اپنے آپ پیچھے ہٹنے لگتے ہیں ان کی جگہ پیچھے کی صف والے
کود پڑتے ہیں حتیٰ کے تمام بڑے لوگ اسی گھونسہ بازی میں
مشغول ہو جاتے ہیں وہ "پیڑی" جسے لوگ تھامے رہتے ہیں ایک
فریق کے زور پکڑنے سے پیچھے ہٹتی جائے یہاں تک کہ دوسرا فریق
اسے سنبھال نہ سکے تو کھلانے والے لوگ جو درمیان میں موجود
ہوتے ہیں اپنے اپنے رومال اونچے کر دیتے ہیں اور آواز بھی
لگاتے ہیں "بس ہاتھ روک لو" رفتہ رفتہ گھونسوں کی آواز کم ہو جاتی
ہے تھوڑی دیر کے لئے پھر ٹولیوں میں آ کر دم لیتے ہیں جب اس کھیل

سے جی بھر جائے تو سب لوگ چاندنی راتوں میں کوئی بارہ ایک
بجے کے قریب اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں یہ سلسلہ بارہ راتوں تک
جاری رہتا ہے اور ہر محلہ اپنی جگہ مشق کرتا ہے۔ دھولنڈی کے
دن سہ پہر میں بہت بڑے میدان میں پوری بستی کا آخری مقابلہ
ہوتا ہے دو محلے ایک طرف اور دو محلے ایک طرف ہو جاتے ہیں
فریقوں کی تقسیم ہندو مسلمانوں کے حساب سے نہیں ہوتی بلکہ محلے
کے حساب سے ہوتی ہے تحصیلدار، امین (انسپکٹر) ڈاکٹر، دوسرے
عہدے دار، وکیل، مدرس، بستی کے اور پڑھے لکھے لوگ ایک
اونچے مقام پر بیٹھ جاتے ہیں اس دن چھوٹے لڑکوں کو کھیلنے کی
اجازت نہیں ہوتی صرف بڑے اپنے "جوہر" دکھاتے ہیں کھیل کا
منظر وہی رہتا ہے جو میں بیان کر چکا ہوں فرق کم زیادہ کا ہوتا
ہے بڑے معرکے کا رن ہوتا ہے جو لوگ زخمی ہوتے جاتے ہیں
گھروں یا ہسپتالوں میں پہنچا دئے جاتے ہیں چھوٹے لڑکے بہت
خوش خوش آوازیں لگاتے ہیں کہ "اور پڑے" "اور پڑے" شام کو
کُشتی کے مقابلے ہوتے ہیں اگر ہمارے محلہ کا ہندو پہلوان دوسرے
محلہ کے مسلمان پہلوان کو پچھاڑے تو ہمیں بہت خوشی ہوتی تھی

ایک دفعہ میرے بھائی صاحب "گھونسہ بازی" میں بُری طرح

پٹ کر گھر لوٹے والدہ صاحبہ نے ہمدردی میں مرہم پٹی تو کی لیکن رواج کے آگے وہ بھی مجبور تھیں پھر والد صاحب گھر میں موجود تھے بیچاری کو بھائی صاحب سے ہمدردی کرنے کا زیادہ موقع ہی نہ ملا

"گھونسہ بازی" کے کھیلوں میں میں نے بھی حصہ لیا ہے لیکن جوں جوں عمر زیادہ ہوتی گئی خود نہ کھیلا کیونکہ میرے ساتھی بہت طاقتور ہوگئے تھے لیکن اس کھیل میں میں نے کبھی نفرت کا اظہار نہیں کیا بلکہ لوگوں کو اُکسانے کھیل جمانے میں پہلے سے زیادہ حصہ لیتا تھا ۱۹۲۳ء میں ریاست نے محرم اور ہولی کے اِن کھیلوں کو لہو لعب[1] میں شامل کرکے قانوناً ان کی ممانعت کردی جس کا ہم سب کو بہت افسوس ہوا البتہ کشتی کی اجازت باقی رکھی

---

(۱) ہر زمانے میں لوگ اپنی سمجھ کے مطابق رسومات مناتے ہیں ان کے نزدیک یہ چیزیں لہو لعب میں داخل نہیں ہوتیں بلکہ ایک اخلاقی اور روحانی مقصد رکھتی ہیں ان کو بند کرتے وقت ہم اگر ان کا کوئی اچھا بدل پیش کریں اور رفتہ رفتہ عوام کو اُس معیار پر لائیں جو ہونا چاہیئے تو یہ بھی اصلاح ہے ورنہ زندگی پھر خالی خالی سی ہوجاتی ہے اور نتیجہ اُلٹا ہوتا ہے

ڈھول کی "بھا نا متی" (جادو) بھی بہت مشہور رہے مگر اب اس کا
زور کم ہوگیا ہے انجمن کے مولوی عبدالحق صاحب اُس زمانے میں
ہمارے علاقے کے صدر مہتمم تعلیمات تھے آپ کو اس کے کئی ولتے
معلوم ہیں جب کبھی میں اِن سے ملتا ہوں تو "بھا نا متی" اور "گھولنسہ بازی"
کا مذاق چھیڑ دیتے ہیں، پُرانی چیزیں ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے مولوی صاحب
کو لُطف آتا ہے

سچ تو یہ ہے کہ بچپن ہی سے محنت و مشقت کی زندگی اور طرح طرح
کی مصروفیات نے میری زندگی پر بہت اثر ڈالا ہے

ہولی کے دن صبح سے دوپہر تک ایک اور دلچسپ ہنگامہ
ہوتا ہے۔ اُپلے جمع کرنے کے لئے بستی میں گاڑیاں نکلا کرتی ہیں ان کے
پیچھے پیچھے لڑکے شور مچاتے چلتے ہیں جو لوگ دروازوں کے سامنے
اپنے حصے کے اُپلے رکھدیں انھیں لڑکے کچھ نہیں کہتے ہیں اور جو ایسا
نہ کریں اِن کے گھروں میں گھُس کر بہت بڑی تعداد میں اُپلے نکال
لاتے ہیں اگر گھر میں اُپلے نہ ہوں تب تو گھر والا اعتراض کرسکتا ہے
کہ بلا وجہ پریشان کیوں کیا گیا ہے ورنہ اسے اپنی غلطی تسلیم کرنی پڑتی
ہے اِس لوٹ میں ہندو مسلمان سب مل کر حصہ لیتے ہیں اسی طرح
دھولنڈی کے دن ایک ساتھ رنگ کھیلتے ہیں زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ

ان کا رواج بھی بدلتا جا رہا ہے۔ میں نے بھی ان چیزوں میں حصہ لیا ہے

شب برات کی پھلجھڑیاں، پٹاخے، مہتابی سب ہی جانتے ہیں لیکن ہمارے زمانے میں دو چیزیں اور مشہور تھیں ایک "توٹا" دوسرے "ہنگن گولہ" توٹا اس طرح بنایا جاتا ہے کہ سگریٹ نما کاغذ کے خول میں اُڑنے والا مسالحہ بھر کر چمڑے کی جھلی اوپر چڑھا دی جاتی ہے سرے پر آگ لگا کر ہوا میں چھوڑ دیتے ہیں یہ شوں شاں کرتے ہوئے دُور تک جاتا ہے "ہنگن گولہ" بنانے کی یہ ترکیب ہے کہ آم کی گھٹلیوں میں اُڑنے والا مسالحہ بھر کر سرے پر بتی لگا دیتے ہیں چھوڑتے وقت بتی میں آگ دے کر دُور پھینکتے ہیں یہ راستے ہی میں روشن ہو کر دُور جا کر پھٹتا ہے۔ یہ چیزیں بستی سے باہر جا کر چھوڑا کرتے تھے کبھی دو ٹولیوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے سے بہت دُور فاصلے پر کھڑے ہو جاتے تھے اور یہ کوشش ہوتی تھی کہ "توٹا" اور "ہنگن" گولہ دوسرے فریق تک پہنچ جائے مقابل والے بچنے کی کوشش کرتے تھے

میرے ماموں ہر سال گیارھویں شریف کی تقریب میں

میلاد خوانی کراتے تھے مجھے اُس دن کا بےچینی سے انتظار رہتا تھا کیونکہ رات بھر جاگ کر جشن منانے کا موقع مل جاتا تھا، یہ شوق اتنا بڑھا کہ میں نے میلاد خوانی کی جماعت میں باقاعدہ شرکت کر لی

ہمارے ہاں "میلاد خوانی" میں قصیدے اور نظمیں ایک مخصوص پیشہ ور جماعت بلند آواز سے پڑھتی ہے اس طرح کہ جماعت کا سردار جسے "ہادی" کہتے ہیں اور جو خوش گلو ہوتا ہے ایک شعر پڑھتا ہے اس کے ساتھی جن کی تعداد پانچ سے دس تک ہوتی ہے جنھیں "ردّادی" کہتے ہیں شعر کو اسی طرح دہراتے ہیں یہ سلسلہ رات کو دس بجے سے صبح تک جاری رہتا ہے، مہمان (عورتیں اور مرد) جمع ہوتے ہیں چائے بنتی ہے جوں جوں رات گزرتی جاتی ہے پرانے قصے نظم میں سُنائے جاتے ہیں عورتیں عام طور پر "حلیمہ دائی" اور "حضرت مسلمؓ" کے بچوں کے شہید ہونے کا واقعہ "حضرت عبدالقادر جیلانی" کی روحانیات کے قصے سُنانے کی فرمائش کرتی ہیں نئے نئے قصیدے بھی سنائے جاتے ہیں گیارھویں شریف پر میلاد خوانی کا زور رہتا ہے میں نے بھی کئی سال "ردّادی" کی حیثیت سے کام کیا ہے

ہمارے ہاں ایک اور رواج تھا جو اب پہلا سا نہیں ہے کچھ تو آج کل کے نئے مشغلوں کی وجہ سے اور کچھ ان کو مذہبی اہمیت نہ دینے سے۔ رمضان کے آخری عشرہ میں سے کسی طاق رات کو فاتحہ خوانی کی تقریب بڑے انتظام کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ محلے کے لوگوں کا چندہ جمع کرکے سحر کے لئے کھانا پکانا مسجدوں میں جھاڑ اور فانوس کا جگمگانا تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد میلاد خوانی، غرض کہ اس تقریب میں سارے محلے کے لوگ حصہ لیتے تھے پھر سب ایک جگہ سحر کھا کر صبح کی نماز کے بعد اپنے گھروں کو لوٹتے تھے اس تقریب میں کسی ایک چیز کی بھی کمی رہ جائے تو مجھے افسوس ہوتا تھا جس طرح بعض لوگ عید ہی کے بہانے سے نماز پڑھ لیتے ہیں اسی طرح اس رات کو عبادت کرنے کا اچھا خاصا موقع مل جاتا تھا اصلاح کرنے والوں نے اس کا بدل نہیں رکھا نتیجہ یہ ہے کہ مسجدوں میں ویسی رونق نہیں رہتی ہے

بستی سے آٹھ میل دور "شوراتری" کا میلہ لگتا ہے بھائی صاحب، ناگو راؤ صاحب "دیسکھ" کے پاس ملازم تھے مجھے "دیسائی" ہر سال میلے میں لے جاتے تھے، بھائی صاحب

ایسے خود دار کہ مجھے صرف اُس وقت اطلاع دیتے جب کہ دیسائی یاد دلاتے ایک دو دفعہ انھیں خیال نہ رہا، میرا میلہ ناغہ ہوگیا میں نے بھی یہ ترکیب سوچی کہ میلے سے کئی دن پہلے ان کے ہاں آیا جایا کرتا تھا اس پر بھائی صاحب بہت خفا ہوتے تھے ایک دفعہ انھوں نے بہت ڈانٹا یہ بات دیسائی کو معلوم ہوئی وہ بھائی صاحب پر خفا ہوئے کہ بچے تو میلے دیکھا ہی کرتے ہیں، پھر تو میرے لئے کوئی روک ٹوک نہیں رہی

بستی میں جب کبھی سنگیت کمپنی (تھیٹر کمپنی) آتی خواہ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے مجھے تماشہ دیکھنے کے لئے نہ ملے لیکن یہ خواہش رہتی کہ اس کمپنی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ ہوتا کہ یہ آئندہ بھی آیا کرے دن میں کمپنی والوں کے ہاں جاکر گھنٹوں بیٹھا رہتا کہ تماشہ کرنے والے کس قسم کے لوگ ہیں دن میں کیا کرتے ہیں یہ ہم لوگوں سے اس قدر مختلف کیوں ہیں یہ دیکھ کر کہ تمام لوگوں نے ڈاڑھی مونچھیں منڈا رکھی ہیں صرف کھیل کے وقت مصنوعی مونچھیں لگا لیتے ہیں۔ بہت بُرا معلوم ہوتا تھا یہ خیال بھی آتا کہ یہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں کہ رات دن

ہنسی خوشی سے رہتے ہیں کھیل تماشے دکھاتے ہیں انھیں دنیا کی فکر نہیں ہے یہ سب باتیں ان لوگوں کو سرسری طور پر دیکھنے سے معلوم ہوئیں۔ ان کے ساتھ مل جل کر رہنے کا موقع ملتا تو معلوم ہوتا کہ ان کی زندگی میں کیا کیا تکلیفیں ہیں

ان سب کھیل تماشوں اور تقریبوں میں میری نیت ہمیشہ یہ رہتی کہ ہنگامہ ہو ——— خواب ہو ——— خیر و خوبی سے ہو ——— کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے جس سے آئندہ کے ہونے میں رکاوٹ پیدا ہو

مجھے استادوں کی خدمت کا شوق تھا اس کام میں بھی چند ساتھی مل گئے تھے۔ جب ہم چوتھی جماعت میں پہنچے تو رات کو اپنے استاد کے ہاں پڑھنے اور وہیں سونے کا شوق ہوا اس طرح رات کو اچھا خاصا "اقامت خانہ" بن جایا کرتا تھا ہمارے ہاں باقاعدہ اقامت گاہیں تو تھیں نہیں میچ کھیلنے کے لئے آس پاس کے گاؤں میں جایا کرتے تھے کسی میچ میں میں خود تو نہیں کھیلتا تھا مگر انتظام ضرور کرتا تھا ایسا ہی جیسا کہ سرکس کے تماشوں میں ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جس استاد کے ہاں ہم لوگ رات کو پڑھنے کے لئے جایا کرتے تھے ان کا تبادلہ ہو گیا دوسرے

دن رخصتی دعوت ٹھہری رات ہی سے انتظامات ہو رہے
تھے کچھ لڑکے پھول لینے کے لئے ضلع میں گئے ہوئے تھے
رات کو دو بجے لوٹنے والے تھے ہمارے تعلقہ سے اسٹیشن
آٹھ میل کے فاصلے پر ہے کام کرتے کرتے تھک گئے تھے میں
نے ساتھیوں سے کہا تفریح رہے گی دھوبیوں کے گدھے
اِدھر اُدھر پھرتے ہیں ان پر سوار ہوکر ساتھیوں کے استقبال
کے لئے اسٹیشن چلیں ، چاندنی رات تھی دس بارہ لڑکوں کی ٹولی
اسٹیشن گئی یہ بات کچھ ایسی عجیب معلوم ہوئی کہ بعد میں کئی راتوں تک
ہم نے گدھوں کو پریشان کیا مگر جب دھوبیوں کو اس کا پتہ چلا
تو اس سے پہلے کہ وہ ہمارا بھانڈا پھوڑتے ہم نے معافی مانگ لی
بعض ساتھیوں نے دھوبیوں کو دھمکی بھی دی کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا
مڈل کا امتحان کامیاب ہونے کے بعد پڑھائی جاری رکھنے
کے لئے ضلع میں جانا پڑتا تھا اس کا انتظام نہ ہوسکا یہ بات بھی
سنہ ۱۹۲۰ء کی ہے اُس زمانے میں مڈل کا امتحان کامیاب ہونے
سے نوکری آسانی سے مل جاتی تھی نتیجہ نکلنے تک میں اسی مدرسے
میں عیوضی پر کام کرتا رہا کامیاب ہونے پر یہ جگہ مجھے ہی مل گئی
تنخواہ تیس روپئے ماہوار تھی انجمن ترقی اردو کی پیشہ وروں کی

لغت تیار کرنے والے مولوی احمد علی صاحب اس زمانے میں صدر مدرس تھے انھوں نے اسی زمانے میں انجمن کی طرف سے طریق الصوت پر ایک قاعدہ لکھا تھا مجھے بتلایا کہ اسے کس طرح پڑھانا چاہیئے بات میری سمجھ میں آگئی چیز نئی تھی پرانے قاعدے کی طرح سبق یاد کرنے کے لئے رٹنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی لڑکوں نے دلچسپی سے پڑھا نتیجہ اچھا رہا

انجمن والے مولوی عبدالحق صاحب اُس زمانے میں صدر مہتمم تھے میرا کام پسند آیا مجھے دو سال کے لئے حیدرآباد میں استادوں کے مدرسے میں بھیج دیا وہاں کے اتالیق پروفیسر وہاج الدین صاحب تھے ان کے انتظامات کو دیکھ کر میں نے بھی کافی باتیں سیکھیں یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اخبارات پڑھا کرتا تھا جی چاہتا تھا کہ اس کام سے بھی لگا ؤ رکھنا چاہیئے مگر کس طرح؟ یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی اُسی زمانے میں جامعہ کے پرنسپل عبدالمجید خواجہ صاحب حیدرآباد آئے ہوئے تھے اس کا چرچا ہمارے اقامت خانے میں ہوا اور پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ جامعہ کیا چیز ہے میں نے سوچا کہ وہ مدرسہ جس میں پڑھنے پڑھانے کا کام ہوا اور اس کے

ساتھ ہی ملک کی آزادی کا حوصلہ بھی پیدا ہو میرے مطلب
کا ہے مگر مشکل یہ تھی کہ علی گڑھ پہنچوں کیسے؟ ماہوار تنخواہ وہیں
خرچ ہو جاتی تھی۔ نقد کچھ نہ تھا پھر یہ بات تو بالکل ہی سمجھ میں
نہ آتی تھی کہ لایق لایق لوگوں کو چھوڑ کر جامعہ مجھے نوکر رکھے گی
البتہ یہ خیال ہوتا تھا کہ پڑھنے کے لئے شاید وظیفہ مل جائے،
کچھ اور پڑھنا بھی چاہتا تھا لیکن وظیفہ کا بھی یقین نہ آتا تھا اس کا ذکر
ایک رازدار ساتھی سے کیا وہ کہنے لگے کہاں حیدرآباد کہاں
علی گڑھ پیسہ پاس نہیں پکڑ دھکڑ کا زمانہ ہے نوکری ہاتھ سے
جاتی رہے گی آپ کی تو اطلاع بھی آگئی ہے کہ نارمل کا میاب
ہونے کے بعد ۳۵ تا ۶۵ کے گریڈ میں صدر مدرس بنائے جائیں
گے۔ ماں باپ کو اس کا علم ہو گا تو وہ بہت پریشان ہوں گے ایک
عرصہ اسی سوچ بچار میں گزر گیا یہاں تک کہ گرمیوں کی چھٹیاں قریب آگئیں اپنے
اپنے گھروں کو جانے کی خط کتابت ہو رہی تھی مجھے کوئی ایک فیصلہ کرنا تھا یہی
دھن سر میں سمائی کہ جو کچھ بھی پیش آئے اب جامعہ کی طرف چلنا ہی چاہئے
میں نے اس رازدار ساتھی سے کہا کہ جانے کا فیصلہ تو میں نے کر ہی لیا ہے،
لیکن تم سے درخواست ہے کہ اس راز کو جب تک میں نہ کہوں کسی
پر ظاہر نہ کرنا ورنہ سب کھیل بگڑ جائے گا ساتھی پر اعتبار تھا تب ہی تو

میں نے اس سے مشورہ کیا تھا اس نے بھی پکا وعدہ کرلیا میرے
پاس پورے سفر کے لیے مشکل سے آدھے دام تھے منمار ڈتک کا
ٹکٹ لینا ضروری تھا اگر اس علاقے میں گرفتار ہوتا تو گھر ہی لوٹنا
پڑتا چنانچہ پہلا ٹکٹ منمار ڈتک کا لیا ایک مشکل یہ بھی تھی کہ راستے میں
ہمارا اسٹیشن باسر پڑتا تھا۔ رات کی گاڑی سے روانہ ہوا پھر بھی
طرح طرح کے خیالات آتے تھے "ایسا نہ ہو گاڑی میں کوئی جان پہچان
کا سوار ہو جائے اسٹیشن پر تو جاننے والے ملیں گے ہی پوچھیں گے
سب لوگ چھٹیوں میں گھر آتے ہیں تم کہاں کی سیر کے لیے جارہے ہو
پھر اس کی اطلاع گھر ہو جائے گی" ایک طرف تو یہ کھٹکا تھا دوسری
طرف جب یہ خیال آتا "آخر ہو گا کیا" تو پریشان ہو جاتا تھا کیا سفر
خیریت سے گزر جائے گا! جامعہ والے بات سن لیں گے! نقدی
کتنی ہے! گاڑی زناٹے سے چلی جارہی تھی پچھلے واقعات ایک ایک
کرکے یاد آتے تھے پھر باسر کا اسٹیشن بھی قریب ہوتا جاتا تھا" اور
جب ماں کو معلوم ہو گا!" گاڑی نے زور سے سیٹی دی میں گھبرایا
کہیں باسر کا اسٹیشن تو نہیں ہے سچ مچ وہی اسٹیشن نکلا میں جلدی سے
بنچ پر لیٹ گیا بس یہی خیال تھا" اور جب ماں کو معلوم ہو گا !!
گاڑی نے پھر سیٹی دی اور چل پڑی میرے آنسو نکل آئے،

جوں جوں اسٹیشن گزرتے جاتے تھے رنج کے ساتھ ہی اطمینان بھی ہوتا تھا کہ اب گھر سے دور ہوتا جاتا ہوں صبح ہوئی اور منماڑ آیا لوگوں سے پوچھا علی گڑھ کی گاڑی کدھر سے آتی ہے؟ کدھر جاتی ہے؟

"پاسنجر یا اکسپرس؟"

"جو بھی پہلے آئے"

پہلی گاڑی پاسنجر تھی

مجھے نہیں معلوم تھا کہ پاسنجر کا سفر ایک دن کی بجائے ڈیڑھ دن میں طے ہوتا ہے۔ اس میں سوار ہوگیا اس نیت سے کہ کافی فاصلہ طے ہونے پر درمیان میں کہیں سے ٹکٹ خرید لوں گا چند گھنٹے گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ٹکٹ کی جانچ ہو رہی ہے جھٹ سے پاخانے میں چھپ گیا ٹکٹ کلکٹر کی آواز سے میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا تھوڑی دیر کے بعد ساتھی مسافر نے آواز دی "نکل آؤ بھائی"۔ میں اپنی جگہ پر چلا آیا لیکن یہ طے کر لیا کہ اب کی دفعہ جو جنکشن آئے وہاں سے ٹکٹ ضرور خرید لوں گا ورنہ پکڑ لیا جاؤں گا گاڑی جھانسی پر رکی دیوار پر لگے ہوئے بڑے ٹائم ٹیبل میں اگلا بڑا جنکشن دیکھا آگرہ نکلا وہاں کا ٹکٹ خریدا جان میں جان آئی پھر

آگرہ تک کا سفر خوشی خوشی طے کیا وہاں سے علی گڑھ تھوڑی
دور رہ گیا تھا مگر اب تو پیسے بالکل ختم ہو گئے تھے پلیٹ فارم
سے متصل اسٹیشن کے ایک "کوارٹر" میں ریلوے پولیس کے بال بچے
رہتے تھے، گرمیوں کا زمانہ تھا وہ چارپائی ڈالے وہیں لیٹا تھا
خدا جس کی مدد کرنا چاہتا ہے اسے وقت پر کام کی باتیں سمجھ میں
آ ہی جاتی ہیں، اگر میں پولیس والے سے یہ کہتا کہ میرے پاس دام
نہیں ہیں علی گڑھ پہنچنا چاہتا ہوں تو شاید آوارہ گردی میں گرفتار
کر لیتا لیکن میں نے اسے اپنا سارا حال اور یہاں تک کے سفر کی کیفیت
مختصر طور پر سنائی جوں جوں میں بیان کرتا جاتا تھا اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی
تھی، درمیان میں اس نے اپنے لڑکے کو آواز دی کہ وہ کھانا لے آئے میں
نے اپنا بیان جاری رکھا جب روٹی آ ئی تو وہ کہنے لگا "پہلے تم کچھ
کھا لو علی گڑھ کا سفر مشکل نہیں ہے یہاں سے قیدیوں کی ایک
جماعت وہاں جا رہی ہے اپنے ساتھی سے کہہ دوں گا کہ وہ تمہیں
اسٹیشن سے باہر چھوڑ دے" خیر، قیدیوں کے ڈبے میں بھی سوار
ہوا اسٹیشن پر اُتر کر سرائے کا پتہ پوچھا اور وہیں پہنچا بھوک لگ رہی
تھی دام نہیں تھے میں نے بھٹیاری سے کہا
"میرے پاس دام ختم ہو گئے ہیں لیکن ایک بڑا سا ریشمی

رومال ہے اگر اس کے بدلے دو وقت کھانا کھلا دو تو میرا
کام نکل جائے گا" پہلے تو اُس نے ناک بھوں چڑھائی پھر کہنے لگی ـــــ
ـــــــــ "لا ـــــــ دکھا اپنا رومال"!
میں نے پیش کیا وہ روٹی پکا رہی تھی رومال کو ایک طرف
رکھ لیا پھر کہنے لگی
"بیٹھ جا یہیں چولھے کے پاس" پھر برتن میں سالن دیتے
ہوئے بولی "کہاں سے آیا ہے! کہیں چوری کا مال تو نہیں ہے"!
کھانا شروع کرتے ہوئے میں نے کہا
"کیسی چوری کیا سفر میں پیسے ختم نہیں ہوتے ہیں!"
"ارے بابا یہ سرائے ہے بہتیرے ایسے بھی آدمی ہیں"
کھانے سے فارغ ہو کر درخواست لکھی اور علی گڑھ کے
نئے مدرسے یعنی جامعہ کا پتہ پوچھتے ہوئے ڈگی والی کوٹھیوں کے پاس
پہنچا ایک کوٹھی کے احاطے میں ماسٹر برکت علی صاحب پھاٹک کی
طرف چلے آرہے تھے میں سامنے رُک گیا انھوں نے میری طرف نظر
اُٹھائی میں نے درخواست دکھائی اُنھوں نے پیچھے مڑتے ہوئے
اُنگلی سے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا میں اُدھر ہی چل پڑا،
یہ مکان اُس وقت کے صدر مدرس رؤف پاشا صاحب کا تھا

اس زمانے میں جامعہ کے دفتر اور مدرسے ڈگی (جوہڑ) کے
پاس بڑے سے احاطے میں پھوس کی کوٹھیوں میں تھے اور وہیں
صدر مدرس اور استاد صاحبان کی دو کوٹھیاں تھیں ایک طرف
پھوس کا بہت بڑا کمرہ اور اس کے سامنے چبوترہ تھا اس کا نام
"محمد علی ہال" تھا دوپہر میں پہلی جماعت سے بی۔اے تک کے طلبار
اس ہال میں ایک ساتھ کھاتے تھے ظہر کی نماز بھی مشترکہ ہوتی تھی گرمیوں
کا زمانہ تھا سب لڑکے گھر چلے گئے تھے البتہ بی۔اے (آخری) کے
طلبار اپنے امتحان کی تاریخ بڑھوا کر اس احاطے میں ٹھہرے ہوئے
تھے میں اپنی درخواست لے کر صدر مدرس صاحب کے کمرے
پر پہنچا درخواست دیکھتے ہی فرمایا " وظیفوں کا تعلق مجھ سے نہیں ہے
قریب ہی شیخ الجامعہ صاحب کا دفتر ہے وہیں تشریف لے جائیے
دفتر میں شیخ الجامعہ عبدالمجید خواجہ صاحب اور مسیحل
حسن حیات صاحب بیٹھے کام کر رہے تھے نظام خاں چپراسی باہر بیٹھے
تھے پہلے نظام خاں سے پھر شیخ الجامعہ سے اجازت لے کر اندر داخل ہوا
درخواست دے کر ایک طرف بیٹھ گیا
شیخ الجامعہ۔ وظیفہ اس طرح ملتا ہے خیال آیا اور گھر سے چل دیے
جیسے کہ وظیفہ پہلے سے طے ہے یہاں اُن لڑکوں کی مشکل آپڑی

ہے جن کی درخواستیں مہینوں پہلے آئی ہوئی ہیں اور غریب ہیں

میں :۔ (دبی زبان سے) میں بھی غریب ہوں

شیخ الجامعہ (غصہ سے) میں بھی غریب ہوں ——— غریبوں کے لئے ایک علی گڑھ کا مدرسہ رہ گیا ہے ——— اور یہ ہزار میل کا سفر کس طرح طے کیا!!

اس موقع پر میں نے سابق مدرس ہونے کے حالات جان بوجھ کر نہیں بتلائے اگر ایسا کرتا تو شاید اپنے پاس سے ٹکٹ دے کر ریل میں سوار کرا دیتے اور ایک اطلاع حیدر آباد بھی بھجوا دیتے میں نے بس یہی کہا "سفر کے لئے تو دام مل گئے تھے"

شیخ الجامعہ۔ ان داموں سے خونچہ لگا لیتے پڑھ کر کیا کروگے پھر حیات صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے

خیال فرمائیے آپ حیدر آباد سے تشریف لائے ہیں، ثانوی اول میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور وظیفہ کی درخواست ہے"

مجھے نہیں معلوم تھا کہ حیات صاحب مذاقیہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہنے لگے

"ایکسپرس سے آئے ہو یا پاسنجر سے"

میں نے سچی بات بتلا دی" پاسبجر سے"
حیات صاحب نے کہا" تو واپسی میں مال گاڑی سے جانے
میں سہولت رہے گی"
شیخ الجامعہ۔ خیر اب آخری بات یہ ہے کہ پہلے آپ حیدرآباد
واپس جائیے اگر یہاں پڑھنے کا شوق اب بھی باقی ہے تو وہاں سے
درخواست بھجوایئے، وظیفہ منظور ہونے کی اطلاع ملنے پر شوق سے
تشریف لایئے" پھر دونوں اپنے کام میں مشغول ہوگئے، میں نے
کبھی کبھی متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ سنتے نہیں تھے بڑی دیر
کے بعد حیات صاحب نے آنکھ کا اشارہ کیا کہ میں باہر چلا جاؤں
وہاں سے نکل کر صدر مدرس صاحب کے مکان پر پہنچا اور
انھیں کیفیت سنائی
رؤف پاشا صاحب بڑے نرم مزاج کے صدر مدرس تھے
کہنے لگے میں پہلے ہی سے کہنے والا تھا کہ جو لڑکے بغیر کسی منظوری
کے چلے آتے ہیں انھیں اگر وظیفہ ملنے والا بھی ہو تو وہ بھی نہیں ملتا
ہے لیکن میں نے خیال کیا کہ ایک دم سے مایوس کیوں کروں"
میں نے سفارش کے لئے کہا اس پر بھی یہی فرمایا" قاعدہ یہی
ہے کہ اس طرح آنے والوں کی سفارش نہیں کی جاتی ہے"

میری سمجھ میں کوئی بات نہ آئی شام تک اس احاطے میں
گھومتا رہا درختوں کے نیچے گھنٹوں گزارے رات کو اُسی
سرائے میں سوگیا۔ عجیب عجیب خواب آئے

دوسرے دن دفتر کھلنے پر پھر اسی جگہ گیا اور شیخ الجامعہ
کے کمرے میں چپ چاپ ایک طرف کونے میں بیٹھ گیا نہ میں نے
اُن سے کچھ کہا اور نہ انھوں نے۔ کافی دیر کے بعد میرے آنسو نکل آئے
انھوں نے دیکھ تو لیا مگر چُپ رہے بڑی دیر کے بعد حیات صاحب
کھڑے ہوئے اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا میں کچھ امید کے
ساتھ اُٹھا ان کا سارا کام مذاقیہ انداز میں تو ہوتا ہی تھا کہنے لگے

"شیخ الجامعہ صاحب کی بیوی حیدر آباد کی رہنے والی
ہیں ان کے پاس چلے جاؤ شاید کام بن جائے"!

ایک کاغذ پر اب تک کا مختصر حال لکھ کر میں اُن کے
مکان پر پہنچا اور کاغذ اندر پہنچا دیا تھوڑی دیر میں وہ پردے
کی آڑ میں سے کہنے لگیں

"جب وہ دفتر سے لوٹیں گے سفارش کروں گی۔ تم
کہاں ٹھیرے ہو؟ کھانے پینے کا انتظام کیا ہے؟

میں نے کہا "ایک جگہ عارضی طور پر ٹھیرنے اور کھانے کا

انتظام ہو گیا ہے

انتظام کی یہ صورت نکل آئی تھی کہ ان ہی چھٹیوں میں حیدرآباد کے ایک طالب علم محمود صاحب نگران صاحب کے مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے انھوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ آپ کا کام تو بنے گا نہیں البتہ جب تک آپ واپس نہیں جاتے ہیں میرے ساتھ کھا لیا کیجئے اور یہیں سو جایا کیجئے

تیسرے دن معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ کی سفارش نے بھی کام نہیں دیا اس عرصہ میں میرا حال بعض منشی صاحبان مثلاً شیخ رشید احمد صاحب شیخ مفتاح الدین صاحب وغیرہ کو معلوم ہو گیا تھا سب نے یہی کہا یہ شیخ الجامعہ صاحب روپئے پیسے کے معاملے میں سخت ہیں ہم لوگ چندہ کر دیں گے آپ واپس جائیے واپسی کا نام سن کر مجھے تکلیف ہوتی تھی خیر یہ دن بھی گزر گیا

چوتھے دن رؤف پاشا صاحب ایک شخص سے گفتگو کر رہے تھے کہ انھیں کھانے پینے کی تکلیف ہے باورچی کا انتظام ہونا چاہئے میں نے یہ گفتگو سن لی تنہائی میں رؤف صاحب سے کہا کہ آپ کو باورچی کی ضرورت ہے مجھے ہی رکھ لیجئے کچھ پڑھ بھی لیا کروں گا وہ تعجب سے کہنے لگے:

"آپ کھانا پکانا جانتے ہیں!"
میں نے کبھی کھانا پکایا تو نہیں تھا لیکن قدم جمانے کی
یہی صورت تھی کہ ہاں کر لی جائے میں نے کہا
"کام چلانے کے لائق تو جانتا ہی ہوں اور سیکھ لوں گا"
وہ خوش ہوئے کہ ایک پڑھا لکھا لڑکا اس کام کے لئے
مل رہا ہے حساب کتاب بھی لکھ لیا کرے گا مجھے باورچی خانے کی
تمام چیزیں اور پچھلا بچا ہوا دال آٹا دکھلا دیا اپنے ساتھیوں سمیت
کوئی چار آدمیوں کے کھانے کے لئے کہا ان میں سے ایک
بڑے کتب خانے کے مہتمم سید محمد صاحب تھے دوسرے محمود
طالب علم تیسرے مالابار کے ایک اور طالب علم۔ قریب کی دکان
سے گوشت خرید لیا مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی خواب کی دنیا میں
پہنچ گیا ہوں، کچھ اور سوچنے کا موقع اس لئے نہیں تھا کہ وقت
گزرا جا رہا تھا، گھر میں والدہ اور بہن کو پکاتے ہوئے ضرور دیکھا
تھا بس اس کی نقل شروع کر دی، ہر تھوڑی دیر میں باورچی خانے
کے آس پاس دیکھ لیا کرتا تھا کہ کوئی دیکھنے کے لئے تو نہیں آرہا ہے
جب میں نے یہ دیکھا کہ رؤف پاشا صاحب اور ان کے ساتھی
کھیل کے میدان کی طرف جا رہے ہیں تو اطمینان ہوا کہ پکاتے ہوئے تو

کوئی دیکھ نہ سکے گا! سالن تو جیسا تیسا پک ہی رہا تھا روٹی پکانے کے لئے جب آٹے میں پانی ڈالا اور اسے ملانا شروع کیا تو دونوں ہاتھ لت پت ہو گئے۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ اچھی طرح گوندھنے سے ہاتھ صاف ہو جاتے ہیں کبھی ان کو صاف کرتا کبھی آٹے میں پانی ملاتا جس سے وہ پتلا ہو جاتا کبھی آٹا ملا دیتا جس سے وہ پھر خشک ہو جاتا اس طرح میرے سامنے آٹے کا ایک ڈھیر لگ گیا اب تو میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی مگر وقت ہی کہہ رہا تھا "جو کچھ کرنا ہے جلدی کر کھانے کا وقت قریب آرہا ہے" آٹے میں اتنی چکناہٹ تو تھی نہیں کہ وہ چپاتی کی طرح پھیلتا البتہ پتلے پتلے بسکٹوں کی طرح ضرور پھیلا۔ توے پر الٹنے پلٹنے کا معاملہ بھی غلط ہو جاتا تھا روٹیاں جلنے اور انگلیوں کو چرکے لگنے کے بعد کچی پکی موٹی روٹیاں پک ہی گئیں مغرب کے بعد محمود صاحب (جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں) کی مدد سے دستر خوان لگایا اور وہ تینوں چیزیں دال، گوشت روٹی جو ایک ہی انداز کی تھیں اس پر رکھ دیں۔

نگران صاحب اور ان کے ساتھی کھیل کی باتیں کرتے ہوئے دستر خوان پر بیٹھے میں کہتا تھا "الٰہی خیر" کھانے کی طرف دیکھتے ہوئے ایک نے میری طرف اشارہ کر کے کہا

"آپ حیدر آباد سے آئے ہیں!"
دوسرے نے کہا
"کھانے کی رنگت پر نہ جائیے اصل چیز ذائقہ ہے"
نگراں صاحب نے کھاتے ہوئے کہا
"بھائی در اصل آپ پڑھنے کے لئے آئے ہیں مگر وظیفہ نہ ملنے
کی وجہ سے کسی انتظام کے ہونے تک یہ کام کرنا چاہتے ہیں"
چوتھے نے کہا
"تو اس اعتبار سے یہ کھانا بہت اچھا پکا ہے"
مجھے ایسا معلوم ہوا کہ آج کی ہمت نے میرے کئی ہمدرد
پیدا کر دیئے ہیں۔ دوسرے دن نگران صاحب نے شیخ الجامعہ صاحب
سے نصف دن کی سرگذشت سناتے ہوئے سفارش کی کہ کم سے کم
کہیں ملازم ہی رکھوا دیا جائے شیخ الجامعہ صاحب نے جامعہ کے
چھاپے خانے میں آٹھ روپئے ماہوار پر ملازم رکھوا دیا۔ کام یہ تھا
کہ "دستی پریس" (ہاتھ کی مشین) پر چھپائی کے وقت ڈنڈا کھانا
پڑتا تھا۔ یہ بات جون ۱۹۲۳ء کی ہے اس وقت میری عمر اٹھارہ
سال کی تھی مطبع (چھاپہ خانہ) دفتر سے ایک فرلانگ پرے ایک مکان
میں تھا لیتھو، ٹائپ جلد سازی سب طرح کا کام ہوتا تھا عملہ بھی

کافی تھا، پہلے .... صاحب بعد میں عبدالعلی صاحب منیجر ہوئے منیجر صاحب کا اعلان تھا کہ جس مشین کے لوگ ہزار فارم چھاپ لیں باقی وقت وہ آرام کرسکتے ہیں ہماری مشین والے اپنا کام جلدی ختم کر لیتے تھے بعد میں میں اپنے مشین والوں کو اخبار سنایا کرتا تھا اس وجہ سے میرے مزدور ساتھی میرا کام ہلکا کر دیتے تھے منیجر صاحب کی چٹھیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتا تھا۔ چھاپے خانے کے ایک کمرے میں سعیدالرحمٰن صاحب نگینہ والے "پروف ریڈر" رہتے تھے انھوں نے سونے کے لئے جگہ دیدی تھی کیونکہ ان کا کھانا مطبخ سے لا دیا کرتا تھا۔ اپنے لئے چار روپئے کا درجہ دوم کا کھانا جاری کرالیا تھا۔ دال روٹی مل جاتی تھی اس طرح باقی چار روپئے اور کاموں کے لئے بچ جاتے تھے

جامعہ کے پہلے تین سال

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء سے جون ۱۹۲۳ء

پچھلے آرام کو چھوڑنے اور موجودہ مشکلوں میں قدم رکھنے کی
وجہ سے بعض دفعہ طبیعت میں وحشت پیدا ہو جاتی تھی ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ میں کسی طوفان میں گھر گیا ہوں مولوی سعید الرحمٰن صاحب
میرے حالات سے واقف ہو چکے تھے وہ میری ڈھارس
بندھانے کے لئے رات کی فرصت میں بزرگان دین کے قصے
سنایا کرتے تھے کہ اصل خوشی حاصل کرنے کے لئے انھوں نے
کس طرح تکلیفیں اٹھائی ہیں اس سے میری تسلی ہو جاتی تھی ایک
رات میں نے مولوی صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ وہ جامعہ

کے پہلے تین سال کی کہانی سنائیں انھوں نے یوں کہنا شروع کیا
"کیا پوچھتے ہو اُس زمانے کے حالات سنہ ۱۹۲۰ء میں غیر ملکی
حکومت (انگریز) کا قبضہ ہٹانے اور اپنی حکومت قائم کرنے
کے لئے جب ملک میں خلافت اور ترک موالات کی تحریک کا
زور تھا مولانا محمدؐ علی اور شوکت علی اور مہاتما گاندھی ملک کا دورہ
کر رہے تھے جوش کی لہر سارے ملک میں دوڑ گئی تھی ترک موالات
کے پروگرام میں ایک شق سرکاری تعلیمی اداروں سے تعلقات
قطع کرنے کی بھی تھی لیکن علی گڑھ کے اسلامی دارالعلوم میں
بہت کچھ رجعت پسندوں کا تسلط تھا لڑکوں میں خلافت کی
تحریک سے دلچسپی بہت تھی مگر رجعت پسندوں کی تربیت نے
عملی قدم اٹھانے کے قابل نہ رکھا تھا۔ مولانا محمدؐ علی اور علی گڑھ
کے منتظمین میں عرصے سے اَن بَن چلی آتی تھی۔ لڑکے قول میں
مولانا محمدؐ علی کے ہمنوا تھے فعل میں منتظمین کالج کے، سچ ہے
غلامی شیروں کو روباہ مزاج بنا دیتی ہے اب جو تعلیم گاہوں کے
چھوڑنے کا مطالبہ شروع ہوا تو علی گڑھ والے کشمکش و پنج میں تھے۔
کہتے ہیں کہ مولانا محمدؐ علی اور شوکت علی نے گاندھی جی سے
کہا کہ یہ کام ہم کو علی گڑھ سے شروع کرنے دیں۔ مولانا محمدؐ علی

کے پاس کچھ جوشیلے طالب علم پہنچے بھی تھے کہ آپ علی گڑھ
میں آکر ترک موالات کی دعوت کیوں نہیں دیتے۔ لیکن جیسا
کہ اکثر ہوتا ہے اوپری جوش رکھنے والے وقت پر زیادہ کام
نہیں آتے مگر مولانا محمدؐ علی نے ان طالب علموں کے جوش کو
علی گڑھ کے طلبار کی مشترک خصوصیت سمجھا اور اعلان کیا کہ ہم علی گڑھ
آتے ہیں یہ دونوں شیر دل بھائی گاندھی جی کو ساتھ لے کر علی گڑھ
پہنچے منتظمین کالج نے بھی چھپ چھپ کر مقابلہ کی تیاریاں کیں کچھ
لوگ ان سے سوالات کرنے پر کچھ ان پر فقرے کسنے پر متعین
ہو کر آئے کالج کے طلبار کا جلسہ ہوا گاندھی جی نے تقریر کی علی برادران
نے تقریریں کیں مگر ہوا نہ جمی کچھ لوگ خوش ہوئے کچھ شرمندہ
دن میں جلسہ ہوا تھا رات کو جب رجعت پسندوں کے یہاں گھی
کے چراغ جل رہے تھے غیر تمند شرم سے سر جھکائے بیٹھے تھے
کوئی سجدے میں پڑا ہوا تھا کوئی روتا تھا یہ بہت تھوڑے سے
لوگ تھے اور اکثر وہ تھے جنھوں نے پہلے جوش کے نعرے نہ
لگائے تھے نہ مولانا محمدؐ علی کو علی گڑھ میں آکر ترک موالات کی
دعوت دینے کے لئے آمادہ کیا تھا، خاموش سے سنجیدہ سے
لوگ تھے مگر وہ علی گڑھ کی اس بے اعتنائی اور بے تعلقی کو نہ دیکھ

سکتے تھے یہ اچھے طالب علم تھے، چاہتے تھے کہ امتحان میں شریک
ہوکر اپنی تعلیم ختم کریں اور پھر بن پڑے تو قومی تحریک میں شریک
ہوں مگر اب یہ کیا کرتے یہ کیسے دیکھتے کہ مسلمانوں کے اس عظیم الشان
علمی مرکز میں خدمت اسلام اور خدمت ملک کے نام پر کچھ قربانی
کا مطالبہ ہوا اور ایک حلقہ سے لبیک کی آواز نہ نکلے انھوں نے
رات ہی رات مشورہ کیا کہ اب جو بھی ہو ہمیں کچھ کرنا چاہیئے، صبح
ہوتے ہوتے ان کی تحریک پر یونین میں طلبا کا ایک جلسہ پھر ہوا،
اس جلسہ کا رنگ اور تھا گذشتہ دن کی حرکتوں پر ندامت اور
غصہ عام طور پر پھیل چکا تھا جوشیلی تقریریں ہو رہی تھیں نعرے
لگ رہے تھے کہ اتنے میں مولانا محمد علی اور شوکت علی ہال میں
پہنچے جو لوگ اس وقت جلسہ میں تھے وہ ساری عمر اس کو نہ بھولیں گے
دونوں بھائیوں نے بس دو دو چار چار منٹ تقریر کی جس کا ماحصل
یہ تھا کہ علی گڑھ ہمارا روحانی گھر تھا ہم یہاں بڑے ارمان لے کر
آئے تھے بہت دل شکستہ جاتے ہیں خدا حافظ ہزاروں نوجوانوں کا
مجمع چلا چلا کر رو رہا تھا بہتوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں ایک کہرام
تھا، دل پگھل پگھل کر آنکھوں سے نکلے پڑتے تھے اس عالم میں
علی برادران ہال سے چلے گئے مگر یہ چند منٹ بہتوں کے لئے زندگی کے

فیصلہ کن منٹ بن گئے تقریروں کا جوش بڑھا اسی میں کسی نے اٹھ کر یہ کہا کہ ہمیں بیشک اس ادارہ کو چھوڑنا چاہیئے یہاں کی تعلیم کی قیمت ہمارا دین ہے مگر ہمیں بہتر تعلیم کا انتظام کرنا چاہیئے جو لوگ ہمیں یہاں سے جانے کی دعوت دے رہے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اس بہتر تعلیم کا انتظام اپنے سر لیں' بات معقول تھی مگر جوش میں معقولیت کا بُرا حال ہوتا ہے چاروں طرف سے لوگ اس غریب مقرر پر ٹوٹ پڑے "یہ بے ایمان ہے یہ ہمیں صراطِ مستقیم سے ہٹانا چاہتا ہے یہ چاہتا ہے کہ ہمارے جوش کو ٹھنڈا کردے، یہ جاسوس ہے اسے ڈاکٹر ضیاء الدین نے ملازم رکھ لیا ہے" اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہا اس پر ابن حسن صاحب (جو بعد کو جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے معلم تھے اور جوانی میں جن کی موت ایک قومی حادثہ ہے) کھڑے ہوئے کہ دوسری تعلیم گاہ کی تجویز تو ایک معقول تجویز ہے اس پر یہ نزغہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اتفاق سے ابن حسن صاحب بھی اسی زمانے میں اسسٹنٹ لکچرر مقرر ہوچکے تھے جوش والوں نے ان پر طعنے شروع کئے زاہد علی صاحب (شوکت علی صاحب کے صاحبزادے) نے خاص طور پر تقریر کی۔ مخالفت کا ایک طوفان اٹھا جس میں ابن حسن صاحب کی تقریر ڈوب گئی۔ ذاکر صاحب جو اس وقت

ایم۔ اے اور ایل ایل بی کے طالب علم تھے ایک عرصہ سے بیمار تھے ایک کونے میں چپکے بیٹھے یہ سن رہے تھے اور باوجود نوراللہ صاحب کے کہنے کے (یہ اُس وقت وائس پریسیڈنٹ تھے) اب تک کچھ نہ بولے تھے ان سے اب نہ رہا گیا انھوں نے ایک زوردار تقریر کی کہ ہر معقول بات کو طعن اور تشنیع کے حربہ سے اگر یوں ہی ختم کیا جائے گا تو یہ جوش کڑھی کا ابال ہو کر رہ جائے گا بات جو کہی گئی ہے اگر صحیح ہے اور دل کو لگتی ہے تو اسے ماننے یہ کیا کہ جو کہہ رہا ہے وہ جاسوس ہے تنخواہ پاتا ہے آخر آپ سب نے تو اپنی عقل گرو نہیں رکھی ہے! وغیرہ وغیرہ اور ایک جداگانہ تعلیم گاہ کے قیام کی مدلل تائید کی شامت اعمال ذاکر صاحب بھی ابن حسن صاحب کے ساتھ میں اسسٹنٹ لکچرر مقرر ہوئے تھے ان کے ایک گہرے دوست سید محمد صاحب بہاری جو علی گڑھ میں (DEMAND OF LABOUR) کے نام سے مشہور ہو گئے تھے اُٹھے اور کہنے لگے یہ شخص میرا دوست ہے یہ اچھا آدمی ہے سچا آدمی ہے مگر اس وقت اس کے سینہ میں بھی شیطان گھس گیا ہے یہ بھی اپنی تنخواہ کو محفوظ کرنا چاہتا ہے اس لئے یہ ترکیب کر رہا ہے کہ وقت ٹل جائے اور ہم کچھ نہ کر پائیں۔ دوستو دھوکا نہ کھاؤ۔ سید محمدؐ صاحب نے خلوص

سے یہ تقریر کی تھی اس لیے باوجود ذاکر صاحب کے اثر کے لوگ
ذاکر صاحب کی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے ذاکر صاحب جن کا
چہرہ نقاہت سے زرد تھا اور سارا بدن پسینہ سے تر تھا پھر کھڑے
ہوئے اور اس دفعہ ان کی تقریر نے لوگوں کے خیال کا رُخ بدل دیا
اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھوں نے پہلے سے بہتر دلیلیں دیں بلکہ یہ تھی
کہ لوگوں کو ان دلیلوں کے پُرخلوص ہونے کا یقین دلایا جب انھوں
نے یہ کہا کہ میں اپنی لکچراری سے مستعفی ہوتا ہوں تو سب کے منہ
بند ہوگئے ابن حسن صاحب نے بھی کہا کہ میں بھی استعفیٰ دیتا ہوں جن
لوگوں کو وظیفے ملتے تھے انھوں نے کھڑے ہو کر اپنے وظیفے ترک
کرنے کا اعلان کیا اور وہ جوش جو ابھی تک لفظوں کے دریا کی شکل
میں امنڈ رہا تھا اب صداقت کے دربار میں مخلصانہ قربانی کی نذر
پیش کرنے لگا شور اور پکار کی جگہ متانت اور عزم نے لے لی، اور
بالآخر اس مجمع نے یہ مطالبہ منظور کیا کہ اگر موجودہ تعلیم ناقص ہے تو
بہتر تعلیم کا انتظام کرنا قوم کا فرض ہے کالج سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ
سرکاری تعلق کو چھوڑے اور قوم سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ کالج ایسا
نہ کرے تو نوجوانوں کی تعلیم کا دوسرا انتظام کیا جائے جامعہ ملیہ کا
خیال یوں ان جوشیلے ناتجربہ کار لیکن پُرخلوص اور آمادۂ عمل نوجوانوں

کے باہمی مشورہ سے پیدا ہو۔ اسی میں اس خیال کی قوت ہے کہ یہ
"نظر بہ فردا" ہمارے مستقبل کی تشکیل کا ایک خیال ہے یہی اس کی
کمزوری ہے کہ اس میں سوچ اور غور اور تجربے کو کم دخل رہا ہے
قدامت پرستی اور ترقی پسندی کے معرکہ میں عموماً فریقوں کی یہی
قوت اور کمزوری ہوتی ہے غرض ایک نئی تعلیم گاہ بنانے کا خیال
یہاں سے چلا۔ علی برادران تک یہ التجا پہنچی، حکیم اجمل خاں اور
ڈاکٹر انصاری تک پہنچی، مولانا ابوالکلام اور مولانا حسرت موہانی
تک پہنچی سارے مسلمان اہل فکر تک پہنچی ۔ سیاسی کام کرنے والے
معمولاً تعمیری کاموں سے کہ کچھ ٹھنڈے اور بے نمک سے کام ہوتے
ہیں، بچتے ہیں مگر اس مطالبہ میں ایسی صداقت تھی کہ سب نے مان لیا
تفصیلات میں اختلاف ضرور تھا مگر اصولاً سب نے تسلیم کیا کہ اگر
علی گڑھ مسلمانوں کے مطالبہ کو ٹھکراتا ہے تو مسلمانوں کو اپنے
نوجوانوں کا مطالبہ ماننا ہوگا

اب سُنئے دوسری طرف کا کچھ حال نوجوانوں نے اپنا یہ
مطالبہ تو پیش کر دیا لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کا مقابلہ کن قوتوں
سے ہے۔ وہ ساری قوتیں جو اس لئے کہ وہ تاریکی کی قوتیں ہیں اپنا
کام تاریکی میں چھپ کر ہی اچھا کرتی ہیں، وہ پوشیدہ ریشہ دوانیاں

شروع کیں کہ الاماں ۔ کہتے ہیں کہ اعلیٰ ترین حکام حکومت اور کارکنان
علی گڑھ میں براہ راست ٹیلی فون کا رشتہ قائم ہو گیا سارے ہندوستان
سے "بہی خواہان قوم" اپنے سرکاری اور غیر سرکاری فرائض سے
چھٹیاں لے کر اور اکثر کہیں نہ کہیں سے اپنا سفر خرچ بھی پا کر "علی گڑھ
کو بچانے کے لئے" چل کھڑے ہوئے منتظمین کالج نے لڑکوں کے
گھروں کو خط لکھے پھر تار دیئے کہ تمہارے لڑکے کی جان خطرہ میں
ہے اسے بلا لو بلکہ آ کر لے جاؤ اور واقعی جان کے خطرہ کی یہ لوگ
کچھ نہ کچھ تدبیریں پہلے دن سے کر رہے تھے یہ ارباب حکومت کو
تار دے رہے تھے کہ لڑکے باغی ہو گئے ہیں ہمارے قابو میں نہیں پولیس
بھیجئے فوج بھیجئے وغیرہ وغیرہ علی گڑھ اس زمانے میں دیکھنے کی
جگہ تھی ۔ علی گڑھ والوں کی زبان میں "بھانت بھانت کا والدین"
اقامت گاہوں میں گھومتے نظر آتا تھا ایک طرف نوجوانوں کا
آزادی کا جوش تھا ، قومی خدمت کا ولولہ تھا بے غرضی تقریباً
بے خودی تھی دوسری طرف غلامی تھی ، مصلحت اندیشی تھی خود غرضی
تھی ایک طرف جوانی تھی دوسری طرف بڑھاپا ۔ کالج کے ارباب
حل وعقد نے عجب یہ کیا کہ طلبا کو ایک مرتبہ بھی کسی جلسہ میں
آ کر نہیں سمجھایا ہاں الگ چھپ چھپ کر ان سے ملے ، ولایت

جانے کا وظیفہ دلانے کا لالچ دیتے نوکری کے سبز باغ دکھاتے اور یوں ان نوجوانوں کی اخلاقی موت کا سامان کرتے۔ بہت سے نوجوان تو اپنے والدین کے ساتھ گھروں کو چلے گئے، بیٹیا روتا ہوا، باپ شرمایا ہوا ریل گاڑی میں بیٹھ گویا اپنا منہ چھپائے جاتے تھے۔ پھر بھی کوئی تین سو لڑکے رہ گئے ان کا حال بھی یاد رکھنے کا حال تھا جلسے تھے مشورے تھے ڈائننگ ہال سے کالج نے کھانا بند کر دیا تھا لڑکوں کا اپنا انتظام تھا حیدرآباد کے مقبول بھائی منتظم تھے روز باہر سے کوئی نہ کوئی آتا تھا، عجیب پُرکیف زمانہ تھا کئی دن تک علی برادران نہ آ سکے تھے اب وہ بھی آئے اور اولڈ بوائز کی عمارت میں جو مولانا شوکت علی اور خواجہ مجید صاحب کی کوششوں سے بنی تھی ٹھیرے یہیں تمام اکابر آتے اور مشورے ہوتے لڑکے بھی ان میں شریک ہوتے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ اس کالج کو چھوڑ کر دوسرا ادارہ بنالیں گے۔ ایک وہ تھے کہ اس وقت تک نہ نکلیں گے جب تک جبر سے نہ نکالا جائے۔ ایک وہ بھی تھے جو کہتے تھے کہ جبر سے نکالا جائے گا تو ہم بھی جبر سے پیش آئیں گے پہلے گروہ میں حکیم اجمل خاں صاحب تھے دوسرے کے سردار محمد علی صاحب تھے، تیسرے کے حسرت موہانی،

بالآخر ایک دن صبح کی نماز کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ کالج کے چاروں طرف پولیس گھیرا ڈالے ہے۔ پولیس کا ایک افسر مولانا محمدؐ علی کے نام حکم لے کر پہنچا کہ طلباء کے ساتھ کالج سے نکل جائیے۔ وہ قافلہ جب اس تعلیم گاہ سے نکلا ہے جسے وہ اپنے گھر سے زیادہ عزیز رکھتا تھا تو دیکھنے والوں کے دل پس پس گئے، ان نوجوانوں کے چہروں پر ایمان کا نور تھا سامنے ایک نوجوان ایک ہرا جھنڈا لیئے تھا جس پر کلمہ طیبہ لکھا تھا ساتھ ساتھ مولانا محمدؐ علی اور دوسرے اکابر تھے، حکیم صاحب نے کہیں سے خیموں کا انتظام کیا تھا یہ قافلہ جاکر ان خیموں میں اترا صبح سے دوپہر ہوگئی تھی کھانا پکانے کی کسے سدھ تھی اور کسے موقع، ابھی اپنی چھاؤنی میں پہنچے بھی نہ تھے کہ شہر کے لوگ دیگوں میں پکا ہوا کھانا ٹھیلوں پر لادے پولیس کے گھیرے سے بچتے پہنچ گئے۔ شام کو بھی کھانا شہر سے آیا ہجرت میں نمازوں کا ذوق اور بھی بڑھ گیا تھا امام کلام مجید کی تلاوت کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ آیتیں دل میں کھبی جاتی ہیں ایسی گہری مذہبیت تھی کہ شاید اس نسل کے لوگوں پر کبھی اس سے پہلے طاری نہ ہوئی تھی۔ رہنے سہنے کی خاصی تکلیف تھی فوج کے سے انتظامات تھے پر فوج کا ساز و سامان نہ تھا مگر جن لوگوں نے وہ تکلیف

جھیلی تھی وہ سب کہتے ہیں کہ ایسا لطف کا زمانہ عمر بھر پھر نصیب نہ ہوا
رفتہ رفتہ نظم قائم ہوگیا مولانا محمد علیؒ پہلے شیخ الجامعہ تھے اونچے درجے
کے طلبا ء میں سے بعض درس کے لئے مقرر ہوئے ذاکر صاحب، نوراللہ صاحب
سید محمد صاحب، رؤف پاشا صاحب وغیرہ۔ علی گڑھ کے استادوں
میں سے مولانا اسلم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب، حافظ فیاض احمد صاحب
عبدالکریم صاحب فاروقی ترک موالات کرکے ان ہی لڑکوں کے ساتھ
چلے آئے۔ کچھ لوگ باہر سے بلائے گئے۔ تین ہندو پروفیسر مدراس سے
آئے (جن میں سے ایک ہندوستانی عیسائی مسٹر ای۔ جے کیلاٹ ہیں)
کالج سے نکالے جانے سے پہلے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء جمعہ کے دن
باضابطہ طور پر تاسیس (جامعہ کے قائم ہونے کا دن) کی رسم منائی گئی۔
علی گڑھ کالج کی مسجد میں جوش سے بھرے ہوئے طلباء اور اساتذہ جمع ہوئے
مولانا محمد علی نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی
دلوں کو گرمایا آخر میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ہاتھوں
رسم تاسیس ادا ہوئی جس کے بعد ان کا مشہور "خطبہ تاسیس" پڑھا گیا
مولانا اس خطبہ میں جامعہ اور مسلمانوں کی تعلیم کا مقصد ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں

"مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر
سے مطلقاً آزاد، کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال"

ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ
نہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے
کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور اُن عظیم الشان
مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اُس کو اپنا استاد بناتے"

جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے حکیم صاحب نے کہیں سے خیموں
کا انتظام کیا تھا، یہ خیمے غالباً نواب اسماعیل خاں صاحب نے میرٹھ
سے بھیجے تھے لیکن ان کے علاوہ ایک دو کوٹھیاں اور بھی کرائے پر
لے لی گئی تھیں اور ان ہی خیموں اور کوٹھیوں کو ملا کر مہاجرین کی
یہ ساری آبادی اس میں رہتی تھی اکثر درس کھلے میدان میں درختوں
کے نیچے ہوتے، کہاں علی گڑھ کے وہ آراستہ پیراستہ کمرے اور ان میں
آرام دہ پلنگ اور صوفے اور کہاں یہ خیمے اور بے سر و سامان کمرے
لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی بھول کر بھی ان تکلیفوں کی طرف خیال نہ جاتا
وہ ایک مذہبی اور ملی نشہ تھا جو کبھی ان مادی تکلیفوں کے احساس
کو پاس نہ آنے دیتا تھا

یہ سب جذبات اور کیفیتیں خواہ کسی اور اثر کا بھی نتیجہ رہی
ہوں لیکن اس میں ایک چیز کا بہت اثر ہے اور وہ مولانا محمد علی
کے درس کا ہے۔ مولانا کے درس کا بیشتر حصہ ڈاکٹر اقبال کی

بچھو کی ابتدائی زندگی
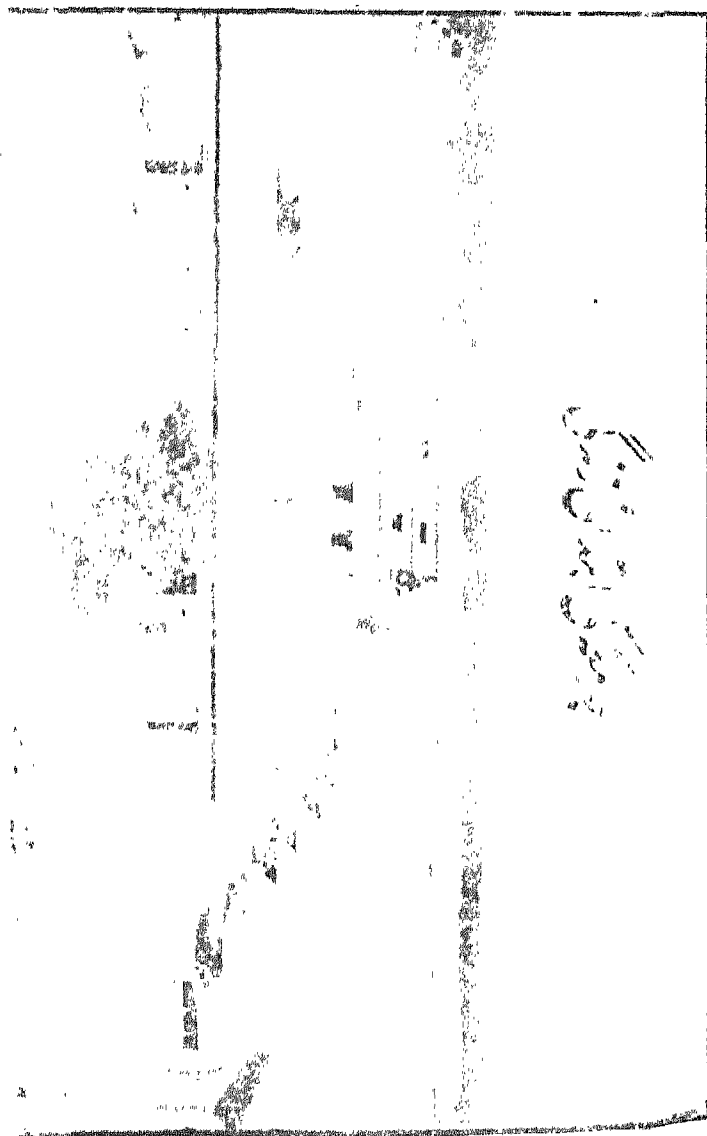
دونوں مثنویاں "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" رہا کرتی تھیں
مولانا اکثر ایک شعر پڑھتے اور اس کی تفسیر میں گھنٹوں صرف کرتے
بیچ بیچ میں روتے بھی جاتے اور رُلاتے بھی جاتے، اکثر اس کی سند
میں قرآن کی آیتیں بھی پڑھتے اور حدیثیں بھی نقل کرتے سچ یہ ہے
کہ ان مذہبی تاثرات میں لڑکوں کو قرآن اور حدیث کے مطالعہ
کا اچھا خاصا ذوق پیدا ہو گیا، اس ذوق کے بڑھانے میں غالباً
مولانا حمیدالدین صاحب فراہی کا بھی بہت حصہ ہے، جن کے سورۃ
فاتحہ کی تفسیر میں کوئی سات لکچر ہوئے اور لوگوں نے اس کے نوٹ
اور خلاصے اس طرح محفوظ رکھے جیسے انمول موتی پا لیے ہوں، قرآن
کی تفسیر کے ساتھ ساتھ مولانا محمد علی نے تاریخ اسلام پر لکچروں کے ایک
سلسلہ کا بھی انتظام کیا تھا اور یہ لکچر دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ایک
رفیق مولوی سعید انصاری صاحب نے آکر دیئے تھے یہ درس
اور لکچر کسی امتحان کی تیاری کے لئے نہ ہوتے تھے بلکہ ایک بڑی مہم
اور ایک عظیم الشان جہاد پر جانے کا پیش خیمہ ہوتے طلبا یہ لکچر
اور درس سُن سُن کر تیار ہوتے تھے اور ٹولیاں بنا بنا کر ملک کے مختلف
حصوں میں بھیج دیئے جاتے، ہم آپ اندازہ نہیں کرسکتے ہیں کہ یہ
چند روزہ تعلیم اور اس بے سروسامانی کے ساتھ کس سحر اور جادو کا کام

کرتی تھی!

اس سلسلہ میں ایک چیز یہ بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ لوگوں کا قرآن وحدیث اور علوم اسلامی سے یہ شغف کچھ زبانی درس تدریس ہی پر آکر ختم نہیں ہوگیا بلکہ لوگوں نے اس کے لئے مواد اور ذخیرہ بھی جمع کرنا شروع کیا۔ اس طرح ایک کتب خانے کی بنیاد پڑ گئی بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے علمی دفینے نکال کر دیئے جن کی فراہمی میں مولانا رشید احمد صاحب مرحوم سابق استاد علی گڑھ کالج کا بہت بڑا ہاتھ ہے لیکن درس تدریس کا یہ سلسلہ کچھ بہت عرصہ قائم نہیں رہا جو لڑکے تیار ہو کر جاتے وہ خلافت یا کانگریس کے کام کے سلسلہ میں کہیں نہ کہیں گرفتار ہوجاتے اور آخر میں تو خود مولانا محمد علی بھی نظر بند کر لئے گئے تھے جس سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا تھا دوسرے جو نئے طلبا رباہر سے آتے ان کا مطالبہ باقاعدہ تعلیم کا ہوتا اس بنا پر تعلیم کا سلسلہ کچھ بدلا اور مولانا محمد علی کے جانے کے بعد عبدالمجید خواجہ صاحب اس کے دوسرے شیخ الجامعہ ہوئے جو خود بھی جامعہ میں باضابطہ تعلیم چاہتے تھے اساتذہ تو موجود ہی تھے بُرا بھلا ایک کتب خانہ بھی ہوگیا تھا، اب ڈگی کوٹھی کے پاس چند پھوس کے بنگلے بنا لئے گئے بس بی کلاس کالج یا یونیورسٹی کی عمارت تھی اکثر پڑھائی درختوں کے نیچے ٹاٹ کے فرش پر ہوتی یا جب یہ بھی

نہ ہوتا تو اپنے اپنے چٹے بچھا لیتے یہ چٹنے کیا تھے زندگی کا کل سامان تھے
انھیں اوڑھتے بچھاتے اور کون سی غرض ہوتی جو ان سے پوری نہ کی جاتی
قرآن اور حدیث کے اکثر مسائل یا میرؔ اور سوداؔ کی بیشتر نکتہ سنجیاں
معاشیات اور سیاسیات کے اہم ترین نظریے اکثر ان ہی بوریوں پر
حل ہوئے ہیں۔ اب دوسرے سال کا حال سُنئے

کالج کی اس اعلیٰ تعلیم کے ساتھ مدرسہ کی پڑھائی کا بھی سلسلہ
باقاعدہ طور پر شروع ہوا اور رؤف پاشا صاحب جو علی گڑھ کالج کے
اُن چار ممتاز نوجوان لڑکوں میں تھے جنھوں نے کالج چھوڑ کر جامعہ میں
شرکت کی تھی سب سے پہلے نگران یا ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے

ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی محمود حسین خاں صاحب نے
پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ رسالہ "جوہر" نکالنا شروع کیا یہ اکثر ہفتہ وار
نکلتا ہے اور اس میں طلبا کے مضامین کے ساتھ جامعہ سے متعلق خبریں
اور مختلف حالات پر تبصرے بھی ہوتے ہیں لوگوں کو ہر ہفتہ اس پرچہ کا
بڑی بے صبری کے ساتھ انتظار رہتا ہے اور کارکنان جامعہ اس کے
تبصروں اور تنقیدوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں، رفتہ رفتہ یہ کُلّیہ کا مسلّم آرگن
بن گیا اور اسے کارکنان جامعہ کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی

اس زمانہ میں طلبا کی علمی دلچسپیوں میں دوسری بڑی چیز

کالج کی "انجمن اتحاد" تھی جو نہ صرف نام میں بلکہ کام میں بھی علی گڑھ کالج کی یونین کا چربہ تھی اکثر یہ انجمن "اتحاد" نہیں بلکہ طلبار کے اندر اختلاف کا باعث ہوتی پھر بھی کالج کے طلبار کے لئے نہ صرف یہ تقریر کی مشق کا ذریعہ تھی بلکہ ان کی نیابت اور ترجمانی کا واحد وسیلہ بھی تھی اس کے سب سے پہلے نائب صدر علی گڑھ کالج کے یونین کے نائب صدر سید نوراللہ شاہ صاحب (اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی) ناظم اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر حیدرآباد دکن، مہتمم کتب خانہ پیرالٰہی بخش صاحب (وزیر صوبہ سندھ) تھے لیکن اس کے بعد سب سے پہلا انتخاب جو ہوا وہ مولوی سعدالدین انصاری صاحب ندوی کا ہوا اور ان کی قابل یادگار صدارت انجمن کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی تیسرے صدر مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی منتخب ہوئے ان کے زمانہ میں انجمن نے بہت کچھ کام کئے اور کافی اثر اور قوت بھی اپنے اندر پیدا کی

اس سال کے قابل ذکر واقعات میں دوسرا بڑا واقعہ ذاکر صاحب کا یورپ جانا ہے ذاکر صاحب ایک طرف جامعہ کی کارکن جماعت میں بھی تھے اور دوسری طرف طلبار کے درمیان بھی رہتے سہتے تھے ایسی صورت میں ان کا جانا طلبار اساتذہ اور کارکنان جامعہ سب کے لئے یکساں باعث رنج والم تھا ذاکر صاحب کا

باہر جانے کا ارادہ بہت پہلے سے تھا غالباً اُنھوں نے علی گڑھ کالج
کے زمانے ہی میں پاسپورٹ وغیرہ لے لیا تھا لیکن ترک موالات کے
ہنگامہ نے انھیں اِس ارادہ کی تکمیل سے روک دیا تھا۔ اب جو کچھ
سکون پیدا ہوا تو اُنھوں نے پھر اس ارادہ کو پورا کرنا چاہا لیکن
اس مرتبہ تھوڑی سی تبدیلی یہ ہوئی کہ بجائے انگلستان جانے کے
جرمنی جانے کا قصد کیا۔ بہرحال ڈاکر صاحب مع اپنی ڈاڑھی
کے جو کسی قدر احباب کے اصرار سے تو چھوٹی ہو گئی تھی پھر بھی اپنی
اسی وضع کے ساتھ عازم یورپ ہوئے اور سب نے رنج اور خوشی
کے ملے جلے جذبات کے ساتھ انھیں خدا حافظ کہا

تیسرا سال جامعہ کی زندگی میں کسی بڑے تغیر اور انقلاب کا
سال تو نہ تھا لیکن جس تعمیری راہ پر جامعہ آگئی تھی اس میں اور پختگی
آگئی اور بس، اس سال جامعہ کی تعلیم اور زیادہ باضابطہ اور پابندی سے
ہونے لگی مدرسہ اور کالج کی باقاعدہ جماعت بندیاں ہوئیں۔ ہر مضمون
اور ہر فن کے اساتذہ بلائے گئے معمل حکمیات سامان سے اور مکمل کی گئی
پریس کا کام مستحکم ہو گیا، اسی سے ملحق ایک شعبہ تصنیف و تالیف قائم ہو گیا
طلبا اور اساتذہ کے مضامین شائع کرنے کے لئے جنوری ۱۹۲۳ء سے
رسالہ "جامعہ" نکلنے لگا اس کے پہلے مدیر نورالرحمٰن صاحب مقرر ہوئے

جامعہ کے شعبوں میں قفل سازی اور ملمع گری کے شعبہ کا اور اضافہ
کیا گیا طلبار کی برادری میں مدرسہ کے اندر انجمن اتحاد کی طرح "بزم کمال"
کے نام سے حافظ فیاض احمد صاحب کی نگرانی میں ایک انجمن قائم ہوئی
تربیت جسمانی کے سلسلہ میں اسکاؤٹنگ کی ابتدا بھی ہوئی غرض جامعہ
ہر طرح سے ایک سیاسی اور عارضی ادارہ کی منزل سے نکل کر ایک مستقل
اور تعلیمی ادارہ کی راہ پر گامزن نظر آنے لگی اور اس کے اس تبدیل ہیئت
میں جہاں اس کے دوسرے(۱۴) شیخ الجامعہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب کا بہت
بڑا ہاتھ تھا وہاں ان کے جیل چلے جانے کے بعد ان کے قائم مقام ڈاکٹر
محمد عالم صاحب نے بھی ان روائتوں کو زندہ رکھا۔ معتمد شبیر وانی صاحب تھے
اس سال میں ایک اور قابل ذکر واقعہ جلسہ تقسیم اسناد ہے جو
ہندوستان کے مشہور سائنٹسٹ پی سی رائے کی صدارت میں ہوا جلسہ
کی سب سے بڑی خصوصیت صدر کا خطبہ تھا جو مسلمانوں کے علمی اور
سائنٹفک کارناموں کی داستان تھا اور یہ داستان ایک غیر مسلم کی
زبان سے اور بھی حیرت کی بات تھی
مدھولی صاحب یہ ہے پہلے تین سال کی کہانی، صبح مجھے
بہت سارا کام کرنا ہے اب آرام کریں، خدا حافظ اور ہاں
بس یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا کہ اس کے پہلے(۱۵) امیر جامعہ حکیم اجمل خاں مقرر ہوئے

چوتھا سال

جولائی ۱۹۲۳ء سے جون ۱۹۲۴ء

جولائی میں مدرسہ کھلا لڑکے آنے شروع ہوئے ، اس
زمانے میں گرمیوں کی چھٹیاں مئی اور جون میں ہوا کرتی تھیں کلیہ
کے لڑکے "کرشنا کوٹھی" اور "بنگالی کوٹھی" میں رہتے تھے ، ابتدائی
اور ثانوی کے طلباء مطبع سے متصل فرید منزل ، دلکشا منزل ، مشرف
منزل اور کچی بارک میں تھے ان کے اتالیق حافظ فیاض احمد صاحب
اور سید نذیر نیازی صاحب تھے ، میرے لئے لڑکوں سے ملنے ملانے
ان کی رات کی پڑھائی میں شریک ہونے میں سہولت ہو گئی تھی
انگریزی کے علاوہ باقی تمام مضامین میں ثانوی اول والوں سے
کچھ زیادہ ہی تھا بس انگریزی کی کسر تھی سو اس کے لئے مطبع کے

منیجر صاحب کے توسط سے ایک پیریڈ کے لئے ثانوی اول میں بیٹھنے
کی اجازت لے لی تھی اس طرح میرا نام حاضری کے رجسٹر میں بھی لکھا
گیا اور بزم کمال کے جلسوں میں بولنے کا اختیار مل گیا۔ اس وقت
حافظ صاحب کی نگرانی میں مدرسہ کی یہ انجمن بہت زوروں پر تھی
انعامی مقابلے، مدرسہ کے مسائل، حالات حاضرہ، بحث والے مضامین
نظمیں، غرض کہ ان سب کا پروگرام بہت دلچسپ ہوا کرتا تھا سچ تو
یہ ہے کہ جمعرات کا دن سب لڑکوں کے لئے خوشی کا دن ہوا کرتا تھا،
اُس زمانے میں کلّیہ میں تو بہت لڑکے تھے کیونکہ یہ سب علی گڑھ اور
دوسرے سرکاری مدرسے چھوڑ کر آئے تھے ان کی "انجمن اتحاد" بھی
عروج پر تھی، جلسے "محمد علی ہال" میں ہوتے تھے، ابتدائی اور ثانوی
والوں کو شریک ہونے کا موقع ملتا تھا بیشتر اُستاد بھی حصہ لیتے تھے
اس لئے "بزم کمال" کی کامیابی پر اس انجمن کا بھی اثر پڑا" سیر و تفریح
(اکسکرشن) کے لئے باہر جایا کرتے تھے، خصوصاً گنے پیلے جانے کے
زمانے میں لڑکے زیادہ ہونے کی وجہ سے شام کے وقت جہاں تہاں
کھیل ہی کھیل نظر آتے تھے اسی سال ترکوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ
خلافت کو اپنے پاس نہیں رکھیں گے یعنی ساری دنیا کے مسلمانوں کی
ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لیں گے، یہ فیصلہ ٹھیک تھا یا نہیں اس کی

بحث ثانوی کے انعامی مقابلے کے لئے رکھی گئی تھی مجھے خود تو حالات معلوم نہیں تھے لیکن کالیہ کے ایک لڑکے سے یہ تقریر لکھوالی اور جنگل میں جاکر رٹا کرتا تھا، مدراس کے ایک استاد محمد ابراہیم صاحب سے جو فن تقریر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ آج کل مدراس کے مہتمم تعلیمات ہیں) اس کی مشق کی۔ چند ساتھیوں کے سامنے نمونے کے طور پر سنایا کرتا تھا، مقابلہ کا دن آیا سب اُستاد اور لڑکے جمع تھے تقریر شروع کی بات بات پر تالیاں بجتی تھیں، جب نتیجہ سُنایا گیا تو میرا پہلا انعام نکلا، پھر تو لڑکوں سے میل ملاپ بھی بڑھنے لگا تقریروں کا ذکر آیا ہے تو ایک اور جلسہ کا ذکر کردوں جس کا شمار جامعہ کے پہلے دور کے بڑے جلسوں میں ہوتا ہے یہ تھا "سندوں کی تقسیم کا جلسہ" اس کے صدر مشہور نومسلم انگریز محمد مارما ڈیوک پکھتال تھے، کئی دن پہلے سے تیاریاں ہو رہی تھیں محمد علی ہال اور اس کے احاطے کو پھول پتیوں اور سبزے سے سجایا گیا تھا، مہمانوں کے لئے جا بجا خیمے لگے ہوئے تھے لڑکوں کی طرف سے دُکانیں بھی کھولی گئی تھیں، حامد علی خاں صاحب کی نگرانی میں اسکاؤٹنگ کا انتظام تھا ایک خاص بات یہ تھی کہ جامعہ کے تمام طلبا اور اساتذہ ایک ہی لباس میں تھے اور سب نے ہرے ہرے چغے پہن رکھے تھے بڑے پیمانے پر سب لوگوں کے لئے دعوتی کھانے کا

انتظام تھا بیشتر کام ثانوی کے بڑے اور کلیہ کے طلبا نے کیا تھا
کیونکہ اس زمانے میں یہی لوگ پیش پیش رہتے تھے اور ان کی تعداد بھی
زیادہ تھی

رات میں طلبا کا مشاعرہ ہوا، طبیعت موزوں ہو تو اکبر علی صاحب
مزاحیہ نظمیں کہہ لیتے ہیں، آپ کی ایک نظم پر حاضرین لوٹ لوٹ گئے

ستمبر ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی جیل سے چھوٹ کر آئے تو جامعہ کے
تمام طلبا کی طرف سے محمد علی ہال میں جلسہ ہوا، اقبال کی مشہور نظم "ہے
اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند" بڑے جوش کے ساتھ پڑھی گئی
مولانا نے ایک جوش دلانے والی تقریر کی اور اپنا وہ شعر بھی سنایا جو
رہا ہوتے وقت کہا تھا

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی
پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے

اس جلسہ میں انجمن اتحاد کے نائب صدر شفیق الرحمٰن صاحب نے
اپنے سپاسنامہ میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی فرمایا تھا "ع "وہ جو ہم رکھتے
تھے اک حسرت تعمیر سو ہے" اس پر مولانا نے اپنی وہ مشہور تقریر کی جس سے
جامعہ کے متعلق ان کا اصل خیال ظاہر ہوتا ہے، انھوں نے فرمایا کہ "ہم نے
کبھی تعمیر کا ارادہ کیا ہی نہیں تھا جس کی حسرت آج ہمارے دل میں ہو

جامعہ کی یہ آبادی تو مدینہ کے مہاجرین اور انصار کے لوگوں کی طرح ہے جو فتح مکہ کے انتظار میں ہیں ہمارا اصل قلعہ تو علی گڑھ کالج ہے جس پر ہمیں ایک نہ ایک دن قبضہ کرنا ہے"

اسی سردیوں میں دہلی میں کانگرس کا خاص جلسہ ہوا مولانا ابوالکلام کا خطبہ صدارت جامعہ ہی کے مطبع میں تیار ہو رہا تھا مطبع کے لوگ رات دن کام میں لگے ہوئے تھے منیجر صاحب نے یہ دیکھ کر کہ مجھے جلسوں سے دلچسپی ہے کہہ دیا تھا کہ خطبہ کے تیار ہونے پر اسے دہلی پہنچانے والوں میں مجھے بھی شامل کر لیں گے' اس طرح پہلی دفعہ کانگرس کا بڑا جلسہ اور دہلی دیکھنے کا موقع ملا

اس جلسے میں اس بات پر بحث چھڑی ہوئی تھی کہ آیا صرف برطانی مال کا بائیکاٹ کریں یا بدستور تمام ملکوں کے مال کا بائیکاٹ جاری رہے تبدیلی کے حامی صرف برطانی مال کا بائیکاٹ چاہتے تھے اور تبدیلی کے مخالف اس تجویز کو رد کرنا چاہتے تھے، مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان دو پارٹیوں میں کس قسم کے اختلافات ہیں لیکن جی چاہتا تھا کہ تبدیلی کے مخالف جیت جائیں

"انجمن اتحاد" اور "بزم کمال" کی مسند نشینی کے جلسے بھی خاص جشن کی حیثیت رکھتے تھے سب لوگوں کو ان کا انتظار رہتا اس کی بڑی وجہ یہ تھی

کہ یہ دونوں انجمنیں مدرسہ کی دلچسپیوں کا خاص مرکز تھیں
اس سال جب بزم کمال کی مسند نشینی کا جلسہ ہو رہا تھا ایک رنج کی بات بھی ہوئی یعنی مدرسہ کے ایک طالب علم (نائر) جو کئی دنوں سے بیمار تھے انتقال فرما گئے جب یہ خبر لڑکوں کو معلوم ہوئی تو انھوں نے باقی کارروائی کو بہت خاموشی سے انجام دیا اور کسی موقع پر تالی نہ بجائی ۔
"بزم کمال" کے جلسوں نے ایک شخص سے ایسی دوستی کرادی جو آج تک قائم ہے
عبدالواحد صاحب سندھی (جو آج کل ہمارے مدرسے کے استاد ہیں) یہ بھی میری طرح بے سروسامان تھے بس اتنا فرق تھا کہ انھیں سندھ کے کسی دل والے نے وظیفہ دے کر جامعہ بھیج دیا تھا ابتدائی ششم میں داخل ہوئے تھے انھوں نے کئی دفعہ بزم کمال کے جلسوں میں زیادہ تقریریں کرنے کا انعام لیا تھا موافقت یا مخالفت میں زیادہ بولنے کی وجہ سے یہ جھگڑالو مشہور ہو گئے تھے اس کا اثر ان کی زندگی پر اتنا پڑا کہ یہ اب بھی ساتھیوں سے جھگڑتے رہتے ہیں چونکہ خود کام کرتے ہیں اور یہ جھگڑے مدرسے کے کاموں کو بہتر بنانے کے لئے ہوتے ہیں اس لئے کوئی برا نہیں مانتا ہے ، حالات ملتے جلتے ہونے کی وجہ سے ہم دونوں میں راز کی باتیں ہوتی تھیں ایک موقع پر طویل گفتگو کے بعد سنجیدگی سے اور قسمیں کھا کر

ہم دونوں میں معاہدہ ہوا کہ جامعہ سے پڑھ لکھ کر ایسے دیہات میں جائیں گے جہاں پہلے سے مدرسہ نہ ہو لڑکوں کو جمع کر کے چوپال میں پڑھائیں گے ہمارا خرچ ہی کیا ہے پیٹ تو بھر جایا کرے گا دو جماعتوں کے لئے دو اُستاد بہت ہیں جامعہ کے نصاب کے مطابق تعلیم دیں گے سال بھر تک کسی کو پتہ نہ دیں گے جب سال گزر جائے گا تو شیخ الجامعہ صاحب کے پاس درخواست بھجوائیں گے کہ وہ اس مدرسے کا معائنہ کریں چونکہ نتیجہ اچھا ہوگا اس لئے وہ اس مدرسے کو جامعہ کی شاخ بنالیں گے، مدرسے میں جو مالدار لڑکے پڑھتے ہیں جب یہ بڑے ہو جائیں گے تو ان سے درخواست کریں گے کہ وہ دیہات کے مدرسے کی عمارت کے لئے چندہ دیں

بعض مالدار لڑکے تو ایسے تھے کہ ان سے اُسی وقت اس کا ذکر کرنے کو جی چاہتا تھا مگر یہ خیال کر کے کہ یہ بات عام ہو گئی تو لوگ مذاق اُڑائیں گے بہت چھپائے رکھا کسے معلوم تھا کہ اللہ میاں ایک دن کسی نہ کسی شکل میں اس آرزو کو پورا کریں گے یہ معاہدہ مشرف منزل (ایک اقامت گاہ) میں ہوا تھا اس لئے آج تک ہم اسی نام سے یاد کرتے ہیں

کُلّیہ کے طلبا کے لئے اخبارات میں لکھنے لکھانے کا طریقہ

صحافت سکھانے کے لئے مسٹر داؤد اسپن اسی سال جامعہ میں تشریف لائے ثانوی کے طلبار کے لئے تجارتی حساب کتاب (BOOK KEEPING) کا انتظام بھی کیا گیا

سالانہ امتحانات اپریل میں ہوئے۔ میں بھی ثانوی اول کے طلبار کے ساتھ امتحان میں شریک ہوا جب نتیجہ سنایا گیا تو کامیاب نکلا اس طرح ایک سال گزر گیا طلبار اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میں بدستور مطبع میں کام کرتا رہا ساتھیوں کے چلے جانے سے دل پر اداسی رہتی تھی لیکن اس خیال سے اطمینان ہو جاتا تھا کہ دو مہینے بعد مدرسہ کھل جائے گا کلیہ کے چند طلبار چھٹیاں گزارنے کے لئے جامعہ ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے اکبر علی صاحب سے پہلی بار دوستی ہوئی ان کی خوش باشی اور آزادہ روی سے میری طبیعت میل کھاتی ہے اس لئے دوستی میں دشواری نہ ہوئی ہمارے گروہ کے ایک اور سرغنہ وحید اللہ صاحب بھی موجود تھے ہم لوگوں کا یہ معمول تھا کہ شام کے وقت خربوزوں کے کھیت پر چلے جاتے اور رات میں حاجی موسیٰ خاں صاحب کے ہاں گھنٹوں گپ شپ رہا کرتی

پانچواں سال

جولائی ۱۹۲۴ء سے جون ۱۹۲۵ء

پہلی دفعہ نصاب تعلیم اور دستور العمل چھپا اس کی رو سے مدرسے کے بچوں کو جلد سازی، پارچہ بافی، قفل سازی چھپائی ٹائپ، مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ)، خوش خطی میں سے کسی ایک چیز کا سیکھنا لازمی رکھا گیا ثانوی اول کی کامیابی اور مطبع میں کام کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے پھر وظیفہ کی درخواست دی شیخ الجامعہ صاحب فرمانے لگے "اگر پورا وظیفہ دیا گیا تو اس کی بے قدری کا اندیشہ ہے یہ ہو سکتا ہے کہ تم جو کچھ کماتے ہو وہ مطبع میں دے دو باقی رقم (اس وقت مدرسے کی فیس پندرہ روپئے بارہ آنے تھی) کا وظیفہ منظور کر کے ہم باقاعدہ

طالب علم بنا لیتے ہیں اگر استادوں کی سفارش ہوئی کہ پڑھنا
ان کے لیے مفید ہے تو کام کے گھنٹوں میں کمی کرا دی جائے گی
ورنہ چھاپے خانے کے کام میں سند مل جائے گی

اب مجھے اطمینان ہوا کہ آئندہ کا فیصلہ میرے کام پر
منحصر ہے پہلی دفعہ لڑکوں کے ساتھ رہنے کے لیے "رکیجی بارک"
کے اقامت خانے میں جگہ ملی میرے ساتھی (کمرے والے)
برادر کے مقصود تھے، زمیندار کے لڑکے بڑے محنتی ملنسار، خود
تو کم پڑھتے تھے لیکن میرے کام کی قدر کرتے تھے جب تک جامعہ
میں رہے مجھے اپنا روم فیلو (کمرے کا ساتھی) بنایا سیر و تفریح
اور دوسرے کاموں کے لئے جتنے بھی چندے ہوتے تھے میری
طرف سے ادا کر دیتے تھے۔ جب بھی کمروں کی تبدیلیاں ہوتیں
"نائیق صاحب کہا کرتے" مدھولی اور مقصود تو ایک ہی کمرے
میں رہ سکے" بات یہ تھی کہ مجھے ان کی شرافت اور قدر شناسی
پسند تھی، وہ میری زیادہ دلی، محنت کو سراہتے تھے، ہر طرح
کی میزبانیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے میرا میل جول سب ہی
لڑکوں کے ساتھ بڑھتا گیا خاص طور پر ابتدائی مدرسے کے
لڑکے مجھ سے بہت خوش رہتے تھے۔ جہاں کہیں ان کی

ٹولی دیکھتا وہیں چلا جاتا اِن کی اور اِن کے کھیل کی نقلیں مزے لے لے کر کرتا قلابازیاں لگاتا مجھے یہ اپنے کھیل میں شریک کر لیتے تھے اس موقع پر اختر امام (حسن امام کے.....

جواب ڈاکٹر اختر امام پروفیسر شعبہ اسلامیات ہیں) بہت یاد آتے ہیں ان کی عمر کوئی دس سال کی ہوگی، اچھے خاصے شریر مگر بہت ہنس مکھ تھے مجھ سے بہت مانوس تھے جہاں کہیں دیکھ پاتے کسی نہ کسی نقل کی فرمائش کرتے اور بہت ہنستے ہر ملاقات میں ایک دفعہ میری پیٹھ پر ضرور سوار ہوتے

اسی زمانے میں بزم کمال کے سالانہ انتخابات ایسے ہی جوش و خروش کے ساتھ ہو رہے تھے جیسے میونسپلٹی، کانگرس یا اسمبلی کے ہوتے ہیں محمود صاحب (ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی) کی صدارت کے لئے تو سب متفق تھے لیکن باقی چیزوں کے لئے جھگڑا تھا محمود صاحب کہا کرتے بھائی مدھولی (وہ مجھے اب تک اسی نام سے پکارتے ہیں) کسی سے کہنا مت۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ تمہاری پارٹی کی وزارت کامیاب ہو جائے میں بھلا ایسی بے وقوفی کی بات کیوں کرتا جس سے

صدارت کے معاملے میں بھی جھگڑا پڑ جائے۔ اس انتخاب میں
ڈسکالروں کے گھروں پر بھی جانا پڑا بالآخر ہماری پارٹی جیت
گئی اس میں میرا نام مجلس منتظمہ کی رکنیت کے لئے رکھا گیا تھا
دوسری پارٹی والے کہا کرتے تھے " ہماری طرف آجاؤ، تمہارا
نام ہم اپنے ہاں رکھ لیتے ہیں مجھے کسی سے دشمنی تو تھی
نہیں یہی کہا کرتا کہ ایک طرف ہونا تھا اِدھر یا اُدھر
اب جو فیصلہ کر لیا وہ کر لیا

ہر جمعرات کو مضمون کی موافقت اور مخالفت میں جو
تقریریں ہوتی تھیں ان میں بھی حصہ لیتا تھا ہم لوگ پہلے سے
طے کر لیتے تھے کہ فلاں فلاں موافقت میں کہیں گے اور فلاں
مخالفت میں ایک دوسرے کے مضمون دیکھ کر دلیلیں تلاش
کر لیتے تھے

اتحادی دکان کو قائم ہوئے ایک سال ہو چکا تھا مگر
کام کو بڑھانے کی ضرورت تھی ہمارے اتالیق حافظ صاحب نے
کچھ وقت کے لئے مجھے مقرر کیا وہ چاہتے تھے کسی طرح بکری
بڑھے اور بھی کئی ساتھی باری باری سے کام کرتے تھے
ایک تو ہم نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ دکان کھلی

رہنے کے جو وقت ہیں ان میں فرق نہ آئے گا دوسرے تازہ مٹھائیوں کے اشتہار روز کے روز لگاتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا سامان خریدنے کے لیئے کسی کو بازار جانے کا موقع ہی نہ دیتے تھے جو لڑکا جس چیز کی فرمائش کرتا جھٹ سے اس کا انتظام کر دیا جاتا سردیوں میں حلوے کا انتظام تھا غرض کسی لڑکے کو شکایت کا موقع نہ ملتا تھا اگر کوئی باہر سے کچھ خریدتا بھی تو لڑکے کہتے آخر تمھیں کس چیز کی تکلیف ہے جو یہاں سے نہیں خریدتے ہو دُوکان والوں نے کبھی تمھاری فرمائش ٹالی!!"

دُوکان میں جتنی چیزیں آتیں وہ ایک طرف لکھ لیتے اور جو کچھ بکتیں وہ دوسری طرف اس طرح مقابلہ کرنے کا موقع مل جاتا روزانہ رات کو دن بھر کی بکری اتالیق صاحب کو لے جا کر دیتے یہ روزانہ کی چاٹ اتالیق صاحب کو ایسی لگی کہ جب کبھی مغرب کے بعد حساب دینے میں دیر ہو جاتی تو وہ کہا کرتے "ارے بھائی میں انتظار کر رہا ہوں جو کچھ دینا ہو دیدو" سال کے آخر میں اس دُوکان سے مجھے بیس روپیئے کا پہلا انعام ملا یہ دام کپڑے بنانے میں بہت کام آئے

مدرسے میں جہاں "جوہر" اور "چمن" جیسے سنجیدہ رسالے
نکلا کرتے تھے وہیں "لوقان" اور "پنچ" کے نام سے مذاقیہ رسالے
بھی موجود تھے "لوقان" کے مدیر فیاض حسین صاحب (جو آجکل
رسالہ ہونہار کے مدیر ہیں) اور "پنچ" کے . . . . . صاحب تھے
ان میں مذاق مذاق میں کام کی باتیں کہہ دی جاتی تھیں اور ہنسانے
والے کارٹون بھی ہوتے تھے میں نے سوچا کہ بڑی انجمنوں کی
نقل میں کیوں نہ ایک مذاقی انجمن قائم کریں بھائی واحد میٹھا
کھانے میں مشہور تھے ان سے مشورہ لیا تو کہنے لگے یار رسول
ڈرتے ہو. پشاوری نوجوانوں کی ایک انجمن قائم کرو اور اس میں میٹھی
چیزیں کھانے کا مقابلہ رکھو دیکھوں تو کیسا پشاوری پٹھان
ہے جو میرے مقابلے میں اول آئے اس زمانے
میں مطبخ کا ناظم کالج کا طالب علم ہوا کرتا تھا.
جب ان سے ذکر کیا تو یہ راضی ہو گئے مقابلے کا اعلان ہوا سوڈے
کی بوتلوں کا انتظام کر لیا گیا تھا اس مقابلے میں زیادہ تر پشاوری لڑکے
شریک ہوئے عام کھانا ختم ہونے کے بعد یہ لڑکے درمیان میں
بٹھا دیئے گئے اور تمام لڑکے ان کے گرد جمع تھے نہ جانے کتنا
ہی میٹھا ختم ہو گیا تالیاں بجتی گئیں اور یہ کھاتے گئے نتیجہ میں

عبدالواحد صاحب نے زردے کی سات پلیٹیں کھائیں (نہیں پہلا انعام ملا) سبکو تو لیس پلائی گئیں ۔ دوسرے دن جب استادوں کو معلوم ہوا تو وہ بہت گھبرائے ۔ یہ لڑکے ڈاکٹر صاحب کو دکھائے گئے اور میرے کان کھینچے گئے کہ ایسی شرارت کیوں کی ، معلوم نہیں کالج کے لڑکوں سے پوچھ گچھ ہوئی یا نہیں اگر یہ شرارت نہ سوجھتی تو شاید کوئی اچھی سی مذاحیہ انجمن قائم ہو جاتی پھر میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا۔ایک اور معاملے میں بھی ایسی ہی شرمندگی اٹھانی پڑی ۔ علی گڑھ کی نمائش ہو رہی تھی تھیٹر کمپنی آئی ہوئی تھی اس کے تماشے تو رات کے پچھلے پہر تک ہوتے ہیں مگر ہمیں اس وقت تک نمائش میں رہنے کی اجازت نہ تھی بہت سے لڑکے تماشہ دیکھنا چاہتے تھے ۔میں نے کہا اس کی ایک ہی صورت ہے ، اس وقت تو اقامت گاہ لوٹ چلو رات کی حاضری دے کر چوری چھپے چلے آئیں گے ۔ رات کو کوئی ۹ بجے تک آتالیق صاحب (ان دنوں حافظ فیاض احمد صاحب تھے) کے کمرے کے گرد چکر کاٹتے رہے ۔ جب وہ سو گئے تو ایک غول کا غول تماشا دیکھنے چلا آیا ۔ صبح خبر ہوئی معاملہ نگران صاحب تک پہنچا رؤف پاشا صاحب کسی اور مدرسے

میں منتقل ہو گئے تھے ۔ کچھ دنوں کے لئے حیات صاحب ، پھر عبدالکریم صاحب فاروقی نگران ہوئے تھے ۔ فاروقی صاحب فوراً ہی غصّہ میں آجاتے تھے اور نرم بھی جلد پڑجاتے تھے ۔ بلکہ ایک ہی ساتھ غصّہ اور نرمی دکھاتے تھے ۔ طبیعت میں اُتار چڑھاؤ تھا ۔ ان کی باتوں سے ہنسی بھی بہت آتی تھی ۔ قطار کی قطار سامنے ہوئی ، یہ تو معلوم ہی ہو گیا تھا کہ لڑکوں کو جمع کرنے والا میں ہی تھا ۔ فرمانے لگے

"کہاں ہے مدھولی (سب میری طرف دیکھنے لگے) ۔ ماشاء اللہ ۔ اکیلے جی نہیں لگتا تھا ۔ دو چار لڑکوں کو ساتھ لے جاتے یہ آدھا بورڈنگ !!"

"سب اپنی خوشی سے گئے" ، میں نے دبی زبان سے کہا ۔

"چل چل سب اپنی خوشی سے گئے ۔ صفائی بھی پیش کرنا جانتا ہے"

"ہاں صاحب ہم سب اپنی خوشی سے گئے" چند آوازیں سنائی دیں

"آپ لوگ خاموش رہئے۔ ہماری اور مڈھولی صاحب کی باتیں ہو رہی ہیں"۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر (مذاق کے انداز میں) کہنے لگے

"مڈھولی ہمارے لڑکے جو اس قدر نیک، شریف الذات اور تھیٹر سے نفرت کرنے والے ہیں۔ تمہاری باتوں میں کیسے آ گئے"۔ اس پر سب لڑکے ہنس پڑے

"یہ نہ سمجھو کہ معاملہ ہنسی ہنسی میں ٹل گیا!" حافظ صاحب سے مخاطب ہو کر جو ہمارے اتالیق تھے کہنے لگے

"حافظ جی۔ ناظم مطبخ کو لکھ دیجئے کہ آج سے اِن لڑکوں کو بطور جرمانہ ایک ہفتہ تک دال کھلائی جائے"۔ (سب کی طرف مخاطب ہو کر) دفع ہو جائیے یہاں سے!"

اس طرح ایک ہفتہ تک دال کھانی پڑی

یہ سال جامعہ کے اُستادوں کے لئے آزمائش کا سال تھا۔ خلافت کی تحریک بے جان پڑ گئی تھی۔ جو امداد جامعہ کو مل رہی تھی وہ بند ہو گئی۔ حکیم اجمل خاں صاحب امیر جامعہ نے یہ تجویز سب کے سامنے رکھی کہ اگر جامعہ دہلی میں منتقل ہو جائے تو وہ زیادہ توجہ دے سکیں گے۔ کلیہ

اور مدرسہ کی انجمنوں میں بھی اس بارے میں بحث ہوئی سب لڑکوں کی یہی رائے تھی کہ جامعہ کو علی گڑھ ہی میں رہنا چاہیئے۔ مگر اُستادوں نے سمجھایا کہ ایک ہی مقام پر مسلمانوں کے دو مشہور مدرسے رہنے سے آپس کی مخالفت کا اندیشہ ہے۔ بالآخر ۱۷ مارچ ۲۵ء کو "بنیادی جماعت" نے فیصلہ کیا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں جامعہ دہلی میں منتقل ہو جائے۔ ڈاکٹر انصاری نے معتمد کے فرائض اپنے ذمے لے لئے

چھٹیوں میں سامان منتقل ہونے لگا۔ لیکن مطبع کے متعلق طے ہوا کہ اس کی منتقلی ابھی نہ ہوگی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا کام شاید پھر بگڑ جائے۔ میں نے شیخ الجامعہ صاحب کے نام ذیل کی باتوں پر مشتمل ایک درخواست لکھی کہ پچھلے دو سالوں میں :-

۱ - ثانوی اول اور دوم کے امتحانوں میں کامیاب رہا ہوں
۲ - مدرسہ کی انجمن کی مجلس منتظمہ کا رُکن ہوں
۳ - تقریر میں پہلا انعام حاصل کیا ہے
۴ - اتحادی دُکان نے بھی اچھی کارگزاری کی وجہ سے

پہلا انعام دیا ہے
شیخ الجامعہ صاحب سامان بھجوانے میں مصروف تھے
میں بھی کام کر رہا تھا۔ فرمانے لگے "آپ کی درخواست آنے
سے پہلے ہی دہلی جانے والوں میں نام لکھ لیا گیا ہے
اب تو میں اور خوشی خوشی کام کرنے لگا۔ گھر سے چلے ہوئے
دو سال ہو چکے تھے۔ رازدار ساتھی کے خط سے معلوم
ہوا تھا کہ والدہ بہت پریشان ہیں اور اکثر رویا کرتی ہیں
میں نے خط وکتابت جاری رکھنے کا ارادہ کرلیا۔ بھائی صاحب
کو اپنا موجودہ حال بتلاتے ہوئے انھیں لکھا کہ ہمارا مدرسہ
دہلی منتقل ہو رہا ہے۔ اس پتہ سے خط وکتابت جاری
رکھیں

جامعہ کا چھٹا سال جولائی ۲۵ء کو دہلی میں شروع
ہوا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں مجھے یہ معلوم کرکے افسوس ہوا
کہ عبدالواحد صاحب کے وظیفہ میں جھگڑا ہے۔ یہ مایوسی
کی حالت میں کراچی چلے گئے۔ میں نے انھیں خط لکھا کہ
آپ محنت مزدوری کرکے اپنی تعلیم جاری رکھئے۔ اس

وقت میرے پاس فوراً چلے آئے چھٹیوں بھر آپ کے گزلے کا کام میں سنبھال لوں گا۔ جب یہ لوٹ کر آئے تو میرے پاس تھوڑے سے پیسے تھے، ہم دونوں نے اسٹیشن کے قریب ایک بھٹیارے سے معاملہ کرلیا تھا۔ دونوں وقت کھانے کے لئے وہیں چلے جاتے تھے۔ اس بے سر وسامانی کی حالت میں ایک ساتھی کی مدد کرکے جو خوشی مجھے حاصل ہوئی ہے وہ میرے لئے اب نعمت معلوم ہوتی ہے۔ صبح اور شام کا یہ سفر ہم کبھی نہ بھولیں گے

چھٹا سال

جولائی ۱۹۲۵ء سے جولائی ۱۹۲۶ء

مقام کی تبدیلی کی وجہ سے لڑکوں کی تعداد کم ہوگئی۔ طبیہ کالج سے متصل چند کوٹھیاں لی گئی تھیں۔ اسی میں سب لوگ رہتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ان کوٹھوں کو چھوڑکر ایک بہت لمبی دو منزلہ عمارت لی گئی۔ اس میں ابتدائی ثانوی کلیہ کے سب طلبہ آگئے تھے۔ علی گڑھ میں سہ پہر کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد "ڈرل" ورزش کے طور پر ہوتی تھی۔ دہلی منتقل ہونے کے بعد جب سب لڑکوں کے اتالیق کیلاٹ صاحب ہوئے تو انھوں نے صبح کی ورزش کا قاعدہ نکالا جامعہ کے چھوٹے بڑے سب لڑکے صبح کی نماز کے بعد ایک

میدان میں جمع ہوکر ایک ساتھ ورزش کرتے تھے۔ یہ طریقہ
اب تک رائج ہے۔ مگر ابتدائی اور ثانوی و کلیہ کی ورزش
علیحدہ ہوتی ہے۔ اس دفعہ انتخابات کی چہل پہل بہلی سی
نہیں تھی۔ میں ہونے کو تو ناظم کتب خانہ (بزم کمال) ہوگیا
مگر ۲۴ء کا سا لطف کہاں۔ جلسے ٹھنڈے پڑ گئے۔ دعوتیں
بے لذت ہوگئیں۔ جماعتوں میں وہ رونق نہ تھی۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا کوئی بڑی دکان ایک مقام پر دیوالیہ ہوکر دوسری
جگہ آئی ہے اور وہ یہاں اپنے ٹوٹے پھوٹے سامان کی مرمت
کر رہی ہے۔ اس امید پر کہ اس کا کام پھر چل پڑے گا۔
جامعہ کے کارکنوں میں بھی کمی ہوگئی تھی۔ اس لئے بعض
کام کلیہ کے لڑکوں کو سنبھالنے پڑے مثلاً رسالہ جامعہ کے
مدیر نور الرحمن صاحب کی جگہ، یوسف حسین خاں صاحب (آج
کل حیدرآباد میں پروفیسر ہیں) ہوئے۔ مکتبہ کا کام یکے بعد
دیگرے اکبر علی صاحب۔ منظور احمد صاحب نے سنبھالا۔ حافظ
صاحب نے (جو اب تک اتالیق اور مدرس تھے) دفتری
کام کی ذمہ داری لی۔ ثانوی کے بعض گھنٹے کلیہ کے
طلبہ پڑھایا کرتے تھے۔ حارث صاحب کی اذان کو سب لوگ

یاد کرتے تھے ۔ لیکن اُنھوں نے ایک سال کے بعد صورت دکھائی موذن کی خدمت کے علاوہ اُنھوں نے مطبخ کی نظامت کے کام میں جان ڈال دی ۔ جگہ کی تبدیلی سے کچھ طبیعتوں کی تبدیلی تھوڑی ہی ہوا کرتی ہے ۔ ہاں کچھ عرصے کے لئے ٹھنڈی پڑجاتی ہے ۔ ایک دن فاروقی صاحب ثانوی چہارم والوں سے کہنے لگے ۔ (اس جماعت میں میں بھی شامل تھا)
"بشاؤ جی ان جھگڑوں کو اِس کی کمی ہے اُس کی کمی ہے کھولو اپنی کتابیں" ہم سب نے اپنی کتابیں کھول لیں " مگر بند کردان کتابوں کو ـــــ یہ بھی کوئی بات ہے پہلے اِس جماعت میں تیس لڑکے تھے ۔ اب دس ہیں ۔ ان میں سے بھی ایک مُدھولی ہے ۔ جسے انگریزی خاک نہیں آتی ۔ رہ گئے نو لڑکے ۔ ان سکا کیا پڑھانا!"

(میری طرف خاص طور پر مخاطب ہوکر) حیدر آباد سے موں سون کے آنے میں بھی کئی دن لگتے ہیں ۔ یہ تم کیسے چلے آئے !! یہ سلسلہ کلام پہلے سے تعلق رکھتا تھا یعنی کئی دفعہ یہ ذکر آچکا تھا ۔ ایک لڑکے نے کہا :-
"گڈس ٹرین میں بیٹھ کر"

اس پر فاروقی صاحب بولے "تب ہی تو کہتا ہوں۔ گڈس ٹرین میں بیٹھ کر آنے والوں کو کہیں انگریزی آیا کرتی ہے پچھلے سال اتحادی دُکان میں دوُدھ بیچا کرتا تھا۔ اس سال بھی دودھ کی دُکان کھول لے"

یہ باتیں وہ دلچسپی کے لئے کہا کرتے تھے۔ پھر بھی بعض دفعہ میں اُداس سا ہو جاتا تھا۔ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ فرمانے لگے " لو بھائی۔ مُدھولی خفا ہو گیا۔ اچھا نکالو تم اپنی کتابیں۔ تو کل کہاں تک پڑھا تھا ؟" سبق جاری رہا لیکن اِس دفعہ میری طبیعت پھر بھی اُداس رہی۔ فاروقی صاحب اپنے شاگردوں کو خفا کرنے کے بعد خوش کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ سبق کا کچھ حصّہ ختم کرنے کے بعد فرمانے لگے :-

" لڑکو فرض کرو جامعہ کا کام نہیں چلتا۔ ہم لوگ سرکاری مدرسوں میں واپس جانے سے تو رہے۔ اس صورت میں ہم کریں گے کیا۔ بہتر تو یہ ہے کہ دُکانیں کھول لیں۔ مُدھولی کی دُکان تو طے ہو گئی۔ عابد (مولانا شوکت علی کے بیٹے) تو لیڈر کا لڑکا ہے یہ لیڈر ہی رہے گا۔ بشیر (جو آج کل جموّں کے محکمہ کسٹم کے افسر ہیں) تو پہلوانی کے لئے

ٹھیک ہے۔ سمیع (حیدر آبادی طالب علم) اورنگ آباد کا جامہ وار اور ہمرو بیچیگا۔ اس طرح اور لڑکوں کا نام لیا آخر میں فرمانے لگے۔ "ہم (یعنی خود) ڈھولی کی دوکان پر دودھ پیا کریں گے۔ اور کیا ایک بوڑھے کی گزر تو ہو جایا کرے گی!" اس پر سب لڑکے ہنس پڑے۔ میں بھی مسکرا دیا

غالباً اسی زمانے سے گاندھی جی نے "خاموشی کا روزہ" شروع کیا تھا۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ گاندھی جی ہفتہ میں ایک دن یعنی ہر پیر کو چوبیس گھنٹے کے لئے بالکل خاموش رہتے ہیں۔ کسی سے بات چیت نہیں کرتے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو کسی پُرزے پر لکھ کر یا اشارے سے اپنا مطلب سمجھاتے ہیں۔ ایسا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ چھ دن متواتر کام کرنے کے بعد ایک دن مکمل آرام کا موقع مل جائے۔ مجھے بھی ایسا روزہ رکھنے کا شوق ہوا جماعت کی پڑھائی اور جمعرات کے جلسے ضروری تھے اس لئے یہ روزہ جمعہ کی صبح کی نماز سے لے کر سنیچر کی صبح کی نماز تک رکھا کرتا تھا۔ کیلاٹ صاحب (اتالیق) کو اس کا علم نہیں تھا۔ اس روزہ میں ایک دن وہ مجھ سے باتیں کرنے لگے میں اشارے سے جواب دیتا گیا۔

وہ سمجھے مجھ سے مذاق کر رہا ہے۔ مارنے کے لئے میری طرف لپکے میں بھاگا وہ غصہ میں چلائے "پکڑو اس کو، پکڑو اِس کو" میں نے جمع ہونے والے لڑکوں کو اشارے سے بتایا وہ اِس روزے کا حال جانتے تھے۔ بہت ہنسے اور اُسی وقت کیلاٹ صاحب کو سمجھایا تب وہ خاموش ہوئے۔ پھر ایک اور موقع سے سمجھایا کہ لڑکے ایسا کریں تو انتظام میں فرق آتا ہے۔ ممکن ہے تمھاری نقل میں اور لڑکے بھی ایسا کرنے لگیں۔ میں نے اس دن سے یہ روزہ نہیں رکھا

بزم کمال کی طرف سے "تحریری مقابلہ" کا اعلان ہوا مضمون اس بات پر لکھنا تھا کہ "اُردو زبان کس طرح ترقی کر سکتی ہے" مختلف رسالوں سے خاص طور پر انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالے کے مضامین پڑھ کر میں نے یہ انعامی مضمون لکھا۔ رسالہ جامعہ کے مدیر منصف تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف "اول انعام" کا اعلان کیا بلکہ اسے دسمبر ۱۹۲۵ء کے رسالہ جامعہ میں چھاپ بھی دیا۔ انعام میں میں نے کئی قیمتی کتابیں لیں جو تانوی چہارم میں کام آنے والی تھیں

جیسا کہ تم پڑھ آئے ہو مدرسہ کے تمام لڑکوں کی

طرف سے (خواہ وہ ثانوی کے ہوں یا کلیہ کے) رسالہ "جوہر" ہفتہ وار نکلا کرتا تھا۔ اس منتقلی کی وجہ سے اس کا کام ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اس کے مدیر محمود صاحب فرمانے لگے "مدھولی ایک بات مان جاؤ تو بہت اچھا ہے"

میں نے کہا۔ "فرمائیے"

"اگر لوگوں سے مضمون لکھوانے۔ تصویریں اور کارٹون بنوانے۔ کتابت کرانے اور وقت پر پرچہ شائع کرنے کی ذمہ داری لو تو ہم تم کو "مجلس جوہر" میں رکھ لیں گے اور رسالے کا منیجر یعنی مہتمم بنا لیں گے"

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگے "سوچنا بیکار ہے۔ یہ بھی تمھارے لئے کچھ مشکل کام ہے!"

میں نے کہا "محمود صاحب کام مشکل یوں ہے کہ یہ لکھنے والے نخرے باز ہوتے ہیں۔ مجھے اس سے غصہ آتا ہے۔ ارے بھائی کہو یا تو کریں گے یا نہیں کریں گے چلو قصہ ختم یہ کیا ہے صاحب آج لکھیں گے کل لکھیں گے!"

محمود صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لکھنے کا کام ایسا ہے کہ فرمائش کرو تو لوگ سوچتے ہیں کہ لکھ سکوں گا

یا نہیں۔ لکھنے کے لئے وقت اور مواد ملے گا بھی وغیرہ وغیرہ
تم اسے نخرہ سمجھ بیٹھے۔ ہٹاؤ یار تمھاری عقل بھی ایسی ہی
ہے" شاہ مرحوم رحمٰن کے نام سے تعلیمی مرکز کے چند کمرے
بنے ہیں) فیروز (ہم جماعت) بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی
دیر تک یہ دلچسپ گفتگو جاری رہی آخر میں نے اس کام
کے لئے ہاں کرلی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک دن کا ناغہ
کیسا پرچے کے شائع ہونے میں چند گھنٹوں کی بھی دیر نہ
ہوتی تھی۔ ہر پیر کو صبح کی حاضری کے وقت اشتہار موجود
صرف ایک دن ایسا اشتہار لگانا پڑا کہ" جوہر آج صبح کے
بجائے وقفے میں شائع ہوگا" بات یہ تھی کہ رسالہ پہلے سے
شیخ الجامعہ صاحب کو دکھانا ضروری تھا انھوں نے ایک
مضمون بدلنے کے لئے فرمایا۔ راتوں رات دوسرا مضمون
لکھا گیا اور وہ کہیں صبح جاکر صاف ہوا

اس سال اور کوئی خاص جلسہ نہ ہوا سوائے یہ کہ جامعہ کی
پانچویں سال گرہ کسی قدر اہتمام سے منائی گئی۔ مولانا محمد علی،
حکیم اجمل خاں، تاسیس کے زمانے میں دہلی میں موجود تھے۔
مشاعرے کا انتظام ہوا۔ ان دونوں شاعروں کے علاوہ برق

نادر، تاباں، شیدا، اکبر، سائل، مومن، عزمی، وحشی، نثار اسلم، عباسی، غرض یہ کہ دہلی کے تقریباً تمام مقامی شعرا نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ سرفراز حسین صاحب عزمی، مزاحیہ اشعار سنایا کرتے تھے اس مشاعرے میں حکیم صاحب کی طرف اشارہ کرکے فرمانے لگے

میں اُن کی بزم میں کس طرح جاؤں
مرے گھٹنوں میں گٹھیا کا اثر ہے

یہ سال تو تبدیلیوں کا تھا ہی۔ عبدالمجید خواجہ صاحب جامعہ کا کام چلتا کرکے عبدالعزیز صاحب (بیرسٹر) کو شیخ الجامعہ بنا گئے اُنھوں نے یہ کام مشکل پاکر اپنی ذمہ داری طاہر ایس محمدی صاحب کے سپرد کردی۔ جو ان دنوں انگریزی کے پروفیسر اور بہت باقاعدہ کام کرنے والے آدمی تھے اس بڑے کام پر یہ تھوڑے ہی عرصہ رہے لیکن اُنھوں نے شعبوں میں کام کرنے کی رفتار بڑھادی اور لوگوں کو وقت کا پابند بنایا دوسری طرف فاروقی صاحب کی جگہ عبدالوحید صاحب نگران مدرسہ ہوئے۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ جامعہ کے پرانے طالب علم ذاکر حسین خاں صاحب ۱۹۲۲ء میں جرمنی اسی غرض سے

گئے تھے کہ زیادہ پڑھ لکھ کر جامعہ کی بہتر خدمت کرسکیں
یہ تین سال کے بعد یعنی فروری ۱۹۲۶ء میں لکھنے پڑھنے کے
ڈاکٹر بن کر لوٹے اور اپنے ساتھ دو اور دوستوں یعنی
ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب
کو لائے۔ انھیں لینے کے لئے سب لوگ اسٹیشن پر گئے، جامعہ
میں "سپاسنامے" (شکرگزاری کا اظہار) دیے گئے۔ دعوتیں
ہوئیں۔ بھلا اس موقع پر رسالہ "جوہر" کیوں خاموش رہتا
اس کا خاص نمبر نکالا گیا۔ جس کے تمام مضامین جامعہ کے
اتار اور چڑھاؤ کے بارے میں تھے یعنی کس زمانے میں
کس قسم کا رنگ رہا۔ کیا کیا مشکلیں پیش آئیں وغیرہ۔ اس کا
مہتمم ہونے کی وجہ سے مجھے ان کے سامنے جانا پڑا۔ وہ دفتر
کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا میں
جوہر کا خاص نمبر لے کر پہنچا۔ اس کا پہلا مضمون (جسے
مقالہ افتتاحیہ کہتے ہیں) "اچھا جامعہ" "سخت" تھا۔ کیونکہ
اس میں بتایا گیا تھا کہ جامعہ کو چلانے والے لوگ بدلتے
رہتے ہیں۔ جامعہ کو پھلتا پھولتا دیکھنے والوں کی خواہش ہے
کہ اس کے کام کرنے والے جس قدر پرانے ہوتے جائیں اچھا ہے

تاکہ کوئی ایک رنگ جمے اس میں کچھ اور ایسی ہی باتیں لکھی تھیں
اسے انھوں نے غور سے پڑھا پھر ایک نظر سے تصویریں بھی
دیکھیں۔ فرمانے لگے "یہ پہلا مضمون کس نے لکھا ہے؟" میں نے
نام بتانے میں پس و پیش کیا کیونکہ طے یہی ہوا تھا کہ اس چیز کو
ظاہر نہ کیا جائے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر یوں
کہنا شروع کیا۔ "جوہر نکالنے والی ایک مجلس ہے۔ اس کا
جلسہ ہوا تھا سب نے تھوڑا تھوڑا لکھا پھر ان سب کو جوڑ
دیا گیا! (یعنی ایک سلسلے میں لکھ لیا ہے) یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہر ایک
شخص اپنی رائے بتائے کہ کیا لکھنا چاہیے لیکن مقالہ افتتاحیہ
(پہلا مضمون) لکھتا ایک ہی شخص ہے۔ میرے جواب پر ڈاکٹر صاحب
مُسکرائے میں کھسیانہ ہوا جی چاہتا تھا یہاں سے جلدی بھاگ جاؤں
وہ تو یوں خیریت ہوئی کہ اُنھوں نے اور باتوں میں لگا لیا۔
کچھ دنوں بعد ڈاکٹر صاحب تو شیخ الجامعہ ہوئے اور ان کے
دو ساتھی اُستاد بنے۔ اس وقت دونوں باتوں کی طرف توجہ دینے
کی ضرورت تھی ایک تو روپیے پیسوں کی کمی دوسرے انتظامی
اور تعلیمی کام کو آگے بڑھانا چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ اس لیے
ایک وفد تو خواجہ عبدالحیٔ صاحب کی نگرانی میں سی۔ پی اور برار

دورے پر گیا۔ دوسرے وفد کو خود ذاکر صاحب حیدر آباد لے گئے۔ ڈاکٹر عابد صاحب کچھ تجویزیں تیار کرنے میں لگ گئے ان حضرات اور ان کے ساتھیوں یعنی جامعہ کے استادوں نے جامعہ کے کاموں کو سال بسال کس طرح آگے بڑھایا اس کا ذکر تو آئندہ سالوں میں آئے گا آؤ پہلے ہم اس چھٹے سال کو ختم کریں۔ علی گڑھ میں چھٹیاں مئی اور جون میں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن دہلی میں جون جولائی میں ہونے لگیں تاکہ پورا تعلیمی سال دو برابر حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ ایک تو اگست سے دسمبر تک دوسرا بھی اتنے ہی عرصہ کے لئے یعنی جنوری سے مئی تک

اپریل میں سندی امتحانات ہوئے۔ میٹرک کے امتحان میں میں بھی شریک ہوا۔ نتیجہ نکلا تو انگریزی کے علاوہ باقی سب چیزوں میں کامیاب تھا۔ بعد میں انگریزی کے ضمنی امتحان میں شریک ہوا لیکن پھر بھی کامیاب نہ ہوا۔ عابد صاحب اور حافظ صاحب نے آپس میں شرط باندھی۔ عابد صاحب فرماتے تھے کہ دوسرے ضمنی امتحان میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ حافظ صاحب فرماتے تھے کہ یہ ناممکن ہے ڈاکٹر عابد صاحب نے سکھانے کی کوشش بھی کی بالآخر حافظ صاحب کا کہنا

ٹھیک نکلا۔ اور آج تک میں "میٹرک فیل" ہی ہوں۔ کئی سالوں کے بعد پھر عابد صاحب نے فرمایا کہ آپ نے جس کام کو شروع کیا ہے۔ اس میں انگریزی کی وجہ سے بہت مدد ملے گی کیونکہ ولایت کے مدرسوں کا حال پڑھانے کا طریقہ بچوں کے بارے میں نئی نئی معلومات سب انگریزی کتابوں میں ملتی ہیں لیکن اس مضمون میں میرا جی ہی نہ لگا۔ بات اصل یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے میرے لئے انگریزی کے جو جو فائدے بتلائے ہیں وہ لڑکوں کی باتوں، ان کے روزانہ کے کام چال ڈھال اور ان کے دلوں کے بھید معلوم کرنے سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ ان چیزوں کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ سب کو سمیٹنا مشکل ہوتا ہے۔ میرے لئے تو تمھاری جیسی چلتی پھرتی کتابیں بہت ہیں

جہاں تک زبانوں کے سمجھنے کا تعلق ہے ایک چھوڑ سات زبانیں (ہفت زبان) سمجھ لیتا ہوں یعنی اُردو۔ فارسی۔ عربی انگریزی۔ مرہٹی۔ تلنگی۔ پنجابی۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ میں ان زبانوں کے سمجھنے پر حاوی ہوں۔ سوائے مادری زبان اُردو کے باقی زبانوں میں کام چلانے کی باتیں سمجھ لیتا ہوں

تو میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ ابھی تمہیں کیا معلوم کہ میں مُدرّس (ماسٹر صاحب) ہو گیا ہوں۔ بات انگریزی کی ہو رہی تھی تو سُنو باوجود کم جاننے کے ضرورت پڑے تو میں انگریزی بولنے سے نہیں شرماتا ہوں اسی طرح جس طرح ایک انگریز غلط سلط اردو بولنے سے نہیں جھجکتا۔ خیر صاحب چھوڑئے اس انگریزی کے قصے کو۔ سال گزر گیا۔ چھٹیاں ہو گئیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں کسی کو وظیفہ تو ملتا ہی نہیں۔ اب مجھے فکر ہوئی کہ دو مہینے کے گُزارے کے لئے کوئی کام سوچنا چاہیے

اس کا حال لکھنے سے پہلے یہ بات اور بتا دوں کہ سردیوں کی چھٹیوں میں میرے لئے کام اور سیر و تفریح کا ایک موقع نکل آیا تھا۔ کانپور میں کانگرس کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا۔ مکتبہ کی طرف سے فروخت کے لئے کتابیں بھیجی جا رہی تھیں۔ طالب علموں کی طرف سے میرا انتخاب عمل میں آیا۔ آزادی کی تحریک اگرچہ کمزور پڑ گئی تھی لیکن .... نگر (عارضی بستی) کی چہل پہل اور جلسوں کی کارروائیاں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تحریک نے ہندوستانیوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اِس میں اُتار چڑھاؤ

آتے رہیں

کانپور سے واپسی پر ...... نگر کا مکمل نقشہ رسالہ جوہر کے لئے تیار کیا اور ایک ہفتہ کی کارروائی اور اُس پر تبصرہ اسی رسالہ میں شائع کر دیا

چند ماہ ہوئے (۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء کو) حافظ صاحب نے "مدرسہ شبینہ" (رات کا مدرسہ) کھول رکھا تھا - چند لڑکے اور ایک دو استاد کام کرتے تھے طے ہوا کہ اگر میں اس کام کو کروں تو چھٹیوں کے خرچ کا انتظام ہو جائے گا پہلا سوال تو دن بھر کام کرنے والے غریب بے پڑھے لکھے لوگوں میں شوق پیدا کرنا اور انھیں جمع کرنا تھا میں نے ہر ایک کے گھر جانا شروع کیا - اِن کے ہاں تھوڑی دیر تک بیٹھتا - باتیں کرتا اور انھیں یقین دلاتا کہ پڑھنا مشکل بات نہیں ہے - روزانہ ایک گھنٹہ پڑھنے سے سال بھر میں کہانیاں - اشتہارات پڑھ سکتے ہیں اور خط میں مطلب کی باتیں لکھ سکتے ہیں - جو لوگ پہلے سے تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا جانتے تھے وہ جلدی تیار ہو جاتے تھے اِن کی مدد سے نہ جاننے والوں کو تیار کر لیتا تھا - اس طرح تعداد بڑھنے لگی - صرف ایک مہینے کے عرصہ میں چھوٹے بڑے

تین سو آدمی آنے لگے۔ کہیں قصے کہانیاں سُنائی جارہی ہیں تو کہیں اخبار، کسی طرف کتابیں پڑھوائی جارہی ہیں تو کہیں تصویروں کے ذریعے مفید باتیں سمجھائی جارہی ہیں۔ اِن ہی بڑے لوگوں میں سے مدرسہ کی پنچائت بنالی تھی۔ چھٹی ہونے کے بعد ان کا جلسہ ہوتا تھا۔ پنچائت کے رُکن جہاں لوگوں کی تکلیفیں اور شکایتیں بیان کرتے تھے۔ وہیں ہماری باتوں کو ان میں پھیلاتے تھے۔ لوگوں کی غفلت پر دیہاتی طریقہ کے مطابق پنچائت کا فیصلہ سناتے تھے۔ شہری لوگوں میں ان کی اہمیت بڑھانے کے لئے مشترکہ جلسوں کا انتظام بھی تھا۔ مثلاً "جادو کی لالٹین" کے ذریعہ کسی بات کے سمجھاتے وقت جامعہ کے تمام طلبار ان کے درمیان بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے اپنے جلسے اس اہتمام سے ہوتے تھے کہ بستی کے معزز لوگ اور جامعہ کے استادوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ اِس قسم کے جلسوں کا ان پر اتنا اچھا اثر ہوا کہ انھوں نے اپنی اندرونی تنظیم کو اور مضبوط کرلیا

چاندنی راتوں میں تو لوگ یوں بھی تفریحاً چلے آتے تھے لیکن اندھیری راتوں میں بھی مدرسہ کی کشش باقی رکھنے

حلقہ تعلیم و ترقی کی طرف سے بالغوں کی پڑھائی کا انتظام
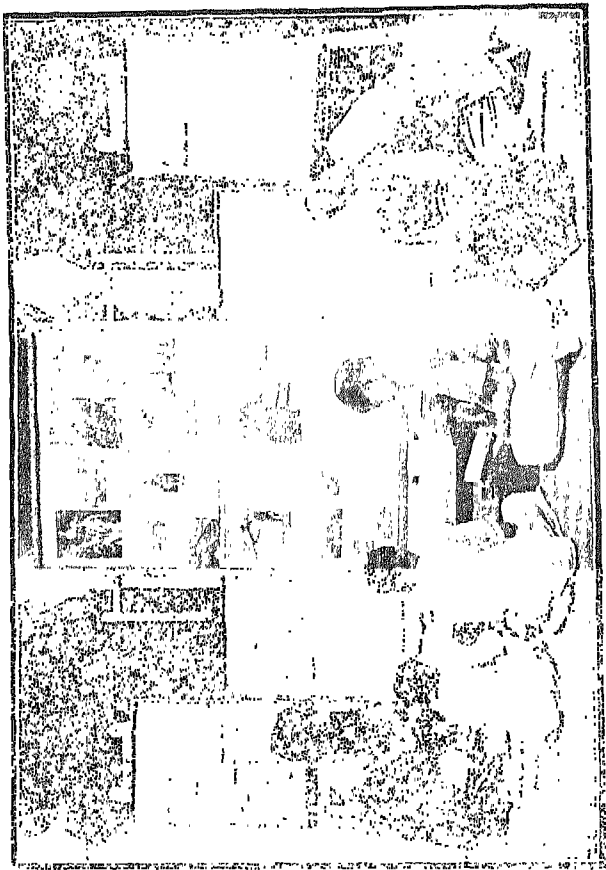
کے لئے میرے ایک دوست کے کہنے کے مطابق مجھے اپنے "کرتب" دکھاتے پڑے۔ چند کھیل بلکہ "کرتب" ایسے سوچ رکھے تھے جس کے لئے تاریکی (اندھیرا) ضروری تھی۔ مثلاً طلبا کے دو فریق کرکے دو "بیڑیاں" دے دی جاتی تھیں۔ پہلا فریق کسی دور جگہ جا کر بیڑی دکھاتا تھا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس سمت میں ہیں دوسرا فریق اپنی بیڑی کی مدد سے تلاش کرتا تھا۔ "بیڑی کی مدد سے چھپنے اور تلاش کرنے کا کھیل" بستی کی گلیوں میں بھی کھیلا جاتا تھا۔ تین سو طالب علموں کی لمبی قطار مدرسے سے روانہ ہوتی تھی۔ میں بیڑی لے کر کسی اونچی جگہ کھڑا ہو جاتا ۔ تاکید یہ تھی کہ روشنی ہو تو قطار چلے ورنہ کھڑی رہے۔ اسی طرح سیٹی یعنی "فُر فُر فُر" کے کھیل بھی کھلائے جاتے تھے۔ ہم لوگ اگرچہ جامعہ نگر دہلی سے آٹھ میل دور منتقل ہو چکے ہیں۔ لیکن بستی کے تانگے والے ٹھیلے والے، کارخانوں عمارتوں کے مزدور اب بھی مجھے دیکھ کر "گبھار صاحب" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور بڑی محبت سے پیش آتے ہیں اُس وقت سے یہ بات مجھے سچ معلوم ہونے لگی ہے کہ "نیکی سدا بہار پھل ہے" میں نے ایک دفعہ جو محنت کی تھی اُس کی

آخر تک قدر ہوتی ہے۔ یہ کتنا بڑا انعام ہے
یہ بات تو تم لوگ بھی جانتے ہو کہ ہم جن سے کام لینا
چاہیں یا جن کے ساتھ کھیلنا چاہیں جب تک اِن جیسے نہ بنیں
وہ اپنی صحبت میں گھسنے نہیں دیتے۔ اِسی لئے میں نے
بے پڑھے اور غریب لوگوں سے زیادہ میل جول
بڑھایا۔ اِدھر تو یہ ہو رہا تھا اُدھر کیا دیکھتے ہیں کہ میرے
بھائی صاحب حیدرآباد سے دہلی اچانک آ گئے۔ میں نے
دل میں کہا "الٰہی خیر پھر معاملہ خراب ہوتا نظر آتا ہے" دوسرے
دن بھائی صاحب مجھ سے کہنے لگے "ابھی کیا ہوا صرف تین
سال گزرے ہیں۔ گئی ہوئی نوکری ہاتھ آ سکتی ہے۔ میرے ساتھ
چلے چلو"

میں نے کہا۔ "آپ درست فرماتے ہیں۔ لیکن جو تجربہ
مجھے یہاں ہو رہا ہے اور یہاں کے کاموں میں جو لطف آتا
ہے مجھے یقین ہے کہ وہاں یہ بات نصیب نہ ہوگی۔ طالب علمی
کا ایک حصہ میں نے وہاں بھی گزارا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ
سرکاری مدرسوں میں اُستاد اور لڑکے دونوں میں سے
کوئی بھی خوش نہیں رہتا۔ مدرسہ کو مصیبت کا گھر

سمجھتے ہیں!"

یہ بات اُس زمانے کی ہے جبکہ ہمارے ملک میں پڑھائی کے نئے نئے ڈھنگ ابھی شروع نہیں ہوئے تھے۔ بھائی صاحب نے کسی مدرسہ میں کام تو کیا نہیں تھا یہ بات اِن کی سمجھ میں کیسے آتی! کہنے لگے "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے۔ لوگ تو روپیہ پیسہ کمانے کے لئے ہندوستان سے (یعنی شمالی ہند سے) دکن کا سفر کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے کبھی نہیں سُنا کہ وہاں کا کوئی آدمی کمانے کی غرض سے ادھر آیا ہو" بھائی صاحب کے سامنے روپئے پیسوں کا سوال تھا میرے سامنے دلچسپی اور غیر دلچسپی کا۔ اس لئے بحث بے کار تھی مختصراً یہ کہ میں نہ مانا اس پر وہ فرمانے لگے۔ "کم سے کم دو باتیں مان جاؤ۔ ایک تو یہ کہ گھر کی مالی حالت اچھی نہیں ہے اس لئے یہیں نوکری کرلو دوسرے یہ کہ والدہ بہت پریشان ہیں ان سے صرف ملنے کے لئے میرے ساتھ گھر چلے چلو" دوسری چیز کے متعلق مجھے اندیشہ تھا کہ اس وقت گھر گیا تو وہاں کی نوکری کے لئے رشتہ دار میرے پیچھے پڑجائیں گے۔ میں نے بھائی صاحب سے کہا "پہلے میں یہاں کی نوکری پکّی کرلوں تب گھر آؤں گا

والدہ صاحبہ کو یقین دلا دیجیے" اس پر وہ گھر لوٹ گئے۔ میں اسی سوچ بچار میں پڑ گیا کہ تعلیم جاری رکھوں یا نوکری کروں

ان دنوں ذاکر صاحب چندہ جمع کرنے کے لئے حیدرآباد گئے ہوئے تھے۔ عابد صاحب جو یہاں کے انتظامات ٹھیک کر رہے تھے میرے اس کام سے واقف تھے جو مدرسہ شبینہ میں کر رہا تھا۔ جب انھیں اس گفتگو کا علم ہوا جو میرے اور بھائی صاحب کے درمیان ہوئی تھی تو ایک دن کہنے لگے "مجھے آپ کی حالت کا علم ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں۔ وظیفہ مل جائے گا اگر نوکری کا خیال ہو تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں نئے انتظامات کے سلسلے میں ہمیں اُستادوں کی ضرورت ہے آپ کو رکھ لیا جائے گا سوچ کر بتا دیجیے"

چونکہ بھائی صاحب بہت سمجھا گئے تھے بالآخر نوکری کی درخواست دے دی۔ اس طرح میرا تقرر تیس (۳۰) روپئے ماہوار پر ۱۵ر اگست ۱۹۲۶ء سے منظور ہو گیا

یہاں تک تو تھی طالب علمی کے زمانے کی کہانی، اب اگلا دور مدرسی کا شروع ہوتا ہے۔ لڑکو تم نے اندازہ

لگایا ہوگا کہ طالب علمی کے زمانے میں تکلیفیں تو بے شک اٹھائی ہیں مگر لطف بھی کتنا آیا ہے۔ اور بھائی محنت کے بعد کسی چیز کے حاصل ہونے کی جو خوشی ہوتی ہے وہ اُس نعمت سے بہتر ہے جو یوں ہی ہاتھ آجائے کیونکہ یہ خوشی دیر تک نہیں رہتی ہے۔ آدمی کام تلاش کرنے میں دوسروں کا محتاج نہ رہے خود ہی ایک کام ڈھونڈھ نکالے اور لوگوں سے کہے کہ میں اسے کرنا چاہتا ہوں۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ کام بہت ہیں کرنے والے لوگ کم ہیں۔ ایسی حالت میں یہ سوال کہ "پڑھ کر کیا کریں" کچھ اہمیت نہیں رکھتا ہے

جس دن میرا تقرر ہوا ہے اُسی دن جامعہ کے دو اور طالب علموں کو یہ عزت نصیب ہوئی۔ ایک تو شفیق صاحب بڑے کتب خانہ کے مہتمم بنائے گئے (یہ بھی اسی جگہ پہلے سے کام کر رہے تھے)، دوسرے سعید صاحب کچھ تو پڑھانے کے لئے اور کچھ لکھنے کے کام پر رکھے گئے۔ مجھے بھی دو کام دیئے گئے ایک تو آدھے وقت کے لئے پڑھانا دوسرے رسالہ جامعہ اور پیام تعلیم کی مینجری۔ سوچو تو سہی جس مدرسے

میں پڑھا ہو اُسی مدرسہ میں کام کرنے سے کتنی خوشی ہوتی ہے
طالب علمی کے زمانہ کی یاد تازہ رہتی ہے۔ موقع ملنے پر
لڑکوں سے کہتا ہوں ایسے کام تو ہم نے اِس مدرسہ
میں نہ جانے کتنے کئے ہیں۔ بڑا لطف آیا ہے۔ آنکھوں دیکھی
مثال بیان کرنے سے بس یوں سمجھو کام میں جان پڑ جاتی ہے
پھر جامعہ کا مدرسہ ایک خاص رنگ کا مدرسہ ہے۔ یہ جس قدر
پُرانا ہوتا جاتا ہے اس کے پچھلے واقعات اگلے کاموں میں جان
ڈالتے جاتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے لڑکے جو کچھ کر جاتے
ہیں اِس سے اگلوں کو مدد ملتی ہے۔ اگلے صفحات میں تمھیں
یہی رنگ نظر آئے گا

ساتواں سال

اگست ۱۹۲۶ء سے جولائی ۱۹۲۷ء

یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ میرے سپرد دو کام ہوئے تھے
ایک تو آدھے وقت کے لئے پڑھانا دوسرے رسالہ جامعہ
اور پیام تعلیم کی منیجری۔ رسالہ جامعہ کی بابت تو تم جان گئے
ہو کہ یہ جامعہ کے بڑے لڑکوں کے علمی مضامین چھاپنے
کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ پیام تعلیم کا اجرا یوں ہوا کہ جامعہ
میں جو کچھ کام ہوتے ہیں ان کی تفصیل اور جامعہ کا مقصد لوگوں تک
پہنچانے کی ضرورت تھی تاکہ سب لوگ واقف ہو جائیں۔ امداد
ملے اور لڑکوں کی تعداد بڑھے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۲۶ء میں
ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی نگرانی میں "پندرہ روزہ

پیامِ تعلیم" جاری ہوا۔ اس میں پڑھنے پڑھانے کی تفصیل۔
چندوں کی فہرست۔ جامعہ کے حالات شائع ہونے لگے۔
اس کا خرچ چلانے کے لئے خریدار بنانے کی ضرورت تھی۔
پُرانے طلبا۔ چندے دینے والے۔ مکتبہ سے کتابیں خریدنے
والے اور دوسرے مشہور لوگوں کی فہرستیں حاصل کرکے نمونے
کے پرچے اور خطوط لوگوں کے پاس بھیجے گئے کہ وہ خریدار بنیں
اسی زمانے میں چندہ جمع کرنے والے ہندوستان کے مختلف
صوبوں میں پھیلے ہوئے تھے ان کے ذریعے سے بھی خریداروں
میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس وقت تک ان دونوں رسالوں کا
انتظام مکتبہ سے علیحدہ تھا۔ کام کا پھیلاؤ نہ تھا۔ اس لئے خطوط
کے جوابات دینا۔ وی۔ پی کرنا۔ پتے لکھنا سب کچھ "منیجر" ہی کے
ذمے تھا۔ البتہ ہاتھ بٹانے کے لئے ایک چپراسی ساتھ رہتا تھا
نئے انتظامات کے تحت جو شخص جس چیز کا اہل سمجھا گیا
اُس کام کے لئے ذمہ دار بنا دیا گیا۔ ڈاکٹر عابد صاحب جو
کتابیں لکھنے اور ترجمہ کرنے میں کامل سمجھے جاتے ہیں۔ "شعبہ
تصنیف و تالیف" کے ناظم بنائے گئے۔ انھوں نے ایک ایسی
تجویز نکالی جس پر عمل کرکے [illegible] لوگوں کا ہر سال نئی نئی کتابیں

پڑھنے - رسالہ جامعہ اور پیامِ تعلیم کا مطالعہ کرنے کا شوق باقاعدہ جاری رہے - اعلان ہوا کہ جو شخص سال بھر میں چوبیس روپے دے اُسے ہر تیسرے مہینے اُس کے پسند کی نئی نئی کتابیں دی جائیں گی - پھر رسالہ جامعہ مفت ملا کرے گا - پیامِ تعلیم کے لئے رعایت رہے گی - جس شعبہ کے تحت یہ سب کچھ ہونے لگا اُس کا نام "شعبہ تصنیف و تالیف" کی بجائے "اُردو اکاڈمی" رکھا گیا - اس طرح دونوں رسالوں کا انتظام اس شعبہ کے ذمہ ہوگیا اور میرا پورا وقت مدرسی کے کام کے لئے رکھا گیا

سلا میرے لئے جامعہ میں مدرسی کا یہ پہلا سال تھا ابتدائی سوم اور پنجم کا حساب سکھایا کرتا تھا - آجکل کے محاسب جامعہ بشیر احمد صاحب - نائب مہتمم کتب خانہ نبی احمد صاحب - مکتبہ کے محاسب محمد طیب صاحب اور جلد سازی کے اُستاد حسن مہدی صاحب پنجم میں مجھ سے حساب سیکھا کرتے تھے (اس طرح یہ جامعہ میں میرے پہلے شاگرد ہیں) ایک دن کا ذکر ہے کہ جماعت میں مجھے کسر کے سلسلہ میں $\frac{1}{2}$، $\frac{1}{3}$، $\frac{1}{4}$، وغیرہ سمجھانا تھا - اُس دن دو تین سنترے ساتھ لایا - اور یوں مخاطب ہوا "میرے پاس یہ پورا سنترہ ہے - اب ایک

طالب علم یہ دیکھے کہ اس میں کتنی پھانکیں ہیں" نبی احمد نے پھانکیں گنیں، دس نکلیں۔ میں نے کہا "فرض کرو ایک پھانک نبی احمد کو دے دیتے ہیں" یہ بولے۔ "صاحب فرض کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دے ہی جو دیجئے" میں نے انھیں ایک پھانک دے دی۔ اور وہ کھا بھی گئے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ فرض کرنے کی بجائے اگر سچ مچ پھانکیں تقسیم کرتا گیا تو پورا سبق سمجھانے سے پہلے ہی سنترہ ختم ہو جائے گا۔ اور پھر تختۂ سیاہ اور چاک ہی ہاتھ میں رہ جائے گا۔ میں نے بڑی مشکل سے اِن لڑکوں کو راضی کیا کہ سبق ختم ہونے کے بعد یہ سب پھانکیں برابر تقسیم کر دی جائیں گی۔ طیب اُس وقت تک جماعت میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ ایک دن گھنٹہ شروع ہونے سے پہلے میں جماعت میں چلا گیا تھا۔ کچھ لڑکے موجود تھے۔ گھنٹہ شروع ہونے کے انتظار میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں طیب نئے نئے داخل ہوئے۔ میری عمر اُس وقت ۲۱ سال کی تھی یہ مجھے پہچان نہ سکے کہ میں یہاں کا مُدرس ہوں۔ کہنے لگے "اب کون صاحب پڑھانے کے لئے آئیں گے" نبی احمد بولے "ایک ہیں ـــــ لوگ انھیں مُدھولی صاحب کہتے ہیں۔ بس گھنٹہ

بجتے ہی داخل ہو ں گے۔ " پڑھاتے کیسا ہیں" طیب بولے "پڑھائی کا کیا پوچھو ــــ سنترے کھلا کھلا کر پڑھاتے ہیں " اتنے میں گھنٹہ بجا اور میں تختہ سیاہ کے پاس جھٹ سے کھڑے ہو کر بولا " جناب آئندہ سے کھانے پینے کی چیز ہرگز جماعت میں نہ لاؤں گا۔ آپ لوگوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ اور سبق کی طرف دھیان نہیں رہتا ہے" طیب بہت سٹ پٹائے کہ معاملہ کیا ہے!

جہاں تک مجھے یاد ہے ذاکر صاحب بھی سنترے والے سبق میں موجود تھے۔ معلوم نہیں اُنھوں نے اپنے دوست عابد صاحب سے اِس کا ذکر کیا یا نہیں کیونکہ عابد صاحب جہاں کہیں ایسی بات سُن لیتے ہیں لطیفہ کہنے کے لئے یاد رکھ لیتے ہیں

بقول اکبر صاحب میں نے اِس سال کوئی اور "گڑبڑی" نہیں کی۔ یعنی کوئی نیا کھیل شروع نہیں کیا۔ بات اصل یہ ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں آپس میں دوستیاں جلدی ہو جاتی ہیں اور کوئی لڑکا کچھ کرنا چاہے تو جلدی سے کر گزرتا ہے۔ لیکن مُدرِس ہونے کے بعد اپنے ساتھی استادوں سے دوستی پیدا

کرنے میں دیر لگتی ہے۔ یہ اپنے دل کی بات ہر ایک سے یوں ہی نہیں کہہ دیتے ہیں۔ کام بڑھانے کے لئے ان لوگوں سے ملنا جلنا اِن کے کام کرنے کے طریقے معلوم کرنا ضروری تھا یہ سال اِن باتوں کی کھوج میں گزر گیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنے اُن ساتھیوں کو بھول گیا جن کے ساتھ طالب علم کی حیثیت سے ایک عرصہ گُزارا تھا۔ اب تک میں بدستور بھائی واحد (ایک طالب علم جو جامعہ میں اُستاد ہو گئے ہیں) کے کمرے میں رہتا تھا جمعرات کی دلچسپیوں میں کلیہ کے لڑکوں کے ساتھ برابر حصہ لیتا تھا۔ عام جلسہ ختم ہونے کے بعد عبدالواجد صاحب سنی (بی) کے کمرے میں ہمارے ساتھی جمع ہو جاتے تھے۔ چائے بنانے اور پینے کا ایسا لُطف پھر کبھی زمانے میں نصیب نہ ہوا۔ آؤ اب ایک نظر اِن لڑکوں کے کام اور جامعہ کے دوسرے انتظامات پر ڈالیں۔

اِس خیال سے کہ لڑکے اُستادوں کے نمونے پر کام کریں "ہاؤس سسٹم" کا طریقہ جاری کیا گیا۔ یعنی ایک اُستاد کے ذمے دس سے پندرہ کی تعداد میں لڑکے دیئے گئے یہ اُستاد اِن کے کپڑے۔ جوتے۔ دانتوں کی صفائی دیکھتا اِن کے

گھر کے کام میں مدد دیتا۔ جلسے میں بولنے والے لڑکے کی تحریر، تقریر درست کرتا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کام میں تبدیلی یوں کی گئی کہ ایک ہی عمارت کی بجائے چند کوٹھیاں کرائے پر لی گئیں ہر ایک میں تیس تیس لڑکے اور دو اتالیق رکھے گئے۔ پھر سب باتوں کی ذمہ داری ان ہی کے سر رہی البتہ شہر سے آنے والے لڑکوں کے لئے پہلا طریقہ جاری رہا

پروفیسر محمد مجیب صاحب کی نگرانی میں بھی چند لڑکے تھے۔ مجیب صاحب مدراس کے ایک استاد راجندرن جی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ دونوں کی طبیعتیں ایک سی تھیں بہت کچھ پڑھے لکھے مگر سادہ مزاج۔ محنتی اور ملنسار۔ ماں کی طرح لڑکوں کی خدمت کرتے تھے۔ ایک طرف محمد مجیب صاحب وائلن (ایک باجہ) بجا کر لڑکوں کو خوش کرتے تھے تو دوسری طرف راجندر جی لڑکوں کا جی بہلانے میں ان کی بحث میں حصہ لیتے تھے۔ ہندو مسلمانوں کے میل جول کے بارے میں اچھی اچھی باتیں بتاتے ایک دن وہ نماز میں شریک ہوئے لڑکوں نے کہا "آپ ہندو ہو کر ایسا کرتے ہیں!" انھوں نے جواب دیا "جو شخص ایک خدا کی عبادت کرے۔ بتوں کو نہ مانے وہ کسی مذہب

کا ہو اُس کے ساتھ خدا کی عبادت میں شریک ہونا اچھا ہی ہے،
تم لوگوں نے نماز میں یہی تو کہا کہ خدا بڑا ہے۔ پاک ہے۔
پالنے والا ہے۔ اِس سے کس کو انکار ہے!"

اِن لوگوں نے جامعہ والوں کے سامنے رہنے سہنے کا
ایک طریقہ پیش کرنا چاہا۔ اپنا سارا کام خود ہی کرتے تھے۔
یہاں تک کہ کھانا بھی پکا لیتے تھے۔ جب رامچندر جی چلے گئے
تو مجیب صاحب اکیلے رہ گئے۔ پھر یہ بھی ویسے ہی رہنے لگے
جیسے سب رہا کرتے تھے

اقامت گاہوں کے علٰحدہ ہوتے ہی بزم کمال کی مرکزی
حیثیت نہ رہی۔ بلکہ ہر ایک اقامت گاہ میں بزم ادب کے
نام سے علٰحدہ علٰحدہ جلسے ہونے لگے۔ کھانا ایک ہی جگہ پکتا تھا
مگر تقسیم ہو جاتا تھا۔ اگلے سال سے یہ بھی سب جگہ الگ سے
پکنے لگا

جامعہ کی چھٹی سالگرہ منائی گئی۔ حکیم اجمل خاں صاحب
(امیر جامعہ) نے پہلی بار عام مجمع میں جامعہ کی خالص تعلیمی
پالیسی کا اعلان فرمایا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (شیخ الجامعہ)
نے سال بھر کی رپورٹ سُنائی ڈاکٹر انصاری (معتمد جامعہ)

نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ جامعہ قومی تعلیم گاہ ہے اور تمام فرقہ وارانہ تحریکوں سے الگ ہے۔ حضرت صفی لکھنوی نے اپنی ایک تازہ نظم سنائی اس کے چند شعر یہاں درج کئے دیتا ہوں

یوم تاسیس جامعہ ہے آج — نطق مہمان جامعہ ہے آج
جامعہ درسگاہ اسلامی — دل کشا شاہراہ اسلامی
قابل قدر ادارہ ملّی — زیب آغوش خطۂ دلی
اپنی تعلیم پھر نصاب اپنا — کیوں نہ مکتب ہو کامیاب اپنا
جامعہ کی بنائیں(۱) پڑے جلدی — آئیں پھر ہم قرول(۲) باغ صفی
حشر تک میکدے کا نام چلے — جام گردش میں آئے کام چلے

یوں ہی جب تک کہ بادہ نوش جئیں
ہاتھ سے شیخ جامعہ کے پئیں

ایک اور اہم چیز کھیل اور ورزش کا سالانہ جلسہ ہے۔ مارچ کے مہینہ میں اسمبلی کا جلسہ ہو رہا تھا سردار پٹیل

---

(۱) عمارتوں سے مراد ہے

(۲) جامعہ اس زمانہ میں دہلی کے ایک حصۂ قرول باغ میں تھی

صدر تھے۔ ان سب لوگوں کو دعوت دی گئی کہ وہ جامعہ
کے بچوں کے کھیل دیکھیں اور سردار پٹیل سے انعامات
تقسیم کرنے کی درخواست کی گئی وہ خوشی سے راضی
ہو گئے۔ کپلاٹ صاحب نے طرح طرح کے کھیلوں کی مشق
کروا رکھی تھی۔ پروگرام چھپوا دیا گیا تھا کہ پہلے فلاں کھیل ہوگا
پھر فلاں کھیل۔ شہر سے سینکڑوں مہمان آئے ہوئے تھے
کھیل ہونے لگے۔ عبدالباقی صاحب خدا جھوٹ نہ بلوائے
تو چار من وزن تھا۔ یوں سمجھو تمھارے جیسے چار لڑکوں کے
برابر" پورا ڈھکیل" کھیل میں چٹان کی طرح کھڑے ہوئے تھے
وہ کسی کو کیا گراتے جو کوئی بھی انھیں دھکا لگاتا خود ہی گر جاتا
آخر میں نبی احمد صاحب رہ گئے جو وزن میں ان سے آدھے
تھے انھیں گرانے کے لئے باقی صاحب کو تھوڑی سی
محنت کرنی پڑی۔ استادوں کی دوڑ بھی بہت دلچسپ
تھی۔ جو صاحب پہلے آئے انھوں نے اپنا انعام ذاکر صاحب
کو دے دیا

قومی ہفتہ یوں تو ہر سال منایا جاتا تھا۔ لیکن پروفیسر
رامچندر جی کی تجویز کے مطابق اس سال سے ایک خاص

رنگ میں منایا جانے لگا۔ جنگ عظیم ۱۹۱۸ء کے بعد جب
انگریزوں نے آزادی دینے کا وعدہ پورا نہ کیا تو اس بات
کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے اپریل ۱۹۱۹ء میں پنجاب
کے باشندوں کا بہت بڑا جلسہ جلیانوالہ باغ (امرتسر)
میں ہوا۔ بس اسی بات پر وہاں کے گورنر نے نہتے لوگوں
پر گولی چلادی۔ سینکڑوں آدمی شہید ہوگئے۔ سارے
ہندوستان میں تہلکہ مچ گیا جگہ جگہ جلسے کرکے غصے کا اظہار
کیا گیا۔ اور اسی وقت سے آزادی کی تحریک زور پکڑ گئی
اس دن کی یادگار ہر سال ۶؍اپریل سے ۱۳؍اپریل تک
منائی جاتی ہے۔ اور اسے "قومی ہفتہ" کہتے ہیں۔ کام کرنے
والے لوگوں نے سوچا کہ محض جلسے کرکے یادگار منانے
سے اس کا اثر جاتا رہتا ہے۔ کوئی کام ہونا چاہئے۔ چنانچہ
جامعہ میں ۱۳؍اپریل کو سب لڑکے اور استاد اپنا کام آپ
کرتے ہیں۔ خدمتگاروں کو چھٹی دے دی جاتی ہے۔ لڑکوں
کی ٹولیاں بنائی جاتی ہیں۔ ہر ایک ٹولی کے ذمے رات کی
چوکیداری صبح کی صفائی کمروں اور صحن کو بڑے پیمانے پر
صاف کرنا۔ پانی بھرنا۔ کھانا پکانا۔ بازار سے سودا سلف لانا

یہ سب کام ہوتے ہیں - ایک ٹولی قریب کے گاؤں میں جاکر وہاں کی گلیوں کی صفائی کرتی ہے - کھانے کے وقت سب نوکروں کو اپنے ساتھ بٹھا کر لڑکے کھانا کھلاتے ہیں - مقصد یہ ہے کہ خدمتگاروں کو ہم اپنے سے کمتر نہ سمجھیں - لڑکے تو اِس بات کا ذرا بھی بُرا نہیں مانتے ہیں کیونکہ یہی نوکر چاکر رات دن انہیں آرام پہنچاتے ہیں - اِن سب باتوں سے یہ سِکھلایا جاتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر ہم ہر طرح کا کام اپنے ہاتھ سے کر سکیں اور مِل جُل کر ہر چھوٹے اور بڑے کام کو انجام دے لیں - خیال تو کرو باوجود محنت کا کام کرنے کے یہ دن کیسی خوشی سے گزرتا ہے - کوئی بھشتی بنا ہوا آواز دے رہا ہے - "پانی لایا ہوں صاحب" کوئی جھاڑو دیتے ہوئے درخواست کر رہا ہے - "حضور چھینٹے آ رہے ہیں - ذرا پرے ہٹ جائیے" اِس کے بڑے ساتھی کی ڈانٹ بھی سُنائی دیتی ہے - "ارے باورچی پر چھینٹے ڈال ہی دیئے - تجھے کام کرنا کب آوے گا!" نقلی باورچیوں کے پاس سے کوئی گزرتا ہے تو وہ دکھانے کے لئے اور بھی بیلنے لگتے ہیں - غرض یہ سارے کام اِس انہماک سے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی اجنبی صبح سے

چکر لگا کر دیکھنا شروع کرے تو گھنٹوں اس کا جی نہ بھرے۔
پھر اس وقت تو بڑا ہی لطف آتا ہے جب بہت چھوٹے بچے
نقل کی بھی نقل کرنے لگتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ختم ہونے تک یہ
دلچسپ کام اسی طرح جاری رہتا ہے۔ پھر شام کے وقت جلسہ
ہوتا ہے جس میں آزادی کی تحریک کے پچھلے اور حال کے
واقعات۔ قومی نظمیں سنائی جاتی ہیں۔ ہر ٹولی کا نامہ نگار
دن بھر کے کام کی روئداد سناتا ہے

آجکل تو جماعتوں میں دو ہفتے پہلے سے تیاریاں ہوتی
ہیں ان ہی تیاریوں میں لکھنے پڑھنے کا کام پورا ہو جاتا ہے
مثلاً گزرے ہوئے مشہور لوگوں کے حالات سنائے اور
لکھائے جاتے ہیں۔ سوانح عمریوں کی چھوٹی چھوٹی کتابوں
اور مضامین کا مطالعہ کروایا جاتا ہے۔ یہ اردو اور تاریخ کا
کام ہوا۔ نقشے بنوا کر تاریخی مقامات اور ان کا مختصر حال بتلایا
جاتا ہے۔ یہ جغرافیہ ہوا۔ حساب کے ماسٹر اعداد و شمار جمع
کرواتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ملک کی آمدنی و خرچ۔ ہر ایک
صوبے کی آبادی اور رقبے کا مقابلہ خاص طور پر کسی دیہات
کے مختلف اعداد و شمار لے کر یہ سمجھایا جاتا ہے کہ ہمارے ملک

میں کون کون سی باتیں اصلاح چاہتی ہیں۔ مثلاً پڑھے لکھے
لوگوں کی تعداد کم ہونے سے یہ نتیجہ نکلا کہ پڑھائی کی ضرورت
ہے۔ اگر بیکاروں کی تعداد زیادہ ہے تو ان کے لئے کام
مہیا کرنے کی ضرورت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جامعہ میں شفیق صاحب
کی توجہ سے یہ کام ڈھیلا نہیں ہونے پاتا ہے۔ وہ مذاق مذاق
میں بے دل لوگوں کو آمادہ کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی استاد
کام کرنے سے جی چرائے تو اس کے کمرے میں خود ہی پہنچ کر کرنے
لگتے ہیں۔ اب بتاؤ کوئی چپ کیسے رہے! پہلے تو ہنسی آتی
ہے پھر کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور کیوں نہ چاہے آخر
شفیق صاحب کسی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ اور وہ وجہ
تم جان گئے ہو

اس سال معزز مہمانوں کی آمد کا بہت زور رہا۔ سب
سے پہلے مسز سروجنی نائیڈو اور مولانا ابوالکلام آزاد
تشریف لائے۔ چا ہو رہی تھی۔ ایک لڑکے کے جی میں آئی
کہ پوچھے۔ سروجنی نائیڈو کے قریب جا کر کہنے لگا "آجکل
بلوے بہت ہوتے ہیں۔ آپ لوگ ہندو مسلمانوں میں
میل جول نہیں بڑھاتے ہیں۔ بڑے ہو کر ہم اس کام کو

کریں گے"۔ سب نے تالی بجائی۔ سروجنی نائیڈو نے لڑکے کو گلے سے لگا کر کہا "اس ہمت کی تعریف کرتی ہوں مگر تمھارے بڑے ہونے تک ہم لوگوں سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کریں گے"

اس زمانے میں آزادی کی تحریک کا پہلا سا زور نہ تھا قومی مدرسوں کے کام بھی ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ مگر ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے جامعہ میں پھر سے جان پڑ رہی تھی چنانچہ کانگرس کے صدر سری نواس آئنگر انجمن اتحاد کی دعوت پر جب جامعہ میں تشریف لائے اور یہاں کے بچوں میں ایک خاص رنگ دیکھا تو جلسہ میں کہنے لگے "دوسرے قومی مدرسے بے جان ہو گئے ہیں۔ مگر یہاں زندگی ہے۔ خدا کرے کہ اس مدرسے کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں"

اسی سال علیہ حضرت سلطان جہاں بیگم صاحبہ بنفس نفیس تشریف لائیں۔ لڑکوں کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے رات دن ایک کر کے پنڈال سجایا۔ اپنی اقامت گاہوں میں سجاوٹ کی بیگم صاحبہ لڑکوں کے رہنے سہنے کے طریقوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ تقریر کرتے وقت جامعہ والوں کو اس طرح

سمجھایا جیسے کوئی اپنے خاندان والوں کو سمجھایا کرتا ہے۔ وہ لڑکوں کو "میرے بچے" کہہ کر مخاطب فرماتی تھیں۔ اپنی اِس آرزو کا اظہار فرمایا کہ جامعہ بچیوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ کرے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ عمر بھر لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کوشش فرماتی رہیں

اس سال کی ایک رنج کی خبر بھی ہے۔ جامعہ کے طالبعلم شاہ افتخار حسین اللہ کے پیارے ہوئے۔ آپ علی گڑھ کے زمانے سے جامعہ میں تھے اور جامعہ کے بہت ہمدرد طالبعلم تھے۔ جامعہ کی نیک نامی سے خوش ہوتے اور اِس کی خرابیوں سے انھیں تکلیف ہوتی تھی۔ ابتدائی زمانے سے میرا اِن کا ساتھ تھا تعلیمی مرکز کے چند کمرے آپ ہی کے نام پر تیار ہوئے ہیں

شاہ مرحوم کی تیمارداری انور خاں صاحب (مدراسی) نے جس محبت اور محنت سے کی تھی وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ انور صاحب کو تیمارداری میں ملکہ ہے دوسروں کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھتے ہیں۔ میرے دِل میں مذہب کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے تھے بعض دفعہ ذہنی کشمکش میں مُبتلا

ہو جاتا تھا۔ انور صاحب گھنٹوں میرا دِل بہلائے رکھتے اور
مجھے ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کی پاک نفسی
اور پاک زندگی کو دیکھ کر میرے وسوسوں میں کمی ہو جاتی تھی
گو انور صاحب سے سالہا سال تک ملاقات نہیں ہوتی ہے
مگر یہ رُوحانی رشتہ ایک دوسرے کو بھُولنے نہ دے گا

آٹھواں سال

اگست ۱۹۲۷ء سے جولائی ۱۹۲۸ء

ساتھی اُستادوں سے ایک سال تک میل ملاپ بڑھانے
کے بعد اب کسی نئے کام کے شروع کرنے کا وقت تھا۔ مدرسے
میں کرنے کے لیے بہت سے کام تھے۔ قدرتی طور پر سب سے
پہلے میرا خیال اُس چیز کی طرف گیا جس سے طبیعت کو لگاؤ تھا
تم سمجھ گئے ہوگے یعنی ڈراما۔ جامعہ میں اب تک اِس کا رواج
نہ تھا اِس کام کو اُس بھونڈے پن سے کرنے کا موقع نہ تھا
جیسا کہ مدرسوں میں ہوتا تھا۔ اور بڑے پیمانے پر شروع کرنا
بھی نامناسب تھا کیونکہ اِس میں خرابی کا اندیشہ رہتا ہے
رسالہ "پیام" میں ایک مکالمہ "بارش اور بادل" کے نام سے

نظر سے گزرا تیسری جماعت کے لڑکوں کو مولوی اسمٰعیل کی کتاب میں "بادل" کا سبق پڑھایا ہی تھا۔ اِسے جماعت میں اِس طرح سُنایا جیسے سچ مچ یہ کام ہو رہا ہے۔ پھر لڑکوں سے کہا کہ تم اِسے یاد کر لو۔ اور اسی طرح بحث کرو جیسے اس میں لکھا ہے۔ اگر تمہاری یہ بات چیت پسند آئی تو سارے مدرسے والوں کو یہ کام دیکھنے کے لیے دعوت دی جائے گی۔ لڑکے خوش ہوئے کام مشکل نہیں تھا۔ دو تین دن میں یاد کر لیا۔ شیخ الجامعہ صاحب کے اعلان کے مطابق سب لوگ مدرسے کے آخری گھنٹے میں ہال میں جمع ہوئے۔ ایک سِرے پر میز اور اس پر چند چیزیں تجربہ کرنے کے لئے رکھی گئیں۔ یہ سوال کہ "بادل کیسے بنتے ہیں اور بارش کیونکر ہوتی ہے" لڑکوں نے اس طرح سمجھایا جیسے کوئی سائنس کا ماسٹر چیزیں دِکھا دِکھا کر سمجھاتا ہو۔ درمیان میں ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہو جاتی تھیں۔ اِس سے لڑکوں کے حوصلے بڑھے۔ وہ میرے سر ہو گئے کہ ایسی ہی نئی نئی باتیں کروائیے۔ میں چاہتا بھی یہی تھا۔ اِس وقت تک ہمارے ملک میں تم لوگوں کے لئے ایک دو ہی

ڈرامے لکھے گئے تھے۔ تم جانو ڈرامہ کہتے اسی چیز کو ہیں کہ ایک شخص کے ساتھ جو واقعات پیش آئیں اُس کی نقل ہو بہو لکھی یا دکھائی جائے۔ بس اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ واقعات کہانی کی طرح سلسلے میں ہوں اور اِن سے کوئی مفید نتیجہ نکلے۔ سوچا کہ ایسی ایسی باتیں اقامت گاہ میں ہوتی رہتی ہیں۔ کیوں نہ اِن ہی واقعات کا ڈراما تیار کریں۔ چنانچہ پہلی دفعہ "کاہل طالب علم" کے نام سے ایک ڈراما لکھا (اسے مکتبہ جامعہ نے "کایا پلٹ" کے نام سے شایع کیا ہے) اس کے کھیلتے وقت اقامت گاہ۔ کھیل کا میدان۔ جماعت کا کام دکھانے کے لئے سامان لگانا پڑتا تھا۔ اس تبدیلی کے وقت پردے کی ضرورت تھی یہ کام چادروں سے لیا گیا اس ڈرامے میں ارشاد صاحب (اتالیق)، کیلاٹ صاحب (ورزش کرانے والے)، کریم اللہ صاحب (پڑھانے والے) کی نقل لڑکوں نے ایسی اُتاری کہ لوگ بات بات پر ہنستے تھے قائم گنج کے سراج نے "کاہل طالب علم" کا کام سچ مچ کاہلی کے ساتھ دِکھایا تھا کام نیا تھا اور دلچسپ بھلا ایسے موقعوں پر تم لوگوں سے خاموش رہا جاتا! ہر طرف سے تقاضے

شروع ہوئے کہ اور ہونا چاہیئے۔ میں بھی باتوں میں آگیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ایک اور ڈرامہ "ریاضی دان طالب علم" کے نام سے کھیلا گیا۔ مگر اس میں کوئی خاص بات نہ تھی اس لیئے شائع بھی نہیں کیا۔ میں نے لڑکوں سے کہا "جانتے ہو ڈرامہ پھُس پھُسا کیوں رہا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ آسانی کے ساتھ ڈرامے لکھے جاتے تو اب تک یہ سینکڑوں نکل آتے۔ پھر تم نے دیکھا کہ اس کی تیاری میں کتنا وقت خرچ ہوتا ہے۔ تمھارے لیئے بھی ایک کام تو نہیں ہے اور کاموں کا بھی خیال رکھنا ہے۔ تم لوگ ایک عرصہ تک اور کاموں میں لگ جاؤ میں اتنے کوئی اچھا سا ڈراما جو پہلے سے بہتر ہو تیار کرلوں گا۔ لڑکوں کی سمجھ میں بات آگئی اور میں ایک نیا ڈراما لکھنے کی فکر میں رہا۔ یہ خیال بھی تھا کہ اب کی دفعہ ایسا کھیل تیار کرنا چاہیئے جسے دیکھنے کے لیئے باہر کے لوگوں کو بھی دعوت دی جاسکے

گاندھی جی کے کہنے کے مطابق لڑکوں کو تعلیمی کاموں میں لگا رہنا چاہیئے۔ لیکن ضرورت پڑے تو بڑے لڑکوں کو اپنے بڑوں کا ساتھ دینے کے لیئے "سیاسی میدان" یعنی

آزادی کی کوشش کے لئے باہر نکل آنا چاہئے۔ اس بات
کو دکھانے کے لئے ڈراما "قوم پرست طالب علم" لکھا اور
ہفتہ میں دو دن کے حساب سے ایک مہینہ تک تیاری ہوئی
دیکھنے والے بہت سارے لوگ تھے۔ ہال ناکافی تھا۔ میدان
میں کرنے کے لئے کئی پردوں کی ضرورت تھی۔ ایسے کاموں
کا سارا خرچ مدرسہ برداشت کرے تو خرچ بڑھ جاتا ہے۔
لڑکوں نے خوشی خوشی چندہ اکٹھا کیا۔ کچھ مدد جامعہ نے بھی دی
عید کا زمانہ تھا۔ اس سے بہتر تاریخ اور کونسی ہو سکتی تھی!
کھلے میدان میں جامعہ کے تمام لوگ اور مہمان بیٹھے ہوئے
تھے۔ ان سب کے بیچوں بیچ مولانا محمد علی بھی بیٹھ گئے۔ سب سے
پہلے لڑکوں نے قومی ترانہ گایا پھر ایک بڑے طالب علم کے
واقعات دکھائے گئے کہ اس نے قومی جلسہ میں حصہ لیا۔
گرفتار ہوا۔ مولانا حسرت موہانی کی طرح جیل میں چکی پیسی۔ رہائی
ہوئی۔ مدرسے کے لڑکوں نے دعوت دی۔ پھر اسی لڑکے
نے بڑے ہوکر ایک ہندو کی دولت کی حفاظت کی۔
مولانا محمد علی یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔
بیچ بیچ میں بلند آواز کے ساتھ کچھ تبصرہ بھی کرتے جاتے

تھے کیونکہ یہ سب باتیں ان پر بہت چکی تھیں - کہتے تھے
یہ لڑکے تو میری نقل کر رہے ہیں - اس سے لوگوں میں اور بھی
دلچسپی بڑھ گئی - اس ڈرامے میں لکھنؤ کے عرفان (اب
ایم - اے ہو گئے ہیں) نئے قوم پرست طالب علم کا اور
سی - پی کے رفیق نے ڈاکو کا کام اچھا کیا تھا - نبی احمد نے
مولانا شوکت علی کی نقل کی تھی - ان کا جسم ہے بھی ایسا ہی
اس لئے ان کے بولنے سے پہلے لوگ انھیں دیکھ کر ہنستے
تھے

اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ میں خاص طور پر
اُن لڑکوں کا ذکر کروں جو اداکار کی حیثیت سے تماشہ دیکھنے
والوں کے سامنے نہیں آتے تھے لیکن ان خاموش اور
گمنام لڑکوں کی محنت سے ڈرامے کامیاب رہتے تھے -
میری مراد اسٹیج تیار کرنے والے - سامان مہیا کرنے اور
سجانے والوں سے ہے - دُولھا بننا آسان ہے لیکن دُولھا
بنانا مشکل - یہ لڑکے کئی دن پہلے سے اپنے ہاتھ سے تیار ہونے
والا سامان بناتے تھے - آخری مشق اور کھیل کے دن صبح
سے شام تک منڈوا بنا کر چیزوں کو ٹھیک ٹھاک کرتے تھے

پھر تماشہ ختم ہونے کے بعد سب لڑکے تو اپنے اپنے کمروں
میں چلے جاتے مگر یہ لوگ سب چیزوں کو بٹور کر
دوسرے دن جہاں کا سامان وہیں پہنچا آتے تھے۔ اس کام
میں یوں تو بہت سے لڑکوں نے وقتاً فوقتاً حصہ لیا لیکن
بہار کے سراج الحق۔ ضیاء الحق۔ پنجاب کے عبدالخالق (جواب
تعلیمی مرکز میں استاد ہیں)، اور ان کے ساتھیوں کو نہ بھولوں گا
کہ ابتدائی زمانے میں جبکہ اس کام کا چلانا مشکل تھا بڑی
مدد دی

اسی زمانے میں ایک دن کی بات ہے کہ کسی لڑکے نے
مجھ سے پوچھا

"ماسٹر صاحب یہ سب کچھ تو ہو رہا ہے لیکن جس طرح
بڑوں کے ڈرامے میں عورتوں کا "پارٹ (کام) ہوتا ہے
اس طرح ہمارے ڈراموں میں لڑکیوں کا کام نہیں ہوتا ہے
یہ کیا بات ہے"!

میں نے جواب دیا

" ہمارے مدرسہ میں لڑکیاں نہیں پڑھتی ہیں۔ اس لئے
ان کا کام نہیں رکھا گیا"!

"تو کیا ہوا ہمارے ہاں کئی لڑکے ایسے ہیں جو لڑکیوں کی نقل کر سکتے ہیں" ایک لڑکے نے جواب دیا

"یہ ٹھیک ہے لیکن مردوں کی نقل مرد اور عورتوں کی نقل عورتیں کریں تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جب لڑکیاں پڑھنے لگیں گی تو ان کا بھی خیال رکھا جائے گا! اور دیکھو ہم نے اب تک جتنے ڈرامے کھیلے ہیں عورتوں کے کام بغیر سب ٹھیک معلوم ہوتے تھے۔ ہر ایک ڈرامے میں عورتوں کا کام لازمی نہیں ہے!"

لڑکوں کی سمجھ میں بات آ گئی اور معاملہ رفع دفع ہوا۔

تھوڑے دنوں بعد میں بیمار ہو کر طبیہ کالج چلا گیا۔ ڈاکٹر ظفر یاب صاحب ہاؤس سرجن تھے۔ یہاں بھی وہی پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ دیکھا۔ صبح صبح لڑکے عملی کام سیکھنے کے لئے آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب انھیں مریضوں کے پاس لے جا کر بیماری کے بارے میں سمجھاتے ایک دن میرے پاس بھی چند لڑکوں کو لے کر آئے اور انھیں سمجھایا کہ کسی بیمار کا پچھلا اور موجودہ ریکارڈ کس طرح رکھا جاتا ہے۔ لڑکے روزانہ میرے پاس آ کر بیماری کا حال لکھ لیتے تھے۔ اِن میں سے

بعض لڑکے محض خانہ پُری کر کے چلے جاتے تھے یعنی بیمار کی
باتوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ یہ بات ظفریاب صاحب
کو معلوم ہوئی اُنھوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر لڑکوں
کو سمجھایا کہ طب کے مدرسے میں جہاں ہمیں سوچ بچار اور احتیاط
سے کام لینے کی ضرورت زیادہ ہے۔ اُن مدرسوں کے کام
کا خیال نہ کرو جہاں سے پڑھ کر آئے ہو۔ ڈاکٹر صاحب آدھی
رات کو بھی مریضوں کے اِرد گِرد چکر لگاتے تھے۔ اس سے
مجھے بڑی تسلّی ہوتی تھی۔ مریضوں کے ساتھ ان کا برتاؤ مستعدی
وقت کی پابندی دل لگا کر کام کرنا ہنسی مذاق کی باتیں اِن
سب چیزوں سے شفاخانے جیسے بے جان گھر میں بھی
زندہ دلی نظر آتی تھی۔ اِن ہی چیزوں کا اثر لے کر میں نے
یہاں بھی ایک ڈراما لکھا "طب کی دنیا" ڈاکٹر صاحب کے
سب کام کرنے والوں کو سُنایا وہ اور بھی چوکنے ہوئے۔
اِس میں مقامی باتیں زیادہ تھیں۔ اس لئے شائع نہیں کیا۔
لیکن دو باتیں ضرور حاصل ہوئیں میری تفریح رہی۔ کام کرنے
والوں کو سوچنے کا موقع ملا ...... حد ہو گئی۔ بیماری میں بھی
ڈراما کا ذکر۔ آخر یہ ڈراموں کی کہانی کب تک سُنتے رہو گے

آؤ اب جامعہ کے اور کاموں پر نظر ڈالیں

کام کرنے والے اپنا رنگ جمائے بغیر رہ نہیں سکتے ہیں

رامچندرن جی اور دیو داس جی جب جامعہ میں آئے تو انھوں نے تکلی اور چرخہ کو رواج دیا۔ بعض لوگوں نے پوچھا آخر اس سے فائدہ کیا۔ انھوں نے وہی جواب دیا جو اس کام کے کرنے والے ایک دفعہ نہیں بیسیوں دفعہ دُہراتے رہنے میں اپنی خوشی سمجھتے ہیں یعنی ہمارے ملک میں کام کے ذرائع ایسے نہیں ہیں جس میں سب لوگ حصہ لے سکیں۔ کسان سال کا کچھ حصہ مشغول رہ کر باقی وقت بیکار رہتے ہیں۔ پڑھے لکھے نوجوان نوکری یا کام کی تلاش میں کئی کئی سال گزار دیتے ہیں خیالی پلاؤ پکانے سے تو یہ اچھا ہے کہ کچھ نہ کچھ کرتے رہو۔ ہاتھ سے کام کرنے کی عادت کا اور عادتوں پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ پھر یہ ایک پنتھ دو کاج ہے یعنی ایک تو کرنے کے لئے کچھ ملا دوسرے کھادی کو ترقی ہوئی۔ بیکار رہنا پھر دوسرے ملک کے کپڑے پہننا ایسا ہی ہے کہ آدمی اپنا سب کچھ دے کر ننگا ہو جائے۔ خیر یہ سب دلیلیں نہ سہی لڑکے تو اس لئے خوش تھے کہ انھیں ایک تماشہ ہاتھ آیا

جدھر دیکھو تکلیاں ہی تکلیاں نظر آتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کھدر پہن رکھا ہے اسے تیار بھی خود ہی کر رہے ہیں استادوں میں سعد انصاری صاحب اور شفیق صاحب نے اس کام کو بہت پھیلایا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس چیز سے اُس وقت پڑھنے لکھنے کا کام بھی لیا گیا یا نہیں لیکن آجکل تو یہ بنیادی تعلیم والے اِس سے پڑھنے لکھنے کا کام بھی لیتے رہتے ہیں۔ اس کا ذکر استادوں کے مدرسہ کے سلسلہ میں آئے گا۔ جو ایک عرصہ کے بعد قائم ہوا ہے

دستکاری کو ترقی دینے کے لیے نجاری (بڑھئی کا کام) کا شعبہ قائم کیا گیا۔ لکھنؤ کے آرٹ اسکول کے تعلیم یافتہ ماسٹر عبدالحی صاحب اِس کے نگران ہیں۔ طلبا کو اس کام کی موٹی موٹی باتیں سکھلانے کے علاوہ نمائش کے لئے اچھی اچھی چیزیں تیار کرواتے ہیں۔ لکڑی کی جامع مسجد اور قطب مینار نے تو کئی جگہ انعام حاصل کئے ہیں۔ جامعہ کی نمائشوں میں ماسٹر صاحب کے شاگردوں کا کام نمایاں نظر آتا ہے۔ ڈرائنگ کا کام بھی ہر ایک جماعت میں لازمی کر دیا گیا۔ اس کے سکھانے والوں کی محدود تعداد کا خیال کرتے ہوئے یہ مشکل معلوم ہوتا تھا کہ اِس شعبہ

میں بھی کوئی " قومی آدمی " مل جائے گا لیکن تمھیں یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ سب سے زیادہ "کٹر" یہی صاحب نکلے۔ جو آج تک اپنی باتیں اور باتیں کیسی بلکہ اپنے عمل سے ایک انچ بھی آگے پیچھے نہیں ہٹتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جامعہ میں بعض چیزیں لازمی ہو جانی چاہئیں۔ مثلاً کھدر کا پہناوا۔ کھدر کی ٹوپی۔ قومی تہواروں پر صرف ایک جھنڈے کا لہرانا۔ انھیں سمجھایا بھی گیا کہ جہاں تک قومی رنگ (قومی فضا) کا تعلق ہے وہ تو جامعہ کی خصوصیت رہے گی۔ لیکن جزئیات میں پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔ ہاں ہر استاد کو حق ہے کہ وہ اپنے طور پر لڑکوں کو راضی کرلے۔ جو لڑکے کھدر کی ٹوپی پہننے سے کتراتے تھے ان کے نام سے اچھی طرح واقف ہوگئے ہونگے یعنی اختر حسن صاحب فاروقی یہ خود تو بہت خاموش رہتے ہیں لیکن ان کا کام ہر جگہ بولتا نظر آئے گا۔ نماز روزے کے پابند ہیں۔ خدا نے بیماروں کی دلجوئی کرنے کے لیئے دل بھی دیا ہے۔ میں کئی دفعہ بیمار ہوا ہوں۔ اس لیئے دوستی پکی ہوگئی ہے۔ بعض دفعہ ناچاقی بھی ہو جاتی ہے مگر کُٹّی کرنے کو جی نہیں چاہتا

رسالہ جوہر جو کچھ عرصہ کے لئے بند ہو گیا تھا دوبارہ
نکلنے لگا

مدرسہ کی انجمن "بزم ادب" کی طرف سے محمد قاسم صاحب
سندھی نے رسالہ گلشن جاری کیا۔ سندھی ہونے کی وجہ سے
اردو سیکھنے میں آپ کے لئے وہ آسانی نہ تھی جو اور لڑکوں
کو مادری زبان کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن اس کام کے شوق
نے آپ کی ہمت قائم رکھی اور ایک عرصہ تک رسالہ نکالتے رہے
ماسٹر برکت علی صاحب (جو پہلے سائنس پڑھایا کرتے
تھے اب ریاضی پڑھاتے ہیں) نے اسی سال "انجمن حکمیات"
قائم کی آپ نے یکے بعد دیگرے کئی چیزیں چلانے کی کوشش
کی۔ ایک عرصہ تک نئے سکالروں کے کھیلوں کو
منتظم کرتے رہے ان ہی لڑکوں کی طرف سے آپ نے
۱۹۳۸ء میں "انصاری میموریل ہاکی شیلڈ" کی بنا ڈالی۔ آپ کی
کوششوں سے کرکٹ کے کھیل موقع موقع سے ہوتے رہتے ہیں
برکت صاحب مزاج کے سخت ہیں۔ میں نے آپ کی
نکتہ چینی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ وقت کے
بہت پابند ہیں۔ ایک زمانے میں مدرسہ کی حاضری

لیا کرتے تھے - صبح پھوپی کا انتقال ہوا۔ مدرسہ والوں کو
اطلاع دینے کے لئے وقت نہ تھا۔ خود ہی تشریف لائے
حاضری لی پھر میت کے انتظام کے لئے گئے - جو لوگ وقت
کے پابند ہوتے ہیں اگر ان کے ذمے کوئی کام کیا جائے تو
اطمینان رہتا ہے کہ کام وقت پر شروع ہو کر رہے گا۔ اگر
لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ایسا شخص جلسہ کا منتظم ہے تو
آنے والے وقت پر آ جاتے ہیں - ایک دوسرے کے
انتظار میں کسی کا وقت ضائع نہیں ہوتا ہے اور نہ دوسرے
سوچے ہوئے کاموں کا ہرج ہوتا ہے - اس عادت سے
کام کرنے میں تکلیف بھی نہیں ہوتی

برکت صاحب کی ایک اور عادت ہے جس میں میں
نے کبھی فرق نہیں پایا - سردیوں میں سورج نکلنے سے دو
گھنٹے پہلے جاگ جاتے ہیں - اس وقت لڑکوں کی کاپیاں
دیکھتے ہیں یا یہ کام مدرسہ میں نبٹا لیا ہو تو کسی مفید کتاب
کا مطالعہ کرتے ہیں - کہتے ہیں کہ یہ وقت بہت سکون کا
ہوتا ہے - اب مہمانوں کا حال سنو

دہلی منتقل ہونے کے بعد گاندھی جی جامعہ میں پہلی دفعہ

تشریف لائے تو طلبار اور اساتذہ نے کھدر کے کام کے لئے ستر روپئے کی تھیلی نذر کی اور سپاسنامہ پیش کیا۔ آپ کے ہمراہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں (امیر جامعہ) ڈاکٹر انصاری (معتمد جامعہ) سیٹھ جمنا لال بزاز اور مہادیو دیسائی تھے "ڈائس" تک پہنچنے کے لئے جو راستہ بنایا گیا تھا اس کے دونوں طرف قطار میں طلبا تکلی چلا رہے تھے۔ گاندھی جی نے ہر ایک کے کام کو غور سے دیکھا اور خوش ہوئے۔ حکیم اجمل خاں نے آپ کے خیر مقدم میں تقریر کی اس کے بعد کلیہ کے ایک لڑکے نے سپاسنامہ سنایا

" مہاتما جی ــــ آج آپ نے جامعہ میں تشریف لاکر ہمارے دلوں کو سچی خوشی سے بھر دیا ہے۔ آپ کے تشریف لانے سے ہماری ہمتیں بڑھ گئی ہیں اور ہمارے ارادے بلند ہوگئے ہیں ہم آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دیس کی خدمت کے لئے آپ کو بہت دن قائم رکھے

آپ خوب جانتے ہیں کہ ہماری جامعہ نے ایک بہت بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ ہم کو ایسی تعلیم دینا چاہتی ہے

جس سے ہم خدا کے نیک بندے اپنے دیس کے سچّے خادم
اور سارے انسانوں کی بھلائی چاہنے والے بن جائیں
وہ ہمیں یہ سکھانا چاہتی ہے کہ ہم اپنے علم و ہنر سے اپنے
اخلاق کو سنواریں۔ محنت اور مشقت سے اپنے اور اپنے
عزیزوں کے لیئے حلال کی روزی کمائیں اور خلوص اور
ہمدردی سے اپنی قوم کی ترقی اور اپنے ملک کی آزادی
کی کوشش کریں

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آج کل زمانہ کی ہوا ہمارے
خلاف ہے۔ ملک میں لڑائی اور فساد کی آندھیاں چل رہی ہیں
جس سے پیار و محبت کی کھیتی مُرجھائی جاتی ہے ہم آپ کو یقین
دلانا چاہتے ہیں کہ یہ پودے جنھیں آپ نے اور دوسرے
بزرگوں نے جگر کے خون سے سینچا تھا اگر سوکھ بھی جائیں
تو ان کے بیج برباد نہیں ہوسکتے وہ ہمارے دلوں میں
محفوظ ہیں اور اگر خدا نے چاہا تو ان سے پھر نئے پودے
نکلیں گے اور زہریلی ہواؤں سے بچ کر مضبوط اور تناور
درخت بن جائیں گے

ہم آخر میں پھر نہایت ادب سے آپ کی تشریف آوری کا

شکریہ ادا کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ یہ عزت جلد جلد حاصل ہوا کرے گی"

ہم ہیں آپ کے فرمانبردار
طلبائے جامعہ ملیہ اسلامیہ

گاندھی جی نے سپاسنامے کے جواب میں فرمایا:-

"جو لڑکے میرے پاس بیٹھے ہیں وہ میرے ایک پرانے دوست اور رفیق کار کے پوتے ہیں جن کا نام احمد محمد کاچلیہ ہے۔ انھیں میں اپنے حقیقی بھائی کے برابر سمجھتا تھا اور ان بچوں کو دیکھ کر ان کی یاد تازہ ہو جانا ایک بالکل قدرتی امر تھا۔ ان ہی بچوں کے سلسلے میں کچھ باتیں آپ سے کہنی چاہتا ہوں۔ جس زمانہ میں میں نے جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ شروع کی تھی اُس وقت وہاں کے ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں میں "کاچلیہ" سے بڑھ کر باہمت اور مستقل مزاج کوئی آدمی نہ تھا۔ انھوں نے اپنے ملک کی عزت و آبرو کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ انھوں نے نہ تو اپنے کاروبار اور مال و دولت کی کوئی پروا کی اور نہ اپنے دوست احباب کا خیال کیا بلکہ بلا کسی تامل اور اندیشے کے انھوں نے

اپنے آپ کو اس کشمکش میں ڈال دیا۔ اُس وقت بھی بدقسمتی
سے ہندو مسلم اختلافات گاہے گاہے پیدا ہو جاتے تھے لیکن
"ررکا چلیہ" نے دونوں کے درمیان توازن ہمیشہ قائم رکھا
اور ان پر بیجا حمایت اور پاسداری کا الزام کبھی نہیں لگا
اُنھوں نے حب وطن اور رواداری کی خصوصیات
نہ کسی اسکول میں رہ کر حاصل کی تھیں اور نہ انگلستان جا کر
بلکہ انھوں نے یہ سب کچھ خود اپنے گھر میں سیکھا تھا اِس لئے
کہ وہ گجراتی زبان بھی مشکل سے لکھ پڑھ سکتے تھے۔ مقدمات
کی پیروی میں جس طریقے سے وہ دلائل کا جواب دیتے وکلاٗ
اور بیرسٹر بھی اسے سُن کر دنگ رہ جاتے اور بعض وقت
ان سے خود ان کے کاموں میں بھی بڑی مدد ملتی رہتی تھی
اُنھوں نے ستیہ گرہیوں کی رہبری بھی کی اور اسی حالت میں
اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اِن کا ایک بیٹا تھا جس کا نام
علی تھا اور جسے وہ میرے سپرد کر گئے تھے گیارہ سال کا
یہ لڑکا سچا اور پکا مسلمان تھا۔ رمضان کے مہینے میں وہ
کبھی ایک روزہ بھی نہ چھوڑتا تھا۔ پھر بھی اُسے ہندو
ساتھیوں سے کوئی نفرت نہ تھی۔ آج کل ہندو مسلمان

دونوں میں مذہبیت کے معنی دوسرے مذاہب سے نفرت وحقارت کے ہیں۔ علی میں اس قسم کی نفرت وحقارت کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ بہرحال بیٹے اور باپ دونوں کے نام آج میرے لئے انتہائی مسرت وخوشی کا باعث ہیں اور خدا کرے ان کی یہ مثالیں آپ کے لئے تقلید اور رہنمائی کا سبب ہوں

اُس زمانہ میں جب کہ ہندو اور مسلمان ایک ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کے لئے اور اپنے وطن کی خاطر اپنا خون بہانے کو تیار تھے میں نے طلبار کو سرکاری اسکولو اور کالجوں کے چھوڑنے کی دعوت دی تھی۔ اِس تمام عرصہ میں مجھے کبھی اس بات کا افسوس نہیں ہوا کہ میں نے اِن طلبار کو اِن کی تعلیم گاہوں سے کیوں بُلایا اور یہ پختہ یقین ہے کہ جن طلبار نے اِس آواز پر لبیک کہا تھا اُنھوں نے اپنے وطن کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کا آئندہ مورخ ان کے ایثار اور قربانی کو نہایت جلی حرفوں میں لکھے گا میں اِس قابل فخر زمانہ کے کچھ آثار یہاں دیکھ کر

بہت خوش ہوا اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہے کہ آپ
اس جھنڈے کو قائم رکھنے کے لئے اپنی پوری محنت اور
جاں فشانی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ کی تعداد اگرچہ
بہت کم ہے لیکن دنیا میں اچھے اور سچے آدمی کبھی بہت
نہیں ہوئے ہیں۔ میں آپ کو بھی نصیحت کروں گا کہ قلت تعداد
کا آپ کچھ خیال نہ کیجئے بلکہ اس بات کو پیش نظر رکھئے کہ
ملک کی آزادی کا انحصار آپ پر ہے۔ آزادی کا آپ کے
پڑھنے لکھنے یا تکلی چلانے سے بہت کم تعلق ہے۔ ہندوستان
کی آزادی کے لئے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے
اگر وہ آپ میں نہیں ہیں تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ پھر اور
کس میں ہو سکتی ہیں! وہ چیزیں خدا کا خوف اور انسان
یا انسان کے مجموعے سے جس کا نام حکومت یا سلطنت ہے
بے خوف ہوتا ہے۔ ان دو چیزوں کی تعلیم اگر آپ کی
اس درسگاہ میں نہیں ہو سکتی تو میں نہیں سمجھتا کہ پھر اور
کس درسگاہ میں ہو سکتی ہے۔ میں آپ کے پروفیسروں کو
جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ان دو چیزوں کی تعلیم یہاں
ضرور ہوتی ہے

مجھے اس کا ذرا بھی خیال نہیں کہ آپ کی مالی حالت
اچھی نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس بات سے میں خوش
ہوں کہ آپ عسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کر رہے ہیں
اس طرح اپنے خالق کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہے گی
اور آپ ہمیشہ اس کا خوف اپنے دل میں رکھیں گے

حکیم صاحب کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ میرے لئے
دہلی آنا بہت دشوار تھا لیکن آپ کے ہاں آنے میں مجھے
انتہائی مسرت و اطمینان حاصل ہوا۔ میں آپ کی خوشی کے لئے
یہاں نہیں آیا ہوں بلکہ اپنے کو خوش کرنے کے لئے آیا ہوں
میں ایک ذاتی غرض کو لے کر یہاں آیا ہوں اور وہ آپ سے
یہ کہنا ہے کہ باوجود اس کے کہ جامعہ سے باہر نفرت اور زہر کا
طوفان پھیلا ہوا ہے۔ باوجود اس کے کہ مسلمان ہندوؤں اور
ہندو مسلمانوں کا گلا کاٹنے پر تیار ہیں لیکن آپ اپنے آپ کو
اس سے متاثر نہ ہونے دیں۔ اپنے خالق کو کبھی نہ بھولیں اور
اپنے دلوں میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا نہ ہونے دیں
اس امید پر میں آپ کے یہاں آیا ہوں

آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے کھادی اور لنگی کے

بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بنیادی چیزوں کے آگے جو میں نے آپ کو ابھی بتائی ہیں کھادی اور تکلی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ آپ ہزار تکلی چلائیں اور کھادی پہنیں لیکن اگر آپ ان باتوں پر عمل نہ کریں جو میں نے ابھی آپ کے سامنے بیان کی ہیں تو آپ کی یہ کھادی اور تکلی کسی کام کی نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ حکیم صاحب نے کھدر پہننے کی جو ضرورت جتائی ہے اسے بھی آپ ہرگز نہ بھولیں گے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ کھادی کے ذریعے آج ہم ساٹھ ہزار سوت کاتنے والوں کو روزی کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں۔ جولاہے دھوبی اور دوسرے پیشے والے اس سے بالکل علیحدہ ہیں۔ یاد رکھئے کہ ان میں بہت سے مسلمان بھی ہیں اگر چرخے کا رواج نہ ہوتا تو بہت سی جگہوں میں مسلمان عورتیں بھوکوں مر جاتیں۔ غریب ہندؤ اور مسلمانوں سے اپنے آپ کو قریب کرنے کی اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں کہ کھادی پہنئے

علاوہ اس کے ہمیشہ پاک وصاف رہیے۔ پاکی اور صفائی نہ صرف ظاہری اور جسمانی ہو بلکہ اندرونی اور

دل کی ہو۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری کیا مراد ہے۔ اپنے وعدوں کو پورا کیجیے خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن آئے اور اِن باتوں کو ہمیشہ اپنی یاد میں تازہ رکھیے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں"

اِس سال سیر و تفریح کا انتظام بھی اچھا رہا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آئندہ کے لئے مزید انتظامات کی راہ نکل آئی۔ ہر ایک اقامت گاہ میں اندرونی کھیلوں کی رسم افتتاح منائی گئی۔ ہر جگہ ایک بڑے کمرے میں "لوڈو" سیڑھی کا کھیل۔ شطرنج۔ کیرم بورڈ اور نہ جانے کون کون سے کھیلوں کا انتظام تھا۔ برسات میں دہلی سے آٹھ میل دور دریا کے کنارے اوکھلے کھیل کود کے لئے چلے آتے تھے بعض لڑکے کہا کرتے "کاش جامعہ اسی جگہ ہوتی" لیکن یہ محض آرزو کا اظہار ہوتا۔ کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ دس سال بعد اِس سارے علاقے پر ہمیں چھائے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور خیال بھی کیسے ہوتا۔ یہ وہی زمانہ تھا کہ چھ چھ مہینے اُستادوں کی تنخواہوں کا حساب نہ ہوتا تھا۔ مہینہ بھر کوشش کرنے سے مشکل سے کھانے کے دام

ملتے تھے۔ مستقل آمدنی کا ذریعہ نہ تھا۔ مگر استادوں کی ہمت دیکھو۔ لڑکوں کے پڑھنے پڑھانے میں ان کے کھیل کود سیر و تفریح اور خوشیوں میں ذرا فرق نہ آنے دیا۔ بلکہ ہر سال نئی نئی چیزوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ میں سُنا تو رہا تھا تفریحی باتیں یہ بیچ میں رُوپے پیسوں کی ایک بات نکل آئی
مدرسے سے تھوڑی دور، بُو علی بختیاری کے پُرانے محل کے پاس ایک پختہ سرکاری تالاب تھا۔ اجازت لے کر پیڑاکی کا انتظام کیا گیا۔ شام کو بڑی بہار رہتی تھی۔ محمّد حسین صاحب حیدرآبادی (طالب علم) اور ان کے ساتھی پیڑنا سکھایا کرتے تھے۔ پیڑنے کو تو ہر کوئی پیڑلے۔ لیکن ڈوبتے کو نکالنا کمال کی بات ہے۔ حسین صاحب کو اس کا ملکہ تھا۔ کبھی کبھی بچوں کی اس تفریح کو دیکھنے کے لئے مولانا محمّد علی بھی تشریف لایا کرتے تھے
ایک دن ذاکر صاحب کے جی میں آئی کہ پیڑنا سیکھیں۔ لنگی باندھ تالاب کے کنارے پیر لٹکائے بیٹھ گئے۔ حسین صاحب ایسے شرمیلے کہ چُپ چاپ انتظار میں کھڑے رہے۔ ذاکر صاحب فرمانے لگے "جناب پیراکی کے سارے اُصول اور قاعدے ازبر یاد ہیں۔ لیکن جب تک دو ایک غوطے نہ کھائیں

عمل کی جرأت نہیں ہوتی ہے" معلوم نہیں غوطے کھانے کی
نوبت آئی ہے یا نہیں

اِس سال جو طلبار جامعہ میں رہ چکے ہیں وہ میر باقر علی
داستان گو کو کبھی نہ بھولیں گے۔ موصوف دِلّی کے پُرانے لوگوں
میں سے تھے۔ داستان (لمبی کہانی) کہنے کا ملکہ تھا۔ بیان کیا کرتے
تھے بس آنکھوں کے سامنے سارا نقشہ آجاتا تھا۔ ایسا معلوم
ہوتا کہ کہانی کے لوگ ہمارے سامنے چل پھر کر سب کچھ کہہ رہے
ہیں۔ دکھا رہے ہیں۔ جی چاہتا تھا کہ گھنٹوں سُنتے جائیں یہ
سناتے بھی تھے کم سے کم تین گھنٹے۔ چاندنی راتوں میں خاکسار منزل
(چھوٹے بچوں کا اقامت خانہ) کی چھت پر تمام طلبار اور
اساتذہ جمع ہو جایا کرتے تھے۔ خاص شہر دہلی کے پُرانے قصے
سُناتے تھے۔ کبھی بادشاہوں کے تو کبھی "کرخندار وں" (عام
لوگوں) کے۔ کہانی میں بوڑھے، بچے، عورت، مرد سب کا ذکر
ہوتا اور لطف یہ کہ جس کی بولی بولتے ویسا ہی لہجہ اختیار کرتے
ایک اور خاص بات یہ تھی کہ بیچ بیچ میں لڑکوں کو مخاطب
کر کے نصیحت کرتے کہ "بچو تم بھی ایسا کرنا یا نہ کرنا" جیسا موقع
ہو۔ ہاں صاحب ٹھیک ہے۔ داستان کہنا بھی ایک فن ہے

دیکھو اللہ میاں نے دنیا میں سینکڑوں چیزیں بنا دی ہیں کہ کوئی کسی میں کمال حاصل کر رہا ہے۔ تو کوئی کسی میں
رمضان کی دلچسپیوں نے ایک خاص رنگ اختیار کر لیا تھا ہر ایک اقامت گاہ والے باری باری سے جامعہ کے تمام اساتذہ منشی صاحبان اور لڑکوں کو افطاری پر مدعو کرتے تھے۔ ایسی چہل پہل اور ملاقات کے موقعے اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئے تھے

ہر خوشی کے ساتھ رنج بھی لگا ہوا ہے۔ جامعہ کے سب لوگ ہنسی خوشی اپنے کاموں کو انجام دے رہے تھے کہ اچانک مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی وفات کی خبر ملی۔ وہی حکیم صاحب جو پہلے "امیر جامعہ" تھے۔ علی گڑھ سے سسکتی ہوئی جامعہ کو دہلی لا کر مسیحائی دکھائی۔ جامعہ کی مالی حالت ۱۹۲۴ء سے خراب ہو گئی تھی۔ بعض دفعہ تو اتنی تنگی ہو جاتی تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب ہو گا کیا۔ لیکن حکیم صاحب کا خیال کر کے ڈھارس بندھتی تھی۔ اور ہوا بھی یہی ایسے موقعوں پر مرحوم نے اپنے خاص خاص دوستوں سے بڑی بڑی رقمیں دلوائیں۔ ان کے پیچھے صرف ایک جامعہ ہوتی تو اتنی

نوبت بھی نہ آنے دیتے مگر ایک طرف طبیہ کالج کا چلانا،
دوسری طرف انجمنوں کے کارکنوں کی ہمت بڑھانا پھر
گھر کا یہ حساب کتاب کہ خواہ امیر ہو یا غریب جو کوئی بھی
علاج کے لئے گھر پر جاتا اس سے خود کچھ نہ لیتے۔ کہنے کو یہ
دہلی کے رئیس تھے مگر دِل کے رئیس تھے اور غریبوں کے
خادم تھے۔ شیخ الجامعہ صاحب کے دفتر میں ان کی تصویر
لگی ہوئی ہے جس کے نیچے یہ شعر ہے

"یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوآں
ہر کجا می نگری انجمن ساختہ اند"

جب کوئی محسن جُدا ہو جاتا ہے تو اس کی یادگار قائم
کی جاتی ہے۔ حکیم صاحب نے جسمانی علاج کی یادگار طبیہ کالج
اپنی زندگی ہی میں مضبوط بنیادوں پر قائم کر دی تھی۔ لوگوں
نے کہا۔ اِن کی وفات پر رُوحانی علاج یعنی جامعہ ملیہ اسلامیہ
کی یادگار کو مضبوط ہو جانا چاہیئے۔ تجویز اچھی تھی۔ اس بات کو
پھیلانے کے لئے فروری ۱۹۲۸ء میں اِسی دہلی میں بہت بڑا
جلسہ ہوا۔ مشہور رہنماؤں کا بہت بڑا مجمع یا تو میں نے
کانگریس کے سالانہ جلسوں میں دیکھا ہے یا اِس جلسہ میں

یعنی پنڈت موتی لال نہرو، مولانا محمد علی ، مسٹر سری نواس آئنگر مولانا ابوالکلام آزاد۔ پنڈت جواہر لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالوی ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مسز سروجنی نائڈو، مہاراجہ محمود آباد مسٹر [illegible] اگھو آچاریہ۔ ڈاکٹر شیخ محمد عالم، جناب مرتضیٰ بہادر، مسٹر [illegible] پرکاش، مولانا شفیع داؤدی، مولانا عبدالقادر قصوری لالہ شنکر لال، مولوی عبدالقادر، سردار سردول سنگھ سب ہی شریک تھے۔ جلسے کے صدر پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ آپ نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا "کہ حکیم صاحب ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے، ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ بھی اِس نیک کام میں حصہ لیں"

پنڈت جی کی تقریر کے بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے جامعہ کے اغراض و مقاصد بتلائے اور فرمایا کہ مذہبی تعلیم۔ رواداری۔ بھائی چارہ۔ اُردو کے ذریعے تعلیم دینا۔ ہندو مسلم اتحاد جامعہ کی خصوصیات ہیں۔ پھر فرمایا کہ اِس وقت جامعہ والے کرائے کی کوٹھیوں میں ہیں تجویز یہ ہے کہ حکیم صاحب کی یادگار میں آٹھ لاکھ روپیئے جمع ہو جائیں تو اپنی عمارتیں تیار ہو سکتی ہیں۔ اِس کی تائید میں پنڈت مدن موہن مالویہ

مہاراجہ صاحب محمود آباد - مولانا ابوالکلام آزاد - سردار سردول سنگھ
نے تقریریں کیں - اس وقت چودہ ہزار روپئے کے وعدے
ہوئے تھے - یہ نام ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے پڑھ کر سنائے

جامعہ کو چلانے کے لئے جو پرانے قاعدے قانون
بنے ہوئے تھے وہ دوبارہ اس طرح ترتیب دیئے گئے کہ ہر کام کے
چلانے کے لئے باقاعدہ ایک کمیٹی بنائی گئی - سب سے بڑی
جماعت کا نام "مجلس امناء" رکھا - اس میں ایک خاص بات
یہ بھی رکھی گئی کہ اس کے زیادہ رکن جامعہ کے استاد ہی رہیں
یعنی وہ استاد جو دو باتوں کا وعدہ کریں ایک تو یہ کہ کم سے کم
بیس (۲۰) سال یا زندہ رہنے تک جامعہ کی خدمت کریں گے -
دوسرے یہ کہ ڈیڑھ سو روپئے سے زیادہ تنخواہ نہیں
لیں گے

کہنے کو تو گیارہ استادوں نے یہ عہد نامہ دیا مگر عملاً
سب استاد اسی عہد نامے کے مطابق کام کرنے لگے - اوّل تو
ملتا ہی کیا تھا پھر بھی ہر ایک نے اپنی تنخواہ کم کرالی - ڈیڑھ سو
روپئے سے زیادہ جن کی تنخواہیں تھیں وہ سو لینے لگے - سو والوں نے
پچھتر کرالئے - پچھتر والوں نے پچاس - اس سے کم پانے والوں نے
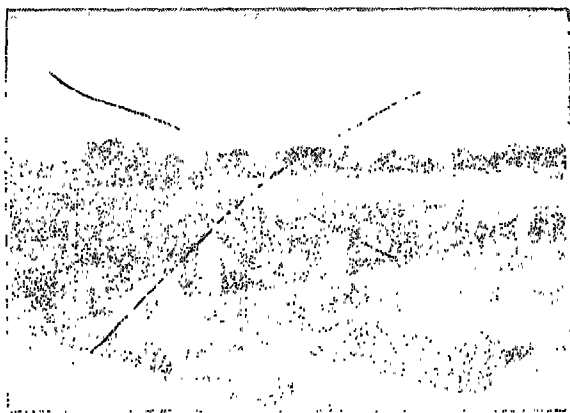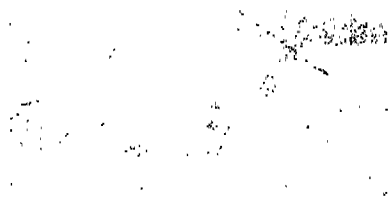
بچوں کا باغیچہ

پانچ پانچ دس دس روپئے کم کرائے میں نے بھی فیس کی بجائے پچیس کرائے۔ مقصد یہ تھا کہ جامعہ کے لئے روپئے پیسے جمع کرنے والوں کو زیادہ پریشانی نہ ہو۔ گویا اس کے چلانے والوں میں عملاً سب ہی شریک ہوگئے۔ جامعہ کا سارا خرچ جوڑ دو تو ایک اچھے سرکاری فوقانیہ (ہائی اسکول) مدرسہ سے زیادہ نہیں ہے

پہلی دفعہ جو گیارہ اُستاد عہد نامے دے کر مجلس اُمنا کے رُکن بنے ہیں اُن کے نام یہ ہیں

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (۲) پروفیسر محمد مجیب صاحب (۳) مولنا اسلم صاحب جیراجپوری (۴) مولنا خواجہ عبدالحی صاحب (۵) حافظ فیاض احمد صاحب (۶) ارشاد الحق صاحب (۷) برکت علی صاحب (۸) سعد الدین انصاری صاحب (۹) سید انصاری صاحب (۱۰) شفیق الرحمن صاحب (۱۱) حامد علی خاں صاحب

جس وقت نئے قواعد وضوابط بن رہے تھے۔ میں کشمیر میں تھا محمود صاحب۔ نیازی صاحب اور چند لڑکے بھی وہیں تھے کسی نے یہ افواہ پھیلائی کہ جامعہ نے نئے قواعد وضوابط بنانے میں سرکاری امداد قبول کرنے کا امکان رکھا ہے میں نے اُسی وقت شیخ الجامعہ صاحب کو تار دیا کہ اس خبر میں کس حد تک سچائی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ محض افواہ تھی

نواں سال

اگست ۱۹۲۸ء سے جولائی ۱۹۲۹ء

جب کسی کام کو چلانا ہو تو چاہنے کو تو سب کا جی چاہتا ہے کہ اسے شروع کریں۔ ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ کوئی شخص کام کو کھڑا کر دے اور ابتدائی غلطیوں کے بھونڈے پن کو اپنے سر لے لے۔ پچھلے سال ڈراموں کی ابتدا کرنے اور ان کو چلانے کے لئے مجھے ہر طرح کی دقتیں سہنی پڑیں۔ کوئی کہتا نوٹنکی کی طرح دو ایک نقلیں دکھانے کے بعد جب ہر طرف سے بُرا بھلا سُننے گا تو اپنے آپ چُپ ہو رہے گا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے کہ ڈراما لڑکیوں اور عورتوں کے پارٹ کے بغیر کھیلا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ بعض کا یہ خیال تھا کہ اس سے پڑھائی

میں ہرج ہوگا۔ کوئی کہتا ہندوستان میں ڈرامے کا ہنر جاننے والے بہت کم لوگ ہیں۔ اِس ہُنر کو سیکھے بغیر کام کی ابتدا نہ کرنی چاہیئے۔ غرض جتنے منہ اُتنی باتیں۔ میں ان سب کے جواب میں یہی کہتا "بھائی یہ سب کچھ درست ہے مگر مجھے ایک سال اِس کام کو کر لینے دیجیے۔ سال ختم ہونے کے بعد جیسی صورت ہوگی فیصلہ کرلیں گے" جب کام شروع ہوا تو غلطیاں بے شک تھیں۔ کہیں کہیں مخلص دوستوں نے ان کی اصلاح کی کوشش کی اور آخر اِس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کے جاری رہنے سے ہی اصلاح ہوگی

ڈراموں کی یہ کہانی اور بھی دلچسپ ہوجاتی ہے جب تم یہ جان جاؤ گے کہ ان کا اثر نہ صرف مدرسہ کے لڑکوں تک رہا بلکہ کُلّیہ (کالج) کے طلبا کو بھی شوق ہوا اور تو اور اُستادوں نے بھی ایک ڈرامہ کھیلا۔ میں اِس وقت تک کُلّیہ کے لڑکوں کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ساتھی بھی ایسے تھے جنھیں جامعہ سے خاص لگاؤ تھا۔ ان میں انور خاں صاحب مدراسی، محمد حسین صاحب حیدرآبادی، عبدالجلیل صاحب ندوی۔ امتیاز حسین خاں صاحب (قائم گنج) جو اب یورپ سے

فارغ ہو کر آئے ہیں)، پیامِ تعلیم کے مدیر حسین حسان صاحب
عبدالواحد صاحب سندھی، عبدالکریم صاحب پشاوری،
عبدالوہاب صاحب (سی۔ پی)، عزیز اللہ بیگ صاحب (سی پی)،
ذکر کے قابل ہیں۔ ایک دن کی بات ہے کہ سارے لڑکے ایک
کمرے میں جمع تھے امتیاز صاحب نے کہا

"ماسٹر جی ہو جائے ایک ڈراما"۔ مطلب یہ کہ کلیہ کے
لڑکوں سے بھی ڈراما کروائیے

میں نے کہا "بڑے لڑکوں کے لئے ایسا ڈراما نہیں ہے
جس میں عورتوں کا پارٹ نہ ہو"

"تو کیا ہوا۔ موجودہ ڈراموں میں سے کسی میں ایسی
ردوبدل کیجئے جس سے ہمارا کام بن جائے" عبدالکریم صاحب
پشاوری نے کہا

اس وقت تک کلیہ کے لڑکوں کے لئے خاص طور پر
ڈرامے لکھے نہیں گئے تھے۔ بعد میں حیدرآباد دکن کے
اساتذہ اور ہماری جامعہ کے خازن محمد مجیب صاحب نے
کئی ڈرامے اس مطلب کے لکھے ہیں جن میں عورتوں کا
پارٹ نہیں ہے۔ میں اس وقت اور کیا کرتا۔ آغا حشر کے

ایک ڈرامے میں تبدیلی کر کے لڑکوں کے سامنے رکھ دیا
پارٹ تقسیم ہوئے۔ اِن کو سکھلانے میں چھوٹوں سے زیادہ
دشواری پیش آئی۔ کوئی تو شرماتا۔ کوئی کہتا آپ بتلاتے
جائیے اِس وقت تو سنائے دیتا ہوں اصل کام اسٹیج پر
دکھاؤں گا۔ ایک صاحب فرماتے میرا کام ہی کتنا ہے۔
اوروں سے مشق کروائیے۔ کوئی تھیٹر کی نقل میں زور زور
سے بولتا تو کوئی ایسے جیسے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔
بڑی مشکلوں سے یہ لوگ قابو میں آئے۔ ڈراما تو جیسا کچھ
ہوا، اُس وقت بڑا مزا آیا جب پیامِ تعلیم کے مُدیر حسین حسان صاحب
معمولی عینک لگائے بغل میں اخباروں کا پلندہ لیے عینک میں سے
گھورتے ہوئے عدالت میں داخل ہوئے، یہ فرض کیا گیا تھا کہ
یہ پیسے والے اخبار کے مُدیر ہیں اور ایک مقدمہ میں انھیں
گواہی دینی ہے۔ انھیں سکھانے کی ضرورت اس لیے نہ پڑی
کہ یہ حضرت سچ مُچ میں جیسے تھے ویسا ہی کام دیا گیا تھا۔ کام
تقسیم کرتے وقت اِن باتوں کا خیال رکھا جائے تو بہت سہولت
رہتی ہے۔ اور نقل مطابق اصل ہو جاتی ہے
حیدر آباد کے ایک مشہور قوال ہیں "علی بخش، لوگ

انھیں واعظ قوال کہتے ہیں ایک ہی بات کو مختلف زبانوں کے شعروں میں کہتے ہیں کبھی گا کر کبھی سادہ انداز میں لیکن اس میں بھی اُتار چڑھاؤ رہتا ہے بالآخر بات اُسی دُھن پر آ کر رُکتی ہے جس دُھن میں مضمون شروع کیا تھا ان کی نقل لڑکوں کے مجمع میں تو پیش خوب کر لیتا تھا لیکن بڑوں کے تقاضے سے اس ڈرامے کے کھیلے جاتے وقت یہ نقل کرنی پڑی۔ علی بخش صاحب کے پاس ستار رہتا ہے۔ میرے پاس ہاکی اسٹک تھی سُروں کا کام ناک سے لیتا تھا

لوگوں نے کہا اب تو استادوں کو بھی خاموش نہ رہنا چاہیئے ایک سال ہوا پروفیسر وہاج الدین صاحب نے استادوں کے لئے ایک اچھا سا ڈراما لکھا تھا۔ "لکاح بالجبر" پروفیسر محمد مجیب صاحب نے استادوں کو راضی کر لیا۔ خود بھی اس ڈرامے میں کام کیا اوروں کو بھی سکھلایا۔ خود تو "جوتشی" بنے تھے۔ مجھے "مرزا نوشہ" بنایا۔ نیازی صاحب میرے داماد بنے تھے اور کریم اللہ صاحب برادر نسبتی۔ علیم صاحب ارسطو کے شاگرد علامہ خجندی بنے تھے۔ کلیہ سے بھی دو لڑکے لئے تھے۔ انور خاں صاحب کو حکیم پیلچی اور نصیر صاحب کو جعفر کا کام دیا گیا تھا۔ بیوی شروع سے

آخر تک پردے میں رہی۔ اس لئے عورت کی نقل کا جھگڑا
نہ رہا۔ مجیب صاحب اداکاروں کے سجانے (میک اپ)
میں کمال رکھتے ہیں۔ انتخاب اچھا تھا۔ لوگ دیکھتے ہی رہے
علیم صاحب نے عربی میں بی۔ اے کیا تھا۔ عربی قاعدے کے
مطابق لفظوں کو ٹھیک ٹھیک بولنے کا ملکہ تھا۔ پارٹ خاصا
طویل تھا۔ خوب یاد کیا تھا۔ نقل اس بات کی تھی کہ کوئی شخص
بحث میں ان کے سامنے غلط لفظ بولے تو یہ اُس کی خبر لیتے
تھے۔ چنانچہ ایک شخص نے گفتگو میں "ٹوپی کی شکل" کی بجائے
"ٹوپی کی صوُرت" کہہ دیا یعنی "شکل" کی بجائے "صوُرت" کا
لفظ استعمال کیا۔ اس پر زور زور سے کہنے لگے

عُاصی کا دعوٰی ہے کہ ہم کو ٹوپی کے لئے "شکل" کا لفظ
استعمال کرنا چاہیئے نہ کہ "صوُرت" کا۔ صورت اور شکل میں یہ
فرق ہے کہ صوُرت کا لفظ ذوالحیات کے اجسام کے لئے (یعنی
جانداروں کے لئے) اور شکل کا لفظ غیر ذی روُح اشیا رکی
ہئیت خارجی کے لئے (یعنی بے جان کے لئے) استعمال ہوتا
ہے۔ اور چونکہ ٹوپی جوہر حیات سے معرٰی ہے۔ (یعنی
بے جان) ہے لہذا واجب آیا کہ ہم ٹوپی کی شکل کہیں نہ کہ

ٹوپی کی صورت ــــــ" اتنے میں وہ شخص بھاگ گیا یہ دروازے کی طرف رخ کرکے کہنے لگے

اے جاہل مطلق شخص یاد رکھ کہ تجھے یہ لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا یہ لفظ ــــ یہ خود ارسطا طالیس کے الفاظ ہیں۔ ارسطا طالیس کے ــــ تو اگر چاہے تو اس کی تصنیف "المقالات فی الصفات الاشیاء" میں بعینہٖ یہی الفاظ بتلا سکتا ہوں غرض یہ کہ اِس دن کے ہیرو دراصل یہی تھے

کریم اللہ صاحب کے ذمہ ایک جگہ مجھے سزا دینے کا کام تھا۔ یہ چھوٹا سا اور آسان پارٹ انھوں نے اس لئے لیا تھا کہ مجھے تنگ کریں۔ تھے بھی پہلوان۔ میں نے مجیب صاحب سے کہا کہ کریم اللہ صاحب مجھے سچ مچ سزا دیتے ہیں۔ اس حصہ کی مشق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں سیکھنے سکھانے کی کونسی بات ہے۔ کریم اللہ صاحب کہتے "یہ پارٹ میں اِسی صورت میں کروں گا جبکہ اس کی مشق بھی ہوا کرے" ڈرامہ کے دن تو غضب ہوگیا۔ سچ مچ مجھے مارنے لگے۔ میں چپکے سے کہتا بھی کہ چوٹ لگ رہی ہے مگر یہ مانتے نہیں تھے۔ تماشائی تھے کہ لوٹ پوٹ کر ہنس رہے تھے۔ میں اسٹیج سے بھاگ بھی

نہیں سکتا تھا۔ مجیب صاحب اندر سے آواز دے رہے تھے
"اگلا کام جاری رکھئے۔ اگلا کام ــــــ" یہ حضرت بڑی مشکل
سے آگے بڑھے کچھ اور بیان کروں تو بات لمبی ہو جاتی ہے۔
اس سال تمہارے ساتھیوں نے جو ڈرامے کھیلے ان کا تو ذکر
ہی نہیں آیا ہے

پچھلے سال یہ کام جو ہوا تو پہلے سے کسی سوچے ہوئے
پروگرام کے مطابق نہ تھا اور ہوتا بھی کیسے! جب ایک چیز
چل پڑے تب اس کے لئے قاعدے قانون بنانے اچھے
معلوم ہوتے ہیں۔ اور کاموں کا ہرج نہ ہونے کے لئے
اتالیق صاحبان سے مل کر یہ طے کیا کہ ڈرامے سال بھر میں
صرف دو ہوں گے ایک تو "یوم تاسیس" پر دوسرے "عید"
پر۔ چنانچہ اس سال بچّوں نے ان ہی دو موقعوں پر صرف
دو ڈرامے کھیلے۔ یہ بیچ میں کُلّیہ کے طلبا اور استادوں کے
ڈرامہ کا ذکر نکل آیا تھا۔ آؤ اب ساتھیوں کے ڈراموں کو
دیکھیں

بہت چھوٹے بچے یعنی تیسری اور چوتھی جماعت والوں
نے کہا کہ ایک ڈراما ایسا بھی کروائیے جس میں ہم ہی ہم ہوں۔

اِس مطلب کے لیئے غلام عباس صاحب کا لکھا ہوا ڈراما "گُڑیا کی گُڑیا" بہت موزوں تھا۔ اِس میں کام کرنے ولے دو بچیاں اور ایک بچہ ہے۔ ایک بچی جس کی عمر سات سال کی ہو گی۔ اپنی سہیلی کو گڑیوں کا گھر دکھانے کے لیئے چائے پر بلاتی ہے اِس کا چھوٹا بھائی (عمر چھ سال) دعوت کی چیزیں ہضم کرنے کے لئے طرح طرح سے پریشان کرتا ہے اِسی دوران میں بہن کو ایک ترکیب سوجھتی ہے۔ وہ بھائی کو کل پُرزوں کے ذریعہ چلنے والی گُڑیا بنالیتی ہے۔ سہیلی کے آنے پر یہ زندہ گُڑیا طرح طرح کے کھیل تماشے دکھاتی ہے چائے کا سامان، گُڑیوں کا پٹارہ، ایک پردہ اور صرف تین بچّوں کے ذریعہ یہ تمثیل نہ صرف مدرسے بلکہ گھروں میں آسانی سے کھیلی جاسکتی ہے۔ زبان میں مٹھاس ہے چھوٹے چھوٹے جُملے ہیں۔ اِس عمر میں بچے جس طرح بولتے اور اپنی ادائیں دکھاتے ہیں اِسی انداز میں لکھا ہے بڑی خوبی یہ ہے کہ نری گفتگو ہی نہیں ہے اداکار کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے بولتے ہیں اس لیئے اور بھی لطف آتا ہے۔ میں ہر سال کسی نہ کسی جماعت میں اِسے سُناتا ہوں سُننے اور سُنانے

والوں میں سے کوئی بھی نہیں اُکتاتا ہے (اگر تمھیں یاد ہو تو
اس کتاب کی تمہید میں بھی اس کا ذکر کیا ہے) وہ بچے جو ڈراما
کا مطلب اور اس کے کھیلنے کا طریقہ نہ جانتے ہوں اگر اس کو
اِن کے سامنے کوئی ٹھیک سے پڑھ کر سنائے تو نہ صرف بات
سمجھ میں آجائے گی بلکہ جی چاہے گا کہ اِسے کھیل ہی لیں۔ ہمارے
مدرسہ میں لڑکیاں نہ ہونے کی وجہ سے میں نے یہ ڈراما "سہیلیوں"
کی جگہ "دوست" فرض کرکے تاسیس کے موقع پر کرایا تھا۔ گڑیوں کا
کھیل چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں سب ہی کھیلتے ہیں اِس لئے اِس
تبدیلی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ میاں مسعود (جنھوں نے حال میں
مسعود حسین خاں صاحب کے نام سے ایم۔اے کا امتحان
کامیاب کیا ہے) زندہ گڑیا بنے تھے۔ نگینہ کے شاہد (سنا ہے
کہ اب شادی ہوگئی ہے) مسعود کے بڑے بھائی اور قائم گنج
کے شفیق شاہد کے دوست بنے تھے

اِس ڈرامہ میں اُس وقت بڑا ہی مزا آیا جب مسعود
کے بھائی نے اِن کے چہرے پر رنگ کے نشان لگا، گڑیا کا
لباس پہنا کر پردے کے پیچھے چھپا دیا تاکہ آنے والے مہمان
کے سامنے گڑیا کے طور پر پیش کر سکے۔ دوست نے دروازہ

کھٹکھٹایا۔ اِس پر مسعود پردے کے پیچھے سے بولے
"یہ نہیں میرے بس کی بات مجھے بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے!"
مسعود کے بھائی نے کہا
"نادیدے مہمان آرہے ہیں ذرا دیر کے لئے چُپ رہو۔ اچھا نکالو
باہر اپنا ہاتھ" مسعود نے اپنا ہاتھ باہر کیا بھائی نے ہتیلی پر بتاشے رکھ دیے
تب جاکر یہ خاموش ہوئے
دوسرا ڈراما "اسکول کی زندگی" عید کے موقع پر کھیلا گیا تھا یہ
جس وقت میٹرک میں پڑھ رہا تھا (NAGNATHAN AT SCHOOL) نامی کتاب
نصاب میں تھی اسی کے پلاٹ سے یہ ڈراما تیار کیا تھا۔ بھولے ناگناتھن کا
کام عرفان نے (جواب ایم۔اے ہوگئے ہیں)۔ دو شریر لڑکوں کا کام قائم گنج
کے سراج اور سعد انصاری صاحب کے بھائی شعیب نے کیا تھا۔ طیب بھائی
نے کیلاٹ صاحب کی، نبی احمد نے ڈاکیہ کی نقل خوب اتاری تھی
ڈراموں کا یہ کام پُرانا ہوتا جارہا تھا میں نے سوچا کہ اب کسی نئی چیز کی طرف توجہ
کرنی چاہیئے۔ اس دفعہ پڑھنے پڑھانے کے طریقوں کی طرف دھیان دینا شروع
کیا یہ چیز مجھے پسند نہ آئی کہ ایک اُستاد مختلف جماعتوں کو پڑھا رہا ہے کسی کی اُردو ہے
تو کسی کا حساب کہیں تاریخ تو کہیں جغرافیہ۔ گھنٹہ بجتے ہی ایک صاحب سر پر سوار ہیں،
کیوں صاحب!! اس لئے کہ گھنٹہ بج گیا ہے۔ جماعت خالی کر دیجئے۔ اب سوچو

کہ ایک کام میں دلچسپی بڑھ گئی ہے لڑکے اور اُستاد دونوں
چاہتے ہیں کہ یہی کام جاری رہے مگر اس انتظام میں سارا
مزا کرکرہ ہو جاتا ہے۔ میں نے شیخ الجامعہ صاحب کو درخواست
دی کہ میرے ذمہ صرف ایک جماعت کے سارے گھنٹے
کر دیجیے۔ یہ بھی خیال تھا کہ اس تجربہ کو پہلی جماعت سے شروع
کروں مجھے یہ جماعت مل گئی۔ بڑی خوشی ہوئی کہ اب گھنٹیوں کا
جھگڑا جاتا رہے گا۔ کام کرتے کرتے تھک جائیں گے تو تھوڑی
دیر سیر کر لیا کریں گے۔ ایک درخواست اس مطلب کی بھی دی
کہ اُستادوں کی انجمن میں پڑھانے کے طریقوں پر بات چیت
ہوا کرے اور باری باری سے ہر ایک استاد نمونے کے
سبق پڑھا کر دکھائیں۔ ہمارے شیخ الجامعہ ذاکر صاحب
ہیں بڑے سمجھدار آدمی اُنھوں نے سوچا کہ اِس کا شوق تو
رُکے گا نہیں۔ معلوم نہیں یہ اُستادوں کی انجمن میں کیا کیا
"گڑبڑ" کرے اِس کام کے لئے کچھ اور لائق ہونے کی
ضرورت ہے اُنھوں نے دو باتوں کا انتظام کر دیا۔
ایک تو فوراً ہی ایک اقامت گاہ (شوکت منزل جس کے
اتالیق پہلے سے اختر حسن صاحب تھے) کا اتالیق بنا دیا

دوسرے پڑھانے کے طریقوں کی نئی نئی باتیں معلوم کرنے کے لئے موگا بھیجنے کا انتظام کر دیا لیکن موگا چلنے سے پہلے آؤ جامعہ کی کچھ اور سیر کرتے چلیں

یہ پہلا سال تھا کہ "یوم تاسیس" منانے کے سلسلے میں ہر ایک جماعت سے تعلیمی کام لیا گیا۔ ذاکر صاحب نے ایک مہینہ پہلے استادوں سے بات چیت کر کے اپنی تجویزیں ان کے سامنے رکھ دی تھیں۔ وہ یہ کہ

۱۔ ہر ایک جماعت لکھنے پڑھنے سے متعلق کوئی چیز تیار کر کے جامعہ کو تحفہ کے طور پر دے۔ ایک جماعت کئی چیزیں دے سکتی ہے

۲۔ جلسہ کے دن ان سب تحفوں کی نمائش کی جائے تاکہ ایک دوسرے کے کام سے لڑکے اور مہمان واقف ہو جائیں

۳۔ ایک طرف مکتبہ والے بھی صرف جامعہ کی چھاپی ہوئی کتابیں سجائیں

۴۔ اور لڑکوں کو مشغول رکھنے کے لئے ایک ڈراما کھیلا جائے

۵۔ پیام تعلیم والے خاص نمبر نکالیں جس میں زیادہ تر

جامعہ کے اُستاد اور لڑکوں کے مضامین ہوں

"اندھا کیا چاہتا ہے۔ دو آنکھیں!" جب لڑکوں کو معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا عید کی تیاریاں ہو رہی ہیں کچھ کرنے کی خوشی میں پہلے سے زیادہ پڑھا لکھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ لکھنے پڑھنے کا شوق بڑھتا ہی گیا جماعتوں میں بے رونقی نہ رہی۔ کھلنڈرے لڑکوں کی تو بن آئی۔ دوڑ دوڑ کر کام کرتے تھے۔ شاید تم یہ پوچھو گے کہ آخر وہ کون سے کام ہیں جو لکھنے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور مزہ یہ کہ کھلنڈرے لڑکے بھی پسند کرتے ہیں تو اس کی تفصیل بھی سُن لو لیکن چھپانے کی بات نہیں یہ کام زیادہ تر بڑے لڑکے یعنی ثانوی اور کُلیہ والوں کا تھا۔ چلانے کو تو یہ کام ذاکر صاحب نے چلا دیا لیکن وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ اُس وقت پائیدار رہے گا جبکہ اس کی بنیادیں مضبوط ہوں یعنی ابتدائی مدرسہ کو بہتر بنائیں سوچا بھی ٹھیک کیونکہ ثانوی اور کُلیہ میں پڑھنے والے پہلے ابتدائی منزل سے گزرتے ہیں اگر اس منزل میں ٹھیک سے کام کر لیا تو آگے چل کر سہولت رہتی ہے۔ جامعہ کے اُستادوں کی یہ آرزو گیارھویں سال سے پھلنے پھولنے لگی اس کا ذکر تو اپنے وقت پر آئے گا

اِس وقت ۱۹۲۸ء کے اِس "یوم تاسیس" کے کام کو سمجھ لو
تاریخ اور جغرافیہ میں مسلمانوں کی حکومتوں کے نئے اور
پُرانے نقشے، سکندر کا ہندوستان پر حملہ، سکندر اور پورس کی جنگ
اشوک کی سلطنت کے نقشے بنوائے گئے۔ لال قلعہ (دہلی) کی
چیزیں دِکھلا کر مضمون لکھوایا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی میں جو
پُرانی درسگاہیں رہ گئیں یا جو نئی قائم ہوئیں ان کا حال گھوم
پھر کر دیکھنے کے بعد لکھا گیا۔ اسلامیات والوں نے مشہور حدیثیں
جمع کیں آنحضرتؐ کے آخری خطبہ کو بہت خوش خط لکھوا کر
آویزاں کیا۔ اُردو والوں نے اِس زبان کے پانچ مشہور لکھنے
والوں (جو عناصر خمسہ کہلاتے ہیں) کے حالات لکھے اور ان کی
تصویریں بنائیں سائنس والوں نے کام کے چارٹ بنائے
منشی علی محمد خاں صاحب (مرحوم) ہندوستان کے بہترین
خوش خطی لکھنے والوں میں سے تھے آپ کا تعلق شروع سے
آخر تک جامعہ ہی سے رہا۔ لڑکوں نے آپ کی نگرانی میں
اچھے اچھے کتبے اور قطعات (یعنی چند ایک منتخب شعر
خوش خط لکھے ہوئے) تیار کیے۔ ڈرائنگ والوں کی تو بن آئی
تھی جو لڑکے ڈرائنگ اچھی جانتے تھے وہ تو آرٹسٹ بنے

ہوئے تھے (اور سچ بھی ہے ان میں سے کئی لڑکے مثلاً طاہر علی مسعود اختر، ضمیر الدین اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر یہی کام کر رہے ہیں) اسلامی ملکوں کے بڑے بڑے رہنما، ہندوستان کے مشہور لوگوں کی منہ بولتی تصویریں بنائی تھیں شعبہ نجاری نے تو اس سجاوٹ میں چار چاند لگا دئے۔ لکڑی کی خوبصورت ڈھال (شیلڈ) کے چاروں طرف نقاشی اور بیچ میں جامعہ کی مُہر کندہ کرکے رنگ و روغن کر دیا تھا۔ لکڑی کا کچھ اور سامان بھی تیار کیا تھا

کرایے کی عمارتوں میں بھلا خوبصورت ہال کہاں سے لاتے صحن میں شامیانے لگا کر سب چیزیں سجائی تھیں ایک طرف جلسے کا انتظام تھا۔ مشہور لوگوں میں سے کون نہیں تھا، ڈاکٹر انصاری مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمدؐ علی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے، سری نواس آئنگر ستیہ مورتی، این سی کیلکر، مولانا ظفر الملک، مسز اینی بیسنٹ مسٹر آصف علی، سب ہی تھے

پہلے تو دسویں جماعت تک کے طلبا، کا تقریری مقابلہ ہوا، پھر پنڈت مدن موہن مالویہ نے قومی جھنڈا لہرایا۔ جوں ہی

جھنڈا لہرایا گیا، لڑکوں نے قومی ترانہ گایا، جلسہ کے صدر
ڈاکٹر انصاری تھے کیونکہ حکیم صاحب مرحوم کی وفات کے بعد
آپ ہی امیر جامعہ ہوئے تھے "اجمل یادگار فنڈ" میں بہت سستی
کے ساتھ چندہ جمع ہو رہا تھا یہ سال استادوں نے بڑی مشکلوں
سے گزارا۔ کسی کی ظاہری حالت سے اس کے متعلق سب کچھ
خیال کر لینا ٹھیک نہیں ہے یہ ساری دھوم دھام لڑکوں کی
تعلیمی حالت بہتر بنانے کے لئے ہو رہی تھی ورنہ اس زمانے
میں جامعہ کی مالی حالت انتہائی حد تک خراب ہو گئی تھی
(اور بھائی مشکلیں تو اب بھی ختم نہیں ہوئی ہیں) قوم کے رہنما
تعلیم کی طرف سے غافل تھے اس کی ایک مثال یوں بھی سمجھو
کہ چند مالی قوم کی بھلائی کے لئے مصیبتیں اٹھا کر باغ کے پودوں
کو سینچ رہے ہوں قوم سیر کرتی ہوئی ادھر آ نکلے اور پوچھے بھی
نہیں کہ حال کیسا ہے تو اس وقت مالی جو کچھ کہے اس کا کہا
برا نہیں لگتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب نے اپنے ساتھی مالیوں کا
کام دکھانے کے بعد بعض کڑوی باتیں اس انداز سے کہیں
کہ لوگوں نے اپنی غلطی تسلیم کی ڈاکٹر صاحب نے فرمایا
"جامعہ ملیہ ایک خاندان کی طرح ہے استاد لڑکوں کے

ساتھ وہی برتاؤ کرتے ہیں جس طرح خاندان کے لوگ اپنے عزیزوں سے کرتے ہیں۔ گذشتہ سال اس خاندان پر ایک بڑی مصیبت آئی وہ یہ کہ اس خاندان کا سرپرست مرگیا یعنی حکیم اجمل خاں مرحوم کا سایہ ہمارے سر سے اُٹھ گیا اِن کے اِس انتقال سے ہمیں جتنا صدمہ ہونا چاہیئے تھا اس کا اندازہ آپ کرسکتے ہیں، ہم بہت مشکلوں میں ہیں، حکیم صاحب باوجود اپنی ذاتی مصروفیتوں اور قومی و ملکی کاموں کے اتنا وقت پھر بھی نکال لیتے تھے کہ بلّی ماران سے چل کر قرول باغ آئیں اور جامعہ کے چھوٹے بچوں سے باتیں کرنے میں اپنے قیمتی وقت کا ایک حصّہ صرف کریں

ہمارے ہندوستانی رہنماؤں میں حکیم صاحب ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھیں ہندوستان کی ایک بڑی تعداد سے وہ ذاتی اور شخصی تعلقات تھے جو غالباً اور کسی کو حاصل نہیں ہیں لیکن باوجود ان تعلقات کے اِس قوم نے اُن کی یادگار قائم رکھنے کے لیے کوئی سرگرمی نہیں دکھلائی اِس میں کچھ مانگنے والوں کا بھی قصور ہے۔ تعلیم کا یہ پیشہ جتنا معزز تھا اتنا ہی ذلیل ہوگیا ہے ایک زمانہ تھا جب تعلیم گاہ کے لئے چندہ دینا فخر

سمجھا جاتا تھا لیکن ہماری گداگری نے اس پیشے کو ذلیل و رسوا کر دیا ہے اب ہم نے خود اپنے گریبان میں منہ ڈالا اور یہ عہد کیا ہے کہ چاہے جتنی تکلیفیں اُٹھانی پڑیں اس یادگار کو قائم رکھیں گے تاآنکہ قوم خود ہی اس کی طرف توجہ کرے۔ اس مقصد کے لئے "انجمن تعلیم ملی" کے نام سے ایک جماعت بنائی ہے جس میں یہ شرط رکھی ہے کہ کوئی شخص ایک سو پچاس روپئے ماہوار سے زیادہ کسی حالت میں نہ لے گا اور اس کا کوئی رکن چھہتر روپے سے زیادہ نہیں لے رہا ہے

روپئے دو ہی طرح سے وصول ہوتے ہیں ایک ٹیکس سے دوسرے نذر سے ہم سمجھتے ہیں کہ اپنے کام سے ہم اپنے کو اس بات کا مستحق بنائیں گے کہ قوم ہمیں نذر دے ممکن ہے آپ لوگوں کو میری یہ باتیں غرور سے بھری ہوئی معلوم ہوں لیکن میں بہت خاکسار واقع ہوا ہوں اور اس وقت ایسا کہنے پر مجبور ہوں امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے"

ایک طرف تو ذاکر صاحب نے ایسی تقریر کی اور دوسری طرف جلسہ ختم ہونے کے بعد جب چائے کا وقت آیا تو بڑی محبت کے ساتھ لوگوں کو چائے پلانے لگے اور کیوں نہ پلائیں اپنوں سے

گلا بھی ہوتا ہے اور محبت بھی۔ دنیا کا دستور ہی یہ ہے ڈاکٹر صاحب موقع و محل کے لحاظ سے بات ہی ایسی کرتے ہیں کہ دل میں اُتر جاتی ہے۔ مدرسہ میں مختلف موقعوں پر مثلاً "الوداعی دعوت" "انجمن اتحاد کی مسند نشینی" مدرسہ کے جلسوں میں جو خاص خاص تقریریں کرتے ہیں وہ سب تمھیں اس کتاب میں کہیں نہ کہیں نظر آئیں گی

رات کے وقت استادوں اور لڑکوں نے دو ڈرامے کھیلے اُن کا ذکر اسی سال کی کہانی میں ڈراموں کے سلسلے میں آچکا ہے:
کچھ عرصہ ہوا حافظ فیاض احمد صاحب کی نگرانی میں جامعہ کی ایک شاخ شہر میں قائم ہو چکی تھی۔ رسالہ ہونہار کے مُدیر فیاض حسین صاحب جامعی کی صدر مُدرسی میں یہ مدرسہ ترقی کر رہا تھا۔ یہاں کے لڑکوں نے "معلومات عامہ" کا البم پیش کیا اور مہمانوں کے سامنے "مبارک باد" کا کھیل دکھایا ان کے ہاتھوں میں "گتے" کے ٹکڑے تھے ان سے "مبارک باد" کا لفظ طرح طرح کی ورزش کرنے سے بنتا تھا

مالی حالت کے خراب ہونے کی وجہ سے وظیفہ پانے والے خوددار طالب علموں نے تہیہ کیا تھا کہ چھوٹے موٹے کسی نہ کسی

کام کو انجام دے کر فیس کا ایک حصہ ادا کریں گے اس مطلب کے لیے "انجمن کا سپن" کی بنا رڈالی۔ ولایت کی بعض مشہور درسگاہوں میں بھی ایسا ہی انتظام ہے دوسروں کے محتاج ہو کر تعلیم پانے میں کوئی نہ کوئی اندیشہ لگا رہتا ہے کچھ نہ کچھ کماتے رہنے سے اور چیزوں کی طرح اس کا شوق بھی بڑھتا رہتا ہے

گاندھی جی نے اپنے پوتے "رسیک لال" کو تعلیم دلانے کے لئے جامعہ بھیجا تھا جب ان کا انتقال ہوا تو گاندھی جی جامعہ میں تشریف لائے۔ لڑکوں کو دیکھ کر کہنے لگے

"میرا غم دور کرنے کے لئے یہ بچے بہت ہیں"

رسیک لال بڑا بھولا ہنس مکھ اور فرمانبردار بچہ تھا ساتھیوں سے میل ملاپ اور محبت تھی۔ کاموں میں خوشی خوشی حصہ لینا اس بچے کی خصوصیت تھی اگر زندگی نے وفا کی ہوتی تو یہ جامعہ کے نمونے کے طالب علم بن کر نکلتے۔ انور خاں صاحب (ایک طالبعلم جن کا ذکر آٹھویں سال کی کہانی میں آچکا ہے) نے بھی تیمارداری کا حق ادا کر دیا تھا

گاندھی جی جب بھی دہلی تشریف لاتے ہیں جامعہ کے

بارے میں بات چیت کرتے ہیں آپ کہا کرتے ہیں کہ "جامعہ کو مسلمانوں کا صحیح نمونہ ہونا چاہیئے۔ اگر غیر مسلم کو اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنی ہوں تو وہ سب جامعہ میں ملنی چاہیئیں"

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اس دفعہ ایک ہفتہ تک جامعہ میں رہے آپ نے انجمن اتحاد میں "مذہب کی حقیقت" پر تین خطبے دیئے۔ جامعہ اور ندوہ کے تعلقات کو مضبوط بنانے کے لئے طلبار اور اساتذہ میں علیحدہ سے تقریریں کیں آپ نے بھی اپنے فرزند "سُہیل" کو تعلیم پانے کے لئے جامعہ بھیجا تھا اگر جامعہ کے بڑے لڑکے مذہب کے بارے میں غلطی کریں تو آپ خاص طور پر توجہ دلایا کرتے ہیں۔ اچھی نیت اور محبت کے ساتھ سمجھانے والوں سے جامعہ کے کاموں میں مدد ہی ملتی ہے

ذاکر صاحب نے تاسیس کے موقع پر جو تقریر کی تھی اس کا اثر ہوا مختلف صوبوں سے دعوت آئی کہ چندہ کرنے کے لئے وفد بھیجے جائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری مولانا محمدؐ علی ڈاکٹر ذاکر صاحب اور جامعہ کے اُستادوں نے

کئی صوبوں کے دورے کئے۔ مدراس میں سیٹھ جمال محمد صاحب مرحوم کی توجہ سے کافی روپئے جمع ہوگئے تھے۔ اس صوبے میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لئے سیٹھ صاحب مرحوم اپنے خرچ سے ایک مدرسہ چلا رہے تھے پھر بھی آپ نے جامعہ کی طرف توجہ کی اور جامعہ ہی پر کیا منحصر ہے جس کسی نے بھی مسلمانوں کی بہتری کے کسی کام کے لئے چندہ مانگا سیٹھ صاحب نے فراخ دلی کے ساتھ ہاتھ بڑھایا۔ اب بھی لاکھوں مالدار مسلمان ایسے ہیں جن کی ذرا سی توجہ سے مسلمانوں کے بڑے سے بڑے کام نکل سکتے ہیں

اسی سال کے آخر میں پڑھانے کے نئے طریقے معلوم کرنے کے لئے میں موگا چلا گیا

ولایت کے مالدار عیسائیوں نے ہندوستان کے عیسائیوں کی تعلیمی حالت بہتر بنانے کے لئے ہندوستان میں کئی مدرسے کھول رکھے ہیں ان میں سے امریکہ کی انجمن (A.P. MISSION) کا ایک مدرسہ تحصیل موگا ضلع فیروز پور پنجاب میں ہے

ان مدرسوں کی ایک خاص خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ کم سے کم خرچ سے چلائے جاتے ہیں اور لڑکوں میں اپنی

روزی آپ کما کر تعلیم جاری رکھنے کا چسکا لگایا جاتا ہے
اس مقصد کے لیے زیادہ تر کھیتی باڑی سے کام لیتے ہیں،
ہمارے یتیم خانوں کا انتظام کچھ اور ہی ہوتا ہے، سڑکوں پر
لڑکوں کی قطاریں کسی امیر کے ہاں دعوت کھانے یا صدقہ
لینے کے لیے جاتی ہوئی نظر آتی ہیں مجھے اس منظر کو دیکھ کر
تکلیف ہوتی ہے، کاش ہم عیسائیوں کے اُن مدرسوں کو سمجھنے
کی کوشش کریں جہاں نیچی ذات کے مفلس لڑکوں کو تعلیم
دینے کا انتظام ہے، ہمارے یتیم خانوں کے لڑکوں کے
چہروں پر ایک افسردگی اور مستقل ذلت کا احساس نظر
آئے گا مگر ان عیسائی مدرسوں کے لڑکوں کو آپ چاق چوبند
خوش و خرم پائیں گے، انھیں کام اور تعلیم دونوں میں دلچسپی
لیتے ہوئے پائیں گے اُن کے بشاش چہرے، چمکدار آنکھوں
سے مفلسی کا گمان نہ ہوگا

موگا میں دو طرح کے لڑکے تعلیم پاتے ہیں ایک تو
پہلی جماعت سے آٹھویں جماعت تک کے دوسرے "کچے
اُستاد" یعنی وہ لوگ جو یہ معلوم کرنا چاہیں کہ لڑکوں کو کس طرح
پڑھاتے ہیں۔ ایسے "اُستادوں کا مدرسہ" یا انگریزی میں

"ٹریننگ اسکول" کہتے ہیں۔ جو مدرسے کسی خاص کام کو کر رہے ہوں اور بہت مشہور ہوں وہ چھوٹے سے نام سے پہچان لئے جاتے ہیں مثلاً "علی گڑھ کا مدرسہ" "جامعہ عثمانیہ" "جامعہ" اسی طرح یہ مدرسہ "موگا کا مدرسہ" کے نام سے مشہور ہے یہ مدرسہ کیوں مشہور ہے یہ بات اگلے سال کی کہانی سے معلوم ہو جائے گی

دسواں سال

اگست ۱۹۲۹ء سے جولائی ۱۹۳۰ء

داخلے کے وقت شیخ الجامعہ صاحب مدرسے کے ہر ایک لڑکے کو اپنے قریب بٹھا کر تین باتیں محبت سے سمجھایا کرتے ہیں۔ ایک تو ظاہری صفائی یعنی بدن اور کپڑے صاف رکھنا دوسرے باطنی صفائی یعنی سچ بولنا۔ تیسرے کسی کے ڈر سے اپنے دل کی بات نہ چھپاتا۔ سمجھاتے وقت تو یہ باتیں اہم معلوم نہیں ہوتی ہیں لیکن مدرسہ اور اقامت گاہ میں ان چیزوں سے بار بار واسطہ پڑتا ہے اس لیئے یہ باتیں اس وقت یاد آتی ہیں۔ جب میں موگا پہنچا تو داخلے کے وقت وہاں بھی مسٹر ہارپر (پرنسپل)، فرمانے لگے

"یہاں سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے——— اگر کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہر چیز میں کوئی نہ کوئی بات نظر آئے گی اور ارادہ یہ ہے کہ کسی طرح سال گزر جائے تو اچھی چیزیں بھی نظر سے چھپی رہیں گی اور زیادہ تر شکایت ہی کرتے سنائی دوگے" پھر کچھ ٹھہر کر فرمایا

"کام کرتے وقت اس بات کی طرف کبھی کبھی دھیان دینا اگر ٹھیک معلوم نہ ہو تو اس بارے میں ہم ایک دفعہ پھر بات چیت کریں گے"

مسٹر ہارپر لڑکوں کی غلطی کو مار پیٹ کر ٹھیک نہیں کرتے ہیں ان کا ڈھنگ ہی سب سے نرالا ہے جہاں کوئی غلطی نظر آئی یہ سب میں شور کرتے پھریں گے "لڑکو لڑکو غضب ہوگیا۔ عجیب وغریب بات سنوگے!" اس غلطی کو نمک مرچ لگا کر بیان کریں گے کہانی کی طرح سنائیں گے ہوسکے تو لطیفہ بنالیں گے اور کچھ نہیں تو سوچ میں پڑ جائیں گے جب سننے والے لڑکے بہت خوشامد کریں تب سنائیں گے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو تین لڑکے آگے آگے اور یہ پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے شامت اعمال ان میں سے کسی

لڑکے نے کاغذ بکھیر دئے یہ پیچھے سے چلّائے

"سُننا بھائی سُننا بھائی" جُوں ہی لڑکے پیچھے مُڑے کاغذ کے دو تین پُرزوں کو پتلون کی جیب میں رکھ لیا اور کہنے لگے

"او ہو میری کمر دُکھ گئی ہے بڑی مہربانی ہوگی اگر اِن پُرزوں کو میری جیب میں رکھ دو"

جس لڑکے نے کاغذ گرائے وہ شرمندگی سے چُپ کھڑا تھا اس کا ساتھی پُرزے بینتے ہوئے کہنے لگا

"صاحب جانے دیجئے یہ آئندہ سے ایسی غلطی نہیں کریں گے"

مگر غلطی کرنے والا چُپ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آئندہ بھی ایسا ہی کرے گا؟"

تب اس شرمندہ لڑکے نے آہستہ سے کہا "نہیں کروں گا"

اس پر مسٹر ہار پر پھر چونک کر بولے

"دیکھو دیکھو اُلٹے یہ کہتے ہیں استاد نے جو کام دیا ہے وہ نہیں کروں گا"

لڑکے نے جواب دیا "آئندہ سے کاغذ نہیں گراؤں گا"

"مگر یہ بات یاد رکھنے کے لئے کچھ ہونا چاہئے۔ بھول

جاؤ گے ہاں تو آپ لوگ مہربانی کرکے میرے ساتھ آیئے"
ان لڑکوں کو ایسی جگہ لے گئے جہاں کاغذ پڑے ہوئے
تھے پھر اس غلطی کرنے والے لڑکے سے یہ کاغذ اُٹھوائے - یہ
واقعہ اقامت گاہ کا تھا۔ مدرسے کے وقت اسی جماعت میں
آئے جس میں کاغذ بکھیرنے والا لڑکا بیٹھا تھا کہنے لگے
"ایک بڑی دلچسپ کہانی ملی ہے" جماعت کے سب لڑکے
چونک پڑے - ایک لڑکے نے کہا
"آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ اس کہانی کو یہاں
نہ سُنائیں" مسٹر ہارپر منہ بناتے ہوئے (ایک آنکھ میچتے ہوئے)
وہاں سے بھاگ آئے سب لڑکوں نے تالیاں بجا دیں
یہ بات نہیں ہے کہ یہ صرف لڑکوں کی غلطی پر ہی شور
کرتے ہیں اچھی باتوں سے خوش ہو کر انھیں بھی مدرسہ اور
اقامت گاہ میں سُناتے پھرتے ہیں
سب ہی لڑکے چاہتے ہیں کہ اچھی عادتیں پیدا کریں
بس اتنی بات ہے کہ غلطی ہونے پر اگر کوئی شخص اُسی وقت
ٹھیک سے سمجھا دے تو بات یاد رہتی ہے - کیوں ٹھیک ہے نا!
مسٹر ہارپر سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا ہے ابھی دفتر میں ہیں

تھوڑی دیر میں کھیتوں پر پہنچ کر لڑکوں سے گپ شپ کریں گے
پھر جماعت میں آکر کہیں گے

" آج کھیتوں پر بڑی بہار رہے - کام چھوڑنے کو لڑکوں کا
جی نہیں چاہتا ہے میں نے کہہ دیا ہے کہ چھٹے گھنٹے میں پانچویں
جماعت آئے گی کام چھوڑنا ہی پڑے گا"

" جی ہاں بہت ٹھیک کہا۔ شکریہ" سب لڑکے بول پڑیں گے
موگا کے آس پاس چھوٹے چھوٹے مدرسے ہیں ہارپر صاحب
کے پاس ایک موٹر ہے جب کسی کام سے اِن مدرسوں میں جاتے
ہیں چار پانچ لڑکوں کو ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔ شرط یہ ہوتی ہے کہ
لڑکے لوٹ کر اپنی جماعت والوں کو اس کام کے بارے میں کچھ
سمجھائیں یا لکھیں۔ انھیں گھوم پھر کر کام کرنے کا بہت شوق ہے
کہتے ہیں اِس سے سُستی نہیں آتی ہے۔ کھاتے بھی بہت ہیں۔
بیگم صاحبہ گھر میں نہ ہوں تو دوسرے دن کام آنے والی کیک
پیسٹری سب کھا جاتے ہیں دریافت کرنے پر کہتے ہیں

" آج کام بہت کیا تھا اس لئے کھا گیا جس دن کام نہ کروں
بھوکا بھی تو رہتا ہوں"

لڑکوں کے دیکھنے میں تو یہ ایسے ہی ہیں لیکن جب بڑے بڑے

لوگوں کے ساتھ ملتے ہیں یا کسی سرکاری کمیٹی میں بولتے ہیں یا عام جلسوں میں شریک ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بہت بڑا عالم جو خاص طور پر تعلیم کا ماہر ہے بول رہا ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں سنجیدگی وقار کے ساتھ اور سوچ سمجھ کر رائے دیتے ہیں لڑکوں کو خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے پرنسپل صاحب بحث میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے ہیں

رگر جا میں کبھی کبھی وعظ بھی کرتے ہیں ایک دن اتوار کی عبادت میں کہنے لگے

"مسجدوں میں جمع ہو کر مسلمان جس انتظام کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں وہ مجھے بہت پسند ہے۔ نگرانی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے سب لوگ چُپ چاپ منہ ہاتھ دھوتے ہیں جہاں جگہ ملے بیٹھ جاتے ہیں اگر کوئی آگے جانا چاہے تو لوگ خوشی سے راستہ دے دیتے ہیں۔ ہر شخص اپنے آپ خدا کی تعریف میں کچھ کہتا ہے پھر ان کا سردار جو کچھ کہتا ہے وہ خاموشی سے سُنتے ہیں۔ صف بناتے وقت ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ قطار سیدھی رہے۔ بچے الگ سے کھڑے ہو جاتے ہیں آپس میں اشارے سے چُپ رہنے کے لئے کہتے ہیں۔ ان کا سردار جیسا کرتا ہے

وہ بھی ویسا ہی کرتے ہیں پھر اپنی اور لوگوں کی بھلائی کے لئے
دُعا کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ دنیا والوں کے دکھانے کے لئے
نہیں بلکہ غیب پر ایمان لاکر کرتے ہیں مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ کوئی
دیکھنے والا ہے صرف دنیا والوں کی نگرانی میں کام کرنے کی
عادت ڈالیں تو اُس وقت غلطیوں کا اندیشہ رہتا ہے جب
کوئی دیکھنے والا نہ ہو اس لئے ان دیکھے خدا پر ایمان لانا مگر یہ
سمجھتے ہوئے کہ وہ دیکھنے اور سننے والا ہے اِس میں ساری دُنیا
والوں کی بھلائی ہے"

ولایت کے لوگ عام طور پر سورج چڑھنے کے بعد بستر
سے جاگتے ہیں مگر تمھیں یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ ہاربر صاحب ہر
زمانے میں اندھیرے منہ بلکہ پَو پھٹنے سے پہلے اُٹھ کر مدرسہ
کا کام کاج کرتے ہیں۔ مجھے ایک مسئلے پر بات چیت کرنی تھی
کہنے لگے "آپ تو نماز کے عادی ہوں گے"!

میں نے کہا پڑھ تو لیتا ہوں مگر صبح کی نماز بہت پابندی
سے ادا کرتا ہوں اِس پر بڑے زور سے ہاتھ ملایا۔ کہنے لگے
"اُسی وقت تشریف لائیے"

میں نے تعجب سے پوچھا

"کیا آپ جاگتے ہوں گے؟"

کمرے میں جاتے ہوئے جواب دیا" اس بارے میں اسی وقت بات چیت ہوگی"

دوسرے دن میں نے صبح کی نماز معمول سے پہلے پڑھی ہارپر صاحب کے مکان پر پہنچا کیا دیکھتا ہوں کہ کمرہ روشن ہے ہارپر صاحب دفتری کام کر رہے ہیں۔ مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا تھوڑا سا کام اور کیا پھر میری طرف توجہ کی مسئلہ کیا تھا وہی پہلی جماعت کے "قاعدہ" والی بات کہ یہاں جو کچھ بتایا جاتا ہے وہ ٹھیک ہے مگر فلاں فلاں باتوں میں مجھے اختلاف ہے۔ غور سے سنتے رہے مجھے اِن کی دشواریوں کا علم تھا اس لئے اپنی بات پر زیادہ زور نہ دیا اتنے میں صبح کی ورزش کا دوسرا بگل بجا کہنے لگے "آپ میرے ساتھ آئیے آپ کو تماشا دکھاؤں" ہم دونوں تیزی کے ساتھ اقامت گاہ پہنچے، اُستادوں کے مدرسے میں کچھ لڑکے سو رہے تھے ہارپر صاحب نے اُن کی چارپائیاں اُلٹ دیں پھر بولے "تماشا پسند آیا"!

میں نے منہ بنا کر کہا" ممکن ہے کسی دن میری باری بھی آئے اس لئے پسند نہیں ہے"!

"وہ تماشا دوسروں کے لئے ہو جائے گا" فوراً جواب دیا
میں نے آج کی ورزش سے اجازت لے رکھی تھی ہم دونوں
ٹہلتے ہوئے اُدھر ہی پہنچے کہنے لگے" دن میں کوئی نہ کوئی مصروفیت
نکل آتی ہے مہمانوں کا آنا کھیتوں پر لڑکوں کا کام۔ اُستادوں سے
بات چیت۔ قریب کے مدرسوں کا دورہ، اسی لئے اپنا دفتری کام
صبح سویرے نبٹا لیتا ہوں خاموشی رہتی ہے تھوڑے وقت میں
بہت سارا کام ہو جاتا ہے بعض آدمی وقت گزار کر خوش ہوتے
ہیں بعض کام نبٹا کر، ہم لوگ دوسری چیز کو پسند کرتے ہیں اس لئے
نگرانی کا سوال نہیں رہتا ہے پھر یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ
صبح صبح لڑکے ورزش کے لئے جائیں اور میں سوتا رہوں"
ہارپر صاحب جس قسم کا کام کرتے ہیں اس کے لئے پابندیٔ وقت
کا سوال اہمیت نہیں رکھتا ہے پھر بھی عادت قائم رکھنے کے لئے ایک
چیز میں وقت کی پابندی اپنے لئے لازمی کر لی ہے یعنی مدرسہ کی حاضری
میں لڑکوں کے ساتھ دُعا (ترانہ)، میں ضرور شریک ہوتے ہیں۔
کہا کرتے ہیں ایک وقت تو ایسا ہو جس میں سب لوگ ایک جگہ جمع
ہوں۔ مدرسہ کے آداب، مراسم، جلسے، الوداعی دعوتیں، ان
سب چیزوں کی قدر کرتے ہیں ایک خاص بات یہ ہے کہ لڑکوں کا

کوئی کام خواہ معمولی ہی کیوں نہ ہو ان میں اچھی باتیں تلاش کر کے سب پر ظاہر کریں گے

کچھ وقت کے لئے ہماری جماعت کو پڑھایا کرتے تھے تفریح ختم ہونے کے بعد ہی اپنا گھنٹہ رکھا تھا۔ تاکہ اُستادوں کی جماعت کو بھی طرح طرح سے تنگ کرنے کا موقع ملے گھنٹی بجتے ہی جماعت میں داخل ہو جاتے تھے۔ پڑھاتے میں اِس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ بچوں کی باتیں اکثر ٹھیک ہوا کرتی ہیں اگر کوئی اِن کی بات پر دھیان دے تو بہت سارا کام ہو سکتا ہے۔ اِن کے پڑھانے کی جو اصل بات ہے وہ یہاں لکھے دیتا ہوں اس سے اندازہ لگاؤ کہ اُنھوں نے تمھاری حمایت میں جو بات کہی ہے وہ ٹھیک ہے یا یوں ہی تمھیں خوش کرنے کے لئے کہا ہے وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی پڑھانے کے لئے جماعت میں جائے تو یہ دیکھے کہ اِن دِنوں کوئی ایسا کام تو نہیں ہو رہا ہے جسے مدرسہ کے سب لڑکے مل کر انجام دے رہے ہیں مثلاً میلاد النبی کی تیاری اگر ایسا ہے تو لڑکے اِسی کام کو پسند کریں گے کیونکہ وہ اور جماعت والوں سے کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے ہیں اگر کوئی ایسا شغل کام نہ ہو تو لڑکے اس بات کو پسند کریں گے

کہ ان کی جماعت کے لئے کوئی کام ایسا دیا جائے جس میں کوئی چیز نمونے کے طور پر بنا سکیں یا بڑوں کے کسی کام کی نقل کرسکیں مثلاً صابن بنانا، روشنائی تیار کرنا یا ڈاکخانہ کی نقل یا سمندر اور پہاڑوں کے نمونے بناکر ریل اور ہوائی جہاز چلانا وغیرہ۔ یہ سب چیزیں معلومات حاصل کئے بغیر تو ہونے سے رہیں اس لئے نصاب کی کتابیں، کتب خانہ کا استعمال، لوگوں سے پوچھ گچھ ان سب باتوں کے لئے لڑکے تیار ہو جائیں گے۔ پھر یہ موٹی بات کون سا لڑکا نہیں جانتا ہے کہ یہ سب چیزیں لکھنے پڑھنے میں ہوشیار بننے کے لئے ہوتی ہیں اس لئے ہر لڑکا یہ چاہے گا کہ ان کو اپنی کاپیوں میں نوٹ کرلے ان پر اچھے اچھے مضمون لکھے۔ بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کرے اس قسم کے کام کا نام "پروجکٹ" رکھا گیا ہے یعنی کوئی مقصد سامنے رکھ کر کام کرنا۔ اب تم ہی کہو کہ ہاربر صاحب کا یہ کہنا ٹھیک ہے یا نہیں ہم نے اس کا نام "مقصدی طریقہ" رکھا ہے "بنیادی تعلیم" والے بھی اسی طرح سے کام کراتے ہیں لیکن انھوں نے شرط یہ رکھی ہے کہ لڑکے ایسے کام پسند کریں جس میں چیزیں بناکر بیچنے سے کچھ پیسے بھی مل جایا کریں۔ کام پسند کروانے میں زبردستی ضرور ہے اس لئے کہ کئی سال تک ہیر پھیر کر چند ہی حرفوں میں کام

کرنا پڑتا ہے مگر ہے فائدے کی چیز بشرطیکہ بڑے لوگ بھی یہ وعدہ کریں کہ لڑکوں کی بنائی ہوئی چیز وہ ضرور خریدیں گے اس تجویز کے بنانے والے گاندھی جی، ذاکر صاحب اور دوسرے مشہور لوگ ہیں اس پر دو تین سال سے عمل ہو رہا ہے۔ لیکن جامعہ میں "مقصدی طریقہ" پر کام شروع ہوئے دس سال ہو چکے ہیں اس عرصہ میں تمہارے ساتھیوں نے کیا کچھ کیا اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی

ہارپر صاحب کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی۔ مسز ہارپر کے بارے میں کیا لکھوں بس یوں سمجھو کہ ایک پڑھی لکھی ماں جس طرح بچوں کی دیکھ بھال کرتی انہیں لکھنا پڑھنا سکھاتی ہے اسی طرح یہ بھی کرتی ہیں ماں کے سلوک اور برتاؤ کے بارے میں تفصیل لکھنے سے لوگ کہیں گے باؤلا ہو گیا ہے بھلا ان باتوں کو کون نہیں جانتا۔ ہاں جو بات نئی ہے وہ یہ کہ بچوں کی مذہبی تعلیم کو دلچسپ بنانے کے لئے لوگوں نے ابھی تک کم توجہ کی ہے لیکن یہ رات دن اسی بات کی کھوج میں رہتی ہیں کہ مذہبی تعلیم بھی دوسری چیزوں کی طرح بہت دلچسپ ہونی چاہئے میں اکیلا ہوں گا سے ساری باتیں کہاں تک سیکھتا میرے ساتھی عبدالواحد صاحب نے مسز ہارپر سے یہ کام خاص طور پر سیکھا ہے کسی جگہ اس کا ذکر بھی کروں گا

اُستادوں کی جماعت کو زیادہ وقت پڑھانے والے ماسٹر
لبھومل ہیں یہ ہندوستانی عیسائی ہیں اور موگا ہی میں تعلیم پائی ہے۔
مسٹر کارڈ (جنھوں نے سنہ ۱۹۲۰ء میں موگا کا مدرسہ قائم کیا تھا گویا
جامعہ اور موگا کی عمر ایک ہی ہے) کے خاص شاگرد ہیں مسٹر ہارپر
ان کے بعد آئے ہیں۔ ایک دن جماعت والوں سے پوچھا کہ آپ لوگ
اپنے بچپن کے شغل بتائیے یعنی کن چیزوں سے دلچسپی زیادہ تھی
میں نے فوراً ہی ہاتھ اونچا کیا

"اچھا آپ ہی بتائیے" لبھومل بولے
"کھیل تماشے اور سرکس دیکھنے کا شوق بہت تھا" میں نے کہا
"صرف دیکھ لیا کرتے تھے؟" ماسٹر لبھومل پھر بولے
"جی نہیں اپنے ساتھیوں سے ان کی نقل بھی کرواتا تھا" میرا
جواب تھا
"آپ کے استاد اور سرپرست تعریف کرتے تھے یا مذمت؟"
"یہ لوگ اس میں دلچسپی نہیں لیتے تھے"
"یہ شوق اب تک باقی ہے؟"
صاحب باقی کیسا میں تو اس میں برابر کام کرتا رہتا ہوں
جامعہ میں استاد ہونے کے بعد دو سال میں چھ ڈرامے کروائے ہیں

اِن میں سے چار ڈرامے تو خود ہی لکھے ہیں!

بھول صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ جماعت کے سارے لڑکے میری طرف دیکھنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا بھول صاحب کے ہاتھ کوئی نیا مگر موٹا تازہ شکار لگا ہے بولے "آپ میرے پاس آجائیے اور جماعت والوں کو بتائیے کہ یہ کام آپ نے کس طرح آگے بڑھایا ہے" لکھنے کو تو میں سوچ سوچ کر بہت کچھ لکھ لیتا ہوں جیسے کہ یہ "آپ بیتی" زیادہ تر یادداشت سے کام لے کر لکھ رہا ہوں مگر کہنے میں اِدھر کی بات اُدھر ہو جاتی ہے پھر بھی اپنے شوق کی چیز تھی بے دھڑک کہتا گیا سننے والے میرے ہم جماعت ہی تو تھے آخر میں بھول صاحب سر ہلاتے ہوئے اور رُک رُک کر جماعت والوں سے کہنے لگے

"جناب یہی بات تو میں ہر سال کچے استادوں سے کہا کرتا ہوں کہ بچپن میں جو شغل اپنے شاگردوں میں دیکھو اُس کی قدر کرو اور جیسے جیسے موقع ملے اسے ترقی دو اب اس بات پر غور کرو کہ یہ شغل پیدا کیسے ہوتا ہے یوں ہی بیٹھے بیٹھے دماغ میں کوئی بات آجاتی ہے! ہرگز نہیں اپنے اِردگرد وہ جو کچھ بھی دیکھے گا اسی سے اپنے لئے کوئی شغل پیدا کرے گا اس لئے یہ بات بھی لازمی ہوئی کہ مدرسہ اور اقامت گاہ میں دستکاری، ڈرائنگ، بنک، دُکان، خونچہ، پنچائت، بزم

کھیتی باڑی، جلسے، ڈرامے، کھیل کود، ورزش سب چیزوں کا انتظام ہونا چاہیئے ورنہ لڑکوں سے شکایت کرنا کہ وہ کچھ کرتے نہیں ہیں بیکار رہے لڑکے تو قصوروار ہوتے ہی نہیں ہیں"

کمال ہے مولگا کے جس استاد کو دیکھو لڑکوں ہی کو بے قصور کہتا ہے معلوم نہیں تمھیں کن کن چیزوں کا شوق ہے دوایک شغل پیدا کر لو تو تمھارا وقت اچھا گزرے گا۔ اُستاد لاکھ کہیں کہ قصور لڑکوں کا نہیں ہے یہ اُن کی سعادت مندی ہے پر اپنی ذمہ داری بھی تو ہے۔ تم تو اس بات کو یاد رکھو کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے اپنا شوق اور استادوں کی مدد ان دو چیزوں سے کام چلے گا

ہماری جماعت میں ایک دن دوسری بحث چھڑ گئی۔ ماسٹر صاحب نے پوچھا

"پہلی جماعت میں داخل ہونے سے پہلے بچوں کے شغل کس قسم کے ہوتے ہیں؟"

جماعت والوں نے کہا

"اِدھر اُدھر کی چیزیں جمع کرنا، کچھ بنانا، کچھ بگاڑنا چیزوں کے ساتھ کھیلنا قصے کہانیاں سُننا وغیرہ"

عام طور پر پہلی جماعت میں کام کس طرح شروع کیا جاتا ہے

بھوپل صاحب نے پھر پوچھا

"یہی کہ کوئی ایک قاعدہ خرید واکر الف، بے، پے، سے

پڑھانا شروع کر دیتے ہیں" یہ ہمارا جواب تھا

"اگر ابتدا ہی سے کوئی شخص کہانی پڑھانے لگے تو لڑکے اس میں

دلچسپی زیادہ لیں گے یا الف، بے، پے پڑھنے میں"؟ ہم نے تعجب

سے کہا

"کہانی پڑھنے میں دلچسپی تو بہت لیں مگر الف، بے، پے یاد

کئے بغیر بھلا کوئی کہانی بھی پڑھ سکتا ہے"!

کہنے لگے "پڑھ سکتا ہے۔ اور بڑے شوق سے پڑھ سکتا ہے

اُستاد کا مطلب شناخت کروانا ہے۔ چاہے جملے کی ہو یا الف، بے

پے کی۔ جو چیز دلچسپ ہو اور وہ کھیلنے کے کام بھی آئے لڑکے تو

ان ہی کے پیچھے پڑ جائیں گے آپ لوگ تجربہ کر کے دیکھئے۔ ایک

چھوٹی سی کہانی سنا کر اس کے چند جملے دفتیوں پر علٰحدہ علٰحدہ

لکھ لیجئے۔ مثلاً

ایک تھا کوا

ایک تھا طوطا

ایک تھی چڑیا

چڑیا بولی وغیرہ

بچوں کی تو یہ عادت ہی ہوتی ہے کہ وہ بڑوں کی نقل کرنا
پسند کرتے ہیں ان سے کہیئے کہ وہ اِس کہانی کو پڑھیں۔ آپ جیسا
پڑھیں گے وہ بھی ویسا ہی پڑھنے لگیں گے۔ ان جملوں کو شناخت
کرانے کے لئے طرح طرح کے کھیل کھلائے مثلاً "ایک تھا کوا" کی طرف
اشارہ کرکے ان سے کہیئے کہ تمھارے سامنے جو اور جملے پڑے
ہیں ان میں سے ایسا ہی ایک نکال لیں آپ دیکھیں گے کہ لڑکے
پہلے تو تختہ سیاہ پر نگاہ جمائیں گے پھر سامنے والے ڈھیر کو الٹ پلٹ
کریں گے اور لڑکے چپ چاپ دیکھ رہے ہوں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے
بس ایسا معلوم ہوگا کہ اُستاد اور لڑکے مل کر کسی اہم بات کی کھوج میں
ہیں پھر اس ایک کھیل پر ہی کیا موقوف ہے بیسیوں کھیل موجود ہیں
مجال ہے جو جماعت میں بھگدڑ مچے ہر لڑکا یہی چاہے گا کہ باہر
نہ جائے۔ اگر ہم ان سے پہلے ہی دن کہتے کہ یاد کرو الف، بے
پے تو سوال یہ ہے کہ وہ کیوں یاد کریں۔ انہیں کیا معلوم کہ یہ
چیز آگے چل کر پڑھنے لکھنے میں کام آئے گی۔ یہ الف، بے
پے نہ تو کوئی کہانی ہے نہ پرندوں اور جانوروں کے نام ہیں
نہ کھیلنے کی چیزیں ہیں پھر انھیں کیوں یاد کریں ہاں دوسروں کو

پڑھتے لکھتے ہوئے وہ دیکھتے ہیں اس لئے ان کی نقل میں جو کچھ کروائے وہ تیار ہو جائیں گے"

معاملہ ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آیا تھا ہم نے کہا "اچھا صاحب آگے چلیئے"

"جب ایک چھوٹی سی کہانی کے جملے شناخت کریں تو ان کے لفظ بھی شناخت کرائیے"

"پھر!" ہم نے کہا

"جب یہ کام ہو جائے تب ان لفظوں کی آوازیں الگ الگ کر کے بتائیے

مثلاً۔ "سب" میں س ۔ ب

"رب" میں ر ۔ ب

"اب" میں ا ۔ ب

اِس موقع پر ہماری سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا تھا

جب یہ آوازیں وہ جان جائیں تب اِن ہی آوازوں سے نئے نئے لفظ بنوائیے مثلاً

س ۔ ر = سر

ر ۔ س = رس

حرفوں کے نام لے کر ہجے کرنے سے بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ مثلاً سین پے زبر "سب" کیسے ہوگیا یا سین رے زبر سر اور دال موقوف "سرد" کیسے ہوگیا!!

تم کہوگے کہ ماسٹر صاحب ہماری سمجھ میں تو بات آجاتی ہے مگر سوال تمہارا نہیں ہے بلکہ بالکل چھوٹے بچوں کا ہے اپنے بچپن کو یاد کرو کہ پانچ سال کی عمر میں چند حرف یاد کرنے کے لئے کس قدر مار کٹائی ہوتی تھی

اب اس کے آگے جو کچھ بتایا وہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ میں نے کہا

"تو بات یوں ہوئی کہ محض چڑیا پھانسنے کے لئے دانے ڈالے جاتے ہیں!

"اور کیا!! ——— لیکن اس چڑیا کو آزاد رکھ کر پالتے ہیں!"

"آزاد رکھ کر پالنے" پر بھی ایک لمبی چوڑی بحث ہوئی مگر ساری باتیں کہاں تک لکھوں ابھی گیارہ سال کی کہانی اور باقی ہے اس کا بھی خیال رکھنا ہے کہ جوں جوں سال بڑھتے جاتے ہیں باتیں پھیلتی جاتی ہیں اور کیوں نہ پھیلیں آدمی بڑی

عمر کا ہوکر سوچنا بھی زیادہ ہے ——— ہاں تو اُردو
پڑھانے کے جس طریقے کا میں نے ذکر کیا ہے اِسے "کہانی کا
طریقہ" (STORY METHOD) کہتے ہیں
لکھنے پڑھنے کا کام محض کتابوں تک ہی محدود نہیں ہے
لبھول صاحب کچھ اور بھی بتایا کرتے ہیں ——— باوجود امریکن
عیسائیوں کے ماتحت کام کرنے کے وہ کھُلم کھُلا اپنی جماعت
والوں سے کہا کرتے ہیں
"تم لوگوں کو ولایت کے عیسائیوں کا محتاج نہ رہنا چاہیئے
آج مسٹر ہارپر اور اُن کے ساتھی مدرسہ چھوڑ کر امریکہ چلے جائیں
یا اس مدرسہ کو بند کرنا چاہیں تو تم میں ایسی صلاحیتیں ہونی چاہئیں
کہ اِس مدرسہ کو خود چلا سکو۔ بس سارا گُر یہ ہے کہ کسی کام میں عیب
نہ سمجھو دوسروں کی نکتہ چینی سے فائدہ اُٹھاؤ باتیں کم کرو
کام زیادہ جانوروں کے پیٹ بھی پل جاتے ہیں اپنے پیٹ
کی فکر میں غلط راہ پر چل کر ہلاک نہ ہو صرف یہ دیکھو کہ اپنے
ذمہ جو کام لیا ہے آیا وہ ٹھیک سے ہو رہا ہے یا نہیں!
——— اپنے کام کے بارے میں اپنے آپ سے پوچھو"
موگا کا ہر اُستاد پڑھنے پڑھانے کے علاوہ کوئی نہ کوئی

ہاتھ کا کام بھی کرتا ہے تاکہ لڑکوں میں بھی یہ شوق جاری رہے
لبھومل صاحب سب استادوں کی حجامت بنایا کرتے ہیں
اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے یہ بات مذاق میں نہیں
لکھی ہے موگا سے واقفیت رکھنے والے لوگ اس کی تصدیق
کریں گے

ماسٹر سموئل کھیتی باڑی کا کام سکھاتے ہیں لڑکے ان پر
اعتماد کرتے ہیں یہ سب کی شکایات سُننتے بھی غور سے ہیں جو
کچھ سُننتے ہیں اس کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں مگر ایک کی
بات دوسرے سے نہیں کہتے ہیں تب ہی تو لڑکے اپنے دل
کی بات ان سے کہہ دیتے ہیں

جماعتوں میں تو مقصدی طریقہ سے پڑھنے لکھنے کا کام
ہوتا ہے لیکن ہر ایک لڑکے کے لئے محنت مشقت کا کام ضروری
ہے مدرسہ اور اقامت گاہ میں ایک بھی ملازم نہیں ہے سارا
کام باری باری سے لڑکے ہی کرتے ہیں ربیت الخلا کے لئے
چند بھنگی رکھ لئے ہیں، کھیتی باڑی کا کام بڑے پیمانے پر جاری
ہے تاکہ چھوٹے سے بڑے بڑے تک سب کو کام مل سکے پہلی دوسری
اور تیسری جماعت کے لڑکوں کے لئے تو عملی کام کی پابندی

نہیں ہے باقی جماعتوں کے لیئے یہ کام لازمی ہے

(۱) چوتھی سے آٹھویں تک اور اُستادوں کی جماعت کو ملا کر
چھ جماعتیں ہوئیں اتوار کا دن نکال کر ہفتہ کے چھ دن رہ جاتے
ہیں ہر ایک جماعت باری باری سے ہفتے میں ایک روز سارے
دن عملی کام کرتی ہے۔ لڑکوں کی ٹولیاں بنا دی جاتی ہیں کھیتوں
کی نلائی، رہٹ چلانا، کیاریوں میں پانی دینا، سبزیوں کا کام، بیل
احاطہ کی صفائی، خاص خاص میدانوں کی صفائی، نالیاں بنانا
سڑکوں کی مرمت، بڑھئی کا کام، رسی بٹنا، بید کا کام غرض کہ
تعداد کے لحاظ سے کام تقسیم ہو جاتے ہیں ان لڑکوں کا یہ عملی
دن (PRACTICAL DAY) کہلاتا ہے سارے دن کے کام کی اُجرت
چھوٹوں کو چھ آنے اور بڑوں کو دس آنے ملتی ہے

(۲)۔ روزانہ سہ پہر میں مذکورہ بالا چھ جماعتوں کے ہر ایک
لڑکے کے لیئے ایک گھنٹہ تک ان میں سے کوئی ایک کام کرنا ضروری
ہے اس میں بھی چھوٹوں کو ایک آنہ اور بڑوں کو ڈیڑھ آنہ ملتے ہیں

(۳) ہر ایک جماعت سے روزانہ دو لڑکے لیئے جاتے ہیں
اس طرح یہ بارہ لڑکے کھانا پکانا، ڈاک لانا لے جانا، کاغذات
تقسیم کرنا اور گھنٹہ بجانے کا کام کرتے ہیں (کسی دن کام زیادہ

ہو تو "عملی دن" والے بھی اس فریق میں شریک کر دیے جاتے ہیں) اگر کسی جماعت میں تیس لڑکے ہوں تو اس طرح مہینہ میں دو دفعہ باری آتی ہے

اس مدرسہ میں تمام تر غریبوں کے لڑکے تعلیم پاتے ہیں اس لیے جو دام انھیں ملتے ہیں ان سے یہ کتابیں خریدتے ہیں اور کھانے کی فیس ادا کرتے ہیں۔ جو لڑکے دوسری ضروریات کے لیے کچھ اور کمانا چاہیں وہ فرصت کے وقت یا چھٹیوں میں زاید کام کر سکتے ہیں اس طرح موگا کے ہر ایک طالب علم کو فخر ہے کہ وہ اپنا پیٹ آپ پالتا ہے اب رہ گئی استادوں کی تنخواہیں اور عمارتوں کا خرچ، کچھ تو گورنمنٹ دیتی ہے اور کچھ ولایت کے عیسائی۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس سے پڑھائی میں حرج ہوتا ہے اور لڑکوں کو محنت و مشقت کا کام کرنا پڑتا ہے لیکن اس مدرسے کے لوگ لڑکوں ہی کے کام کو سامنے رکھ کر سمجھاتے ہیں کہ یہ محض خیالی باتیں ہیں وہ لوگ دلیل کے طور پر کہا کرتے ہیں کہ سرکاری مدرسہ کو لیجیے جس میں سارے دن مدرسے کی چار دیواری میں رہ کر کام کرنا پڑتا ہے دونوں کے پڑھنے لکھنے کے کام کا مقابلہ کیجیے۔ موگا کی پڑھائی کہیں زیادہ

نظر آئے گی اب رہ گئی محنت و مشقت کی بات کچھ عرصہ کے لئے ہمارے لڑکے سرکاری مدرسہ میں بھیجدیئے جائیں اور وہاں کے لڑکے ہمارے ہاں آجائیں نتیجہ میں آپ دیکھیں گے کہ سرکاری لڑکے تو وہاں جانا پسند نہ کریں گے اور ہمارے لڑکے وہاں سے بھاگ آئیں گے ــــــــ کیوں؟؟ دلچسپ طریقے سے پڑھنا پڑھانا۔ ہفتہ میں ایک کی بجائے دو چھٹیاں منانا۔ ان میں سے ایک چھٹی تو آرام کیجئے دوسری چھٹی میں ایک ہی قسم کا کام جاری رکھنے کی بجائے کھلے میدانوں میں نکل کر ہاتھ پاؤں کے جوہر بھی دکھایئے۔ پھر مہینہ میں دو دن باورچی، بیرے، چپراسی ڈاکیہ، پیام بر، بھشتی کی نقل کرنے کے لئے مل جاتی ہے کام اچھا لڑکے خوش پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض لوگ ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہیں! یوں سستی کی وجہ سے پڑھنے لکھنے سے لڑکوں کا جی چرائے یا بیکاری کی وجہ سے مارے مارے پھریں، عادتیں خراب ہوں بیمار رہیں جماعتوں سے بھاگیں حاضری کم ہو ان چیزوں کا حساب کوئی نہیں لگاتا ہے لیکن جب کام ہو رہا ہو یہ سوال آدھمکے گا "پڑھائی کا حرج ہوتا ہے" جانے یہ پڑھائی کیا کام آئے گی!

میں نے بھی اپنے ذمے بیل خانے کی صفائی کا کام لے رکھا تھا جس دن ہمارا عملی کام ہوتا صبح صبح بیل خانے پہنچ کر تمام گوبر پھاوڑے سے ریڑھی (دو پہیوں کی گاڑی) میں بھر کر گھور (کھتہ) میں ڈال آتا پھر کُٹی (باریک چری)، بھوسہ، چنے کا موٹا آٹا ملا کر جانوروں کے سامنے رکھ دیتا (اسے سانی کہتے ہیں) اور اس کے ساتھ لاہوری نمک کی بڑی بڑی ڈلیاں بھی (جسے جانور صرف چاٹتے ہیں) رکھ دیتا کنوئیں پر لیجا کر جانوروں کو پانی پلاتا۔ موگا والے پوچھتے کہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے میرا یہی جواب ہوتا کہ تکلیف کیسی ہفتہ میں ایک دن کی بجائے دو دن کی چھٹی مل گئی ہے —— ہاں یہ بات ضرور ہے کہ مئی اور جون میں ہمیں بہت تکلیف ہوتی تھی لیکن بیشتر وقت درختوں کے سائے میں گا بجا کر گزار دیتے تھے یہ بات دس سال پہلے کی ہے سُنا ہے کہ اب بہت سی تبدیلیاں ہو گئی ہیں ممکن ہے اس کا انتظام بھی ہو گیا ہو۔ عملی کام کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یاد آئی ہم لوگ کھیتوں میں پانی دینے کے لئے چھوٹی نہر بنا رہے تھے کئی ہفتوں کی محنت سے جب یہ مکمل ہو گئی تو بڑی نہر سے پانی چھوڑا گیا ایک جگہ بند ٹوٹ گیا پانی زور سے جا رہا تھا لڑکے سٹ پٹا گئے

ہارپر صاحب وہاں موجود تھے (کام کے لباس میں) فوراً ہی
پانی ٹوٹنے کی جگہ لیٹ گئے اور چلائے کہ جلدی سے مٹی لگاؤ لڑکوں
نے یہ دیکھا تو اور ہوشیار ہو گئے آس پاس سے مٹی کھود کر
جلدی جلدی بند باندھ دیا پانی کافی بہہ گیا تھا۔ سب لت پت
ہو گئے۔ بعض لڑکوں نے تو قصداً لوٹ لگائی جی چاہتا تھا ایک جگہ
سے اور بند ٹوٹے لیکن ہارپر صاحب نے کہہ دیا تھا کہ ایسی شرارت
نہ کرنا

یہاں بھی سال میں دو ڈرامے کھیلے جاتے ہیں ایک بڑے دن
پر دوسرا دیہات والوں کے لئے۔ جامعہ میں کھیلا ہوا ڈرامہ
"کایا پلٹ" کو مقامی بنا کر میں نے یہاں کے لڑکوں سے سٹیج کروایا
تھا۔ دیہات والوں کا ڈراما بھی میرے سپرد ہوا۔ ملیریا سے متعلق تھا
ہماری جماعت والوں نے کھیلا تھا

مدرسہ کی ایک پنچایت ہے جس میں لڑکوں کے اہم معاملات
(جن کا تعلق سزا سے ہوتا ہے) طے ہوتے ہیں۔ صدارت کے لئے
دو امیدوار تھے جن میں سے ایک میرا نام تھا۔ کثرت رائے سے
میں چن لیا گیا۔ پچانوے فی صدی لڑکے عیسائی ہیں لیکن زیادہ
[illegible] نے عیسائی لڑکے کے مقابلے میں مجھے [illegible] اس سے اندازہ

لگا سکتے ہیں کہ لڑکے تنگ نظر نہیں ہوتے ہیں وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ کون شخص کس کام کا ہے۔ ہارپر صاحب نے فرمایا کہ موگا کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ ایک غیر عیسائی یہاں کی پنچایت کا صدر ہوا ہے اُنھوں نے امید ظاہر کی کہ اس انتخاب کی وجہ سے مجھے پہلے سے زیادہ لڑکوں کا اعتماد حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ واپسی پر اچھی اچھی سندیں بھی دیں

اُستادوں کی جماعت باہر کا تجربہ حاصل کرنے کے لئے موگا سے کافی دور کسی اور علاقے میں چلی جاتی ہے یہ سفر پندرہ دن کا ہوتا ہے کسی مقام کو مرکز قرار دے کر پڑاؤ ڈال دیتے ہیں پھر پروگرام کے مطابق آس پاس کے گاؤں میں سبق دینے کے لئے چلے جاتے ہیں مسلسل ایک ہفتہ تک سبق دیتے ہیں باری باری سے ایک ٹولی کھانا پکاتی ہے مرکز کی نگرانی کرتی ہے باقی لڑکے صبح دس بجے کھانا کھا کر چلے جاتے ہیں اور چار بجے لوٹتے ہیں دوسرے ہفتے میں کسی دیہات میں ڈراما کرتے ہیں وہاں کے لوگوں کے کاموں کو سمجھنے کے بعد انھیں مشورہ دیتے ہیں بعض کام مثلاً صفائی وغیرہ کا طریقہ خود ہی بتلاتے ہیں رات میں گانے بجانے کا شغل رہتا ہے اِس کے بعد موگا کے ایک مقامی میلے میں حصہ لیتے ہیں مگر

افسوس کہ ان دلچسپیوں کے بعد مارچ میں امتحانات شروع ہوجاتے
ہیں دو تین دن کی الوداعی تقریبوں کے بعد جس میں لڑکوں کے
ساتھ میچ، طرح طرح کے کھیل بھی شامل ہیں ہار پر صاحب ان "کچے
استادوں" کو جو اب "پکے" ہوچکے ہیں بڑی محبت کے ساتھ رخصت
کرتے ہیں۔ پہلے استادوں کی جماعت ایک سال کے لئے ہوتی تھی
موگا والوں کے نزدیک ایک کام تو ہے نہیں کئی چیزیں سکھانے
کے لئے یہ مدت ناکافی تھی اب دو سال کر دئے ہیں تاکہ سارے کام
بھاگ دوڑ میں نہ ہوں بلکہ اطمینان کے ساتھ ہر چیز کا تجربہ کرسکیں
جامعہ کی آزاد فضا میں جی لگا کر کام کرنے کا موقع تو مل ہی گیا
تھا کام کے بارے میں میرا جو رویہ تھا اس پر پختگی کے ساتھ قائم بھی
تھا موگا والوں کے خیالات اور یہاں کی طرز زندگی نے ان میں معنی
پیدا کئے اس طرح میں خوش خوش یہاں سے لوٹا
موگا سے ایک سال کی واپسی کے بعد جب جامعہ پہنچا تو
کیا دیکھتا ہوں کہ حالت ہی بدلی ہوئی ہے پڑھائی میں کام آنے والی
ایک چھوٹی سی عمارت زیر تعمیر ہے۔ شہر سے دور کسی مقام پر زمین
کی خریداری کے لئے کمیٹی کا تقرر ہوچکا ہے۔ روپیہ کہاں سے آیا!
ڈاکٹر انصاری، عبدالمجید خواجہ مولوی عبدالحق ڈاکٹر ذاکر حسین خاں،

کی کوشش سے پچیس ہزار کے لگ بھگ نقد رقم ملی ہے۔ ریاست
بھوپال سے پانچسو روپیہ اور ریاست حیدرآباد دکن سے ایک ہزار
روپیہ ماہانہ کی امداد جاری ہوئی ہے ۱۱ اور تو اور حضور نظام
نے عمارتوں کے لئے پچاس ہزار روپیہ یکمشت بھی مرحمت فرمائے
ہیں ۱۱۱ عمارتیں تو خیر دیر میں بنیں گی فی الحال کرائے کی عمارتوں
میں بھی دو خوبصورت کوٹھیوں کا اضافہ ہو گیا ہے ماسٹر رمن
اسکاوٹنگ سکھانے کے لئے آیا کرتے ہیں

مہمانوں کا تانتا بندھا رہا گاندھی جی تشریف لائے تو
کھدر کے کام کو بڑھانے کے لئے جامعہ کے طلبار اور اساتذہ نے
پانچ سو ایک روپیہ کی تھیلی پیش کی گاندھی جی نے اپنی تقریر میں
فرمایا کہ جب میں آتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے گھر میں ہوں
ڈاکٹر انصاری صاحب نے سر اکبر حیدری کو چار کی دعوت دی اور
جامعہ کے کاموں کی تفصیل بتائی سیٹھ جمال محمد صاحب بھی آپ ہی
کے ہاں مہمان رہے۔ یوں تو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر ملک کا ہر خادم
دہلی آنے پر مہمان رہتا ہے لیکن حکیم صاحب مرحوم کی وفات کے
بعد جب آپ امیر جامعہ ہوئے تو جامعہ کے خاص مہمان وہیں
ٹھہرنے لگے خالدہ خانم بھی وہیں ٹھہری تھیں نواب اکبر یار جنگ نے

ڈاکر صاحب کے چچا ہیں آپ بھی جامعہ تشریف لائے حیدرآباد
سے جو امداد ملی ہے اس کے لئے آپ نے خاص طور پر کوشش
فرمائی تھی۔ ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب اسمبلی کے جلسوں کے لئے دہلی
آئے ہوئے تھے انجمن اتحاد کی دعوت پر آپ نے چاند ستاروں کی
حسابی باتیں بتلائیں ایک جلسے میں مولانا شوکت علی نے فرمایا کہ کن
شرائط پر مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونا چاہیے۔ گل شیر خاں صاحب
کا ایک جلسہ تو ان سب مہمانوں سے نرالا تھا آپ نے بعض مشہور رہنماؤں
کی تقریروں کی نقل ہو بہو اس طرح کی کہ چھوٹے بڑے ہنسی کے مارے
لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔ ڈاکٹر اٹیلی (دنیا کے بہترین مقرر
مسٹر ایڈی (دنیا کے مشہور سیاح) مدراس کے صنعتی کالج کے پرنسپل
مسٹر ریچرڈ کیتھن (امریکن) بھی ذکر کے قابل ہیں ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب
کی صدارت میں کلیہ کے طلبار کا جلسہ نظم خوانی کے لئے ہوا تھا ذاکر صاحب
نے بھی چند اشعار سنائے تھے نہ جانے ان ہی کے تھے یا چرائے
ہوئے اگر سلیم الزماں صاحب کو تھوڑی دیر کے لئے مہمان مان لیا
جائے تو اس سال کے سب مہمان ایک درجن ہوئے

اس سال کے دو گھریلو جلسوں کا ذکر ضروری ہے ان جلسوں
میں شیخ الجامعہ صاحب نے جو تقریریں کی ہیں ان سے بعض سوالوں کا

جواب مل جاتا ہے انجمن اتحاد کی رسم "مسند نشینی" بہت بڑے پیمانے
پر منائی گئی جامعہ کے تمام طلبائے جن میں ڈیڑھ سو لڑکے بھی شامل تھے
مولانا محمد علی اور بیگم صاحبہ کی موجودگی میں رات کا دعوتی کھانا
کھایا دستور کے مطابق ناظم صاحب پچھلے سال کی کارگزاری سناتے
ہیں اور نئے نائب صدر مسند نشین یا دولھا بنتے ہوئے اپنے ارادوں
کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ انجمن کے اراکین سے کس قسم کا کام لینا چاہتے
ہیں ساتھ ہی جامعہ کی ترقی کے لئے استادوں سے مشورے کے طور پر
کچھ کہتے ہیں ۔ نئے نائب صدر عبدالکریم صاحب (پشاوری) نے فرمایا
کہ جامعہ کام کرنے کا کوئی ایک خاص راستہ مقرر کرلے یعنی اُن باتوں کا
اعلان کردے جن پر عمل کرنا جامعہ کے ہر ایک لڑکے اور اُستاد
کے لئے ضروری ہے اور استادوں سے درخواست ہے کہ وہ
اپنی یکجہتی سے تمام لڑکوں کو ایک رنگ میں رنگ دیں ایسے موقعوں
پر شیخ الجامعہ کے لئے جواب دینا ضروری ہوتا ہے ۔ چنانچہ
ڈاکٹر ذاکر صاحب نے فرمایا

"جامعہ کے مقصد اور نصب العین کو معلوم کرنے کے لئے
یہ جاننا کافی ہے کہ وہ ایک ایسے زمانے میں وجود میں آئی جب
اسلام اور مسلمانوں پر سب سے بڑی مصیبت آئی تھی اور جب

ہندوستان کی دو بڑی قومیں یعنی ہندو مسلمانوں نے آزادیٔ وطن
کے لئے متحدہ کوشش شروع کی تھی اِس حیثیت سے جامعہ جہاں
اسلامیہ ہے دوسری طرف ملیہ بھی ہے وہ اپنے اندر ایک طرف
اسلامی روایات اور تعلیم کو زندہ کرے گی اور اِسی کے ساتھ دوسری
طرف متحدہ قومیت کی تعمیر اور اپنے وطن کی آزادی میں مساعی
رہے گی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مقصد اِس سے زیادہ واضح اور
روشن اور کچھ نہیں ہو سکتا دوسری چیزیں مثلاً ایک قسم کی
ٹوپی ایک رنگ کے کپڑے پہننا محض اس مقصد کے ذرائع اور
مظاہر ہوں گے"

"جہاں اساتذہ پر طلبا کو ایک رنگ میں رنگنے کی
ذمہ داری ہے وہاں کُلیہ (کالج) کے لڑکوں پر بھی ایک رنگ
میں آسانی سے رنگ جانے کا فرض عائد ہوتا ہے جامعہ کے اکثر
اساتذہ ابھی کل تک جامعہ کے طالب علم تھے اور آج وہ اِسی کے
اساتذہ کے زُمرے میں شمار کئے جاتے ہیں میں خود بھی اب سے
چند سال پیشتر جامعہ کا طالب علم تھا میرا نام جامعہ کے رجسٹروں میں
موجود ہے آج میں اِس جامعہ کا شیخ الجامعہ ہو گیا ہوں تو کیا اس سے
کچھ زیادہ فرق پڑ گیا کل کو بہت ممکن ہے کہ ان ہی کُلیہ کے طلبار

میں سے بعض تعلیم سے فراغت پاکر جامعہ کے اساتذہ میں آجائیں
اس لحاظ سے کلیہ کے طلبار پر بھی کچھ کم ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے
وہ مدرسے کے دوسرے چھوٹے لڑکوں کے لئے بطور نمونہ ہیں ان ہی
کو دیکھ کر وہ بھی رنگ پکڑلیتے ہیں اس لئے بڑے طلبار کو بھی چاہیئے
کہ وہ اپنی ہر بات کا خیال رکھیں اور اپنی ذمہ داری کو ہر ہر
قدم پر محسوس کریں"

کئی سال کی خاموشی کے بعد گاندھی جی ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو
اپنی "سول نافرمانی" کی تحریک شروع کرنے کے لئے مقام ڈانڈی
کی طرف روانہ ہوئے تاکہ آزادی کی تحریک میں جان پڑجائے
ملک میں جب کوئی اہم واقعہ ہوتا ہے تو جامعہ کے طلبار کو اس سے
باخبر رکھنے اور اس کی اونچ نیچ سمجھانے کے لئے جلسہ ہوتا ہے
یہ بھی سوچا جاتا ہے کہ جامعہ کے طلبار سے اس کا کس حد تک تعلق
ہے اور وہ اِس کے لئے کیا کرسکتے ہیں ٹھیک اِسی تاریخ کو جامعہ
میں یہ جلسہ ہوا اپنا اپنا خیال ظاہر کرنے کی سب کو آزادی ہوتی
ہے سرکاری مدرسوں کی طرح پابندیاں نہیں ہوتی ہیں۔ اِس جلسے
میں پہلے لڑکوں نے پُرجوش تقریریں، قومی جذبات کا اظہار
جس طرح بن پڑا کیا۔ اساتذہ کی تقریروں کے بعد شیخ الجامعہ صاحب

(ذاکر صاحب) نے فرمایا

" اب تک ہندوستان میں جتنی سیاسی تحریکیں اُٹھیں وہ زیادہ تر شہر ہی سے متعلق تھیں۔ یہ سب سے پہلے ۱۹۲۰ء میں ہوا کہ گاندھی جی نے ایک ایسی تحریک اُٹھائی جو ہندوستان کی اصل آبادی یعنی دیہات کے لوگوں سے تعلق رکھتی تھی لیکن یہ اتفاق وقت تھا کہ اسی زمانے میں مظالم پنجاب اور خلافت کا زور شروع ہو گیا اور اس طرح وہ تحریک اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر نہ ہو سکی اور ہندوستان کی تمام قوت ان ہی مطالبات کے تسلیم کرانے میں صرف ہوئی، سوء اتفاق یہ تحریک پوری کامیاب نہ ہو سکی، ملک میں کئی سال تک ایک انتشار اور تفریق کا دور دورہ رہا اس عرصے میں ہندوستان نے سب سے بڑی غلطی جو کی وہ دستور اساسی بنانے کی کوشش تھی اب سے چند سال پیشتر انگلستان کے ایک بڑے شخص لارڈ برکن ہیڈ نے یہ طعنہ دیا تھا کہ ہندوستان کے لوگ اپنا ایک متفقہ دستور اساسی بھی نہیں بنا سکتے، بس کیا تھا ہمارے سیاسی اکابرین اس طعنے سے بھڑک اُٹھے اور "نہرو کمیٹی رپورٹ" کے نام سے ایک دستور اساسی بنا کر پیش کر دیا لیکن اس کا جو حشر ہوا وہ بالکل قدرتی تھا سیاسی قوت حاصل کرنے سے پیشتر دستور اساسی منظور کرانے کی کوشش ایک

عبث کوشش تھی بہرحال اب پورے دس سال کے بعد وہ تحریک پھر اپنے اصلی رنگ میں نمودار ہو رہی ہے

جہاں تک جامعہ کے اس تحریک میں حصہ لینے کا تعلق ہے میں اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ جامعہ تو خود جنگ آزادی کے لیے سپاہی تیار کر رہی ہے۔ صحیح تعلیمی کام خود سب سے اہم قومی کام ہے کارکنان جامعہ کی یہ چھوٹی سی جماعت اس ایک کام میں لگی ہوئی ہے اب اس کو کسی اور طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ خود ایک اہم قومی اور مذہبی کام کر رہی ہے لیکن مختلف محرکات کا مختلف لوگوں پر الگ الگ اثر ہوتا ہے یہ ہو سکتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ ایسا ہے کہ ہمارے بعض ساتھی اس سیاسی تحریک میں شرکت کے لیے بیتاب ہوں وہ اپنی خدمت کے جذبے کا سب سے بہتر اظہار شاید اس طرح کر سکتے ہوں انھیں ضرور اس تحریک میں شریک ہونا چاہیے لیکن چونکہ ان پر جامعہ کی خدمت کا فرض پہلے سے عاید ہے اس لئے پہلے جامعہ سے انھیں اجازت لے لینی چاہیے تاکہ جامعہ پہلے اپنے کام کا انتظام کر سکے"

قومی ہفتہ منانے کے معمولات میں یہ اضافہ ہوا کہ اپنے

گھر کی صفائی کے علاوہ جامعہ کے طلباء، اساتذہ نے شیخ الجامعہ صاحب کے ساتھ بستی کی گلیوں کی صفائی کی، بوڑھی عورتوں میں امدادی طور پر چرخے تقسیم کیے گئے

موگا سے میری واپسی وسط اپریل میں ہوئی تھی ڈیڑھ مہینہ کے بعد بڑی چھٹیوں کے لیے مدرسہ بند ہونے والا تھا امتحانات کی تیاریاں ہو رہی تھیں بہتر یہی معلوم ہوا کہ میں تعلیمی سال کے آغاز سے اپنا کام شروع کروں اس طرح ساڑھے تین مہینے کی چھٹی مل گئی تھی مجھے گھر سے آئے ہوئے پورے سات برس ہو گئے تھے خط کتابت جاری تھی۔ ہر خط میں والدہ صاحبہ یہی پوچھتی تھیں "تم کب آؤ گے؟" شاید تم کہو گے کیسا بے مروت ہے سات سال ہو گئے ایسا کیسا والدہ کو صورت نہ دکھا[illegible] ماں بھائی جو چاہو کہو میری بھی چند مجبوریاں تھیں ایک بڑی [illegible] یہی تھی کہ کچھ حاصل کرنے کے بعد گھر جانا چاہتا تھا تاکہ بستی والوں کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے اب اتنا تو ہو گیا تھا کہ جامعہ جیسی مشہور درسگاہ میں مدرسی کے عہدہ پر مستقل ہو گیا تھا پھر موگا کے امتحان میں درجہ اول بلکہ سارے مدرسے میں اول آنے کی امید تھی ساڑھے تین مہینے کی چھٹیاں مل ہی گئی تھیں پھر والدہ سے

ملنے کی آرزو!! گھر جانے کا فیصلہ کرلیا
پہلے سے سوچی ہوئی بات ہوتی تو گھر خط لکھتا اب تو یہی
خیال تھا کہ تیسرے دن خود ہی پہنچ جاؤں گا ——— پھر وہی
لمبا سفر ریل زناٹے سے چلی جا رہی تھی - خیالات کا ہجوم ———
لیکن اس دفعہ یہ خیالات کہانی کی صورت میں سامنے آتے اور
چلے جاتے . تکلیف محسوس ہوتی تھی، تو آنے والی خوشی کا خیال
اسے دور کر دیتا - بہت سارے روپئے تو اب بھی میرے پاس
نہیں تھے پچیس روپئے ماہوار میں کیا بچا لیتا - مہینے کے مہینے
پانچ روپئے تو والدہ کے لئے بھیج دیتا تھا ہاں اتنی بات ضرور تھی
کہ حبشی حلوہ، دلی کے چند جوڑی جوتے دو ایک کامدار ٹوپیاں
[illegible]ہ کے لئے پان کا مصالحہ تحفتہً لے کر چلا تھا ٹکٹ بھی پورا
تھا [illegible] اور جب ماں کو معلوم ہوگا بیٹا آیا ہے!!" - بس جی
چاہتا تھا گاڑی کی رفتار دگنی ہو جائے ——— آگرہ آیا میں
جھٹ سے اتر پڑا اور اس پولیس والے کو ڈھونڈنے لگا
جس نے میری باتیں ہمدردی سے سنی اور روٹی کھلائی تھی -
بہت تلاش کیا مگر نہ ملا معلوم ہوتا تھا بدلی ہوگئی ہے یا تبادلہ ہوگیا
ہے، گاڑی نے سیٹی دی میں چل پڑا - جاتے کتنے ہی "ٹکٹ چیکر"

گھر کی صفائی کے علاوہ جامعہ کے طلبا، اساتذہ نے شیخ الجامعہ صاحب کے ساتھ بستی کی گلیوں کی صفائی کی، بوڑھی عورتوں میں امدادی طور پر چرخے تقسیم کئے گئے

موگا سے میری واپسی وسط اپریل میں ہوئی تھی ڈیڑھ مہینہ کے بعد بڑی چھٹیوں کے لئے مدرسہ بند ہونے والا تھا امتحانات کی تیاریاں ہو رہی تھیں بہتر یہی معلوم ہوا کہ میں تعلیمی سال کے آغاز سے اپنا کام شروع کروں اس طرح ساڑھے تین مہینے کی چھٹی مل گئی تھی مجھے گھر سے آئے ہوئے پورے سات برس ہوگئے تھے خط کتابت جاری تھی - ہر خط میں والدہ صاحبہ یہی پوچھتی تھیں "تم کب آؤ گے ؟" شاید تم کہو گے کیسا بے مروت ہے سات سال ہوگئے اب تک والدہ کو صورت نہ دکھا[illegible] بھائی جو چاہو کہو میری بھی چند مجبوریاں تھیں ایک بڑی یہی تھی کہ کچھ حاصل کرنے کے بعد گھر جانا چاہتا تھا تاکہ بستی [illegible] سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے اب اتنا تو ہوگیا تھا کہ جامعہ جیسی مشہور درسگاہ میں مدرسی کے عہدہ پر مستقل ہوگیا تھا پھر موگا کے امتحان میں درجہ اول بلکہ سارے مدرسے میں اوّل آنے کی اُمید تھی ساڑھے تین مہینے کی چھٹیاں مل ہی گئی تھیں پھر والدہ سے

ملنے کی آرزو!! گھر جانے کا فیصلہ کر لیا
پہلے سے سوچی ہوئی بات ہوتی تو گھر خط لکھتا اب تو یہی
خیال تھا کہ تیسرے دن خود ہی پہنچ جاؤں گا ——— پھر وہی
لمبا سفر ریل زناٹے سے چلی جا رہی تھی ۔ خیالات کا ہجوم ———
لیکن اس دفعہ یہ خیالات کہانی کی صورت میں سامنے آتے اور
چلے جاتے ۔ تکلیف محسوس ہوتی بھی، تو آنے والی خوشی کا خیال
اسے دور کر دیتا ۔ بہت سارے روپئے تو اب بھی میرے پاس
نہیں تھے پچیس روپئے ماہوار میں کیا بچ لیتا ۔ مہینے کے مہینے
پانچ روپئے تو والدہ کے لئے بھیج دیتا تھا ہاں اتنی بات ضرور تھی
کہ حبشی حلوہ، دِلّی کے چند جوڑی جوتے دو ایک کا ہار تو پیال
ہ کے لئے پان کا مصالحہ تحفۃً لے کر چلا تھا ٹکٹ بھی پورا
اور جب ماں کو معلوم ہوگا بیٹا آیا ہے !!" ۔ بس جی
چاہتا تھا گاڑی کی رفتار دُگنی ہو جائے ——— آگرہ آیا میں
جھٹ سے اُتر پڑا اور اُس پولیس والے کو ڈھونڈھنے لگا
جس نے میری باتیں ہمدردی سے سُنی اور روٹی کھلائی تھی ۔
بہت تلاش کیا مگر نہ ملا معلوم ہوتا تھا بدلی ہو گئی ہے یا تبادلہ ہو گیا
ہے، گاڑی نے سیٹی دی میں چل پڑا ۔ جانے کتنے ہی "ٹکٹ چیکر"

آئے اور چلے گئے میں سب کی طرف لاپروائی سے دیکھتا تھا
"ٹکٹ" ایک نے کہا
"ٹکٹ موجود ہے ذرا اس صراحی کے دام دے لوں!" پھر
ٹکٹ جانچنے والے نے بھی پرواہ نہ کی آگے بڑھ گیا
منماڑ کا اسٹیشن آیا یہاں گاڑی بدلنی تھی جی چاہتا تھا پھر کسی
بھٹیاری کی دُکان مل جائے۔ کھاتے ہوئے کچھ باتیں کروں علی گڑھ
کی بھٹیاری کا اور اپنا قصہ سناؤں مگر ایک "مسلم ہوٹل" میں جانا پڑا
کھلانے والے نے پوچھا "کیا کھائے گا صاحب؟"
"کیا کیا تیار ہے"؟ میں نے بھی سوال کیا
"آلو گوشت۔ مٹر گوشت۔ کوفتے۔ قیمہ۔ پلاؤ۔ چپاتی۔ میٹھے
میں نہ جانے کیا کیا نام لے ڈالے
"خشکا بھی ہے"؟ میں نے پھر پوچھا
"نہیں ہے صاحب" بیرے نے جواب دیا
"آخر یہ کیوں نہیں تیار رہتا!" میں نے کہا
"یہ مرہٹواڑی ہے صاحب۔ آڈر دینے سے آدھ گھنٹے
میں تیار ہو جائے گا"
مٹر گوشت اور چپاتی پیٹ بھر کر کھالی۔ اب ریاست کی

گاڑی چھک چھک کرتی چلی جا رہی تھی ——— دولت آباد کا قلعہ ——— اورنگ آباد کا اسٹیشن جہاں مڈل کا امتحان دینے کے لیۓ آیا تھا اِس سے اگلا اسٹیشن گیورائی جس نے بچپن میں ریل کا سفر ختم ہونے کی منحوس خبر سُنائی تھی جالنہ کا اسٹیشن جہاں کے پراٹھے پشاوری پراٹھوں سے مختلف ہوتے ہیں ایک ایک کرکے گُزر رہے تھے ایک اسٹیشن پر کسی نے آواز بھی دی "غفار صاحب غفار صاحب !! مگر گاڑی چلدی۔ پربھنی اور نانڈیڑ کے اسٹیشن گُزرے۔ پربھنی پر محمد حسین صاحب اور نانڈیڑ کے اسٹیشن پر الف الدین صاحب کا خیال آیا مگر میں کسی کو بھی اطلاع نہ دے سکا ورنہ یہ دونوں یہاں ضرور ملتے۔ محمد حسین صاحب جامعہ کے بی۔اے ہیں اور ونپرتی (محبوب نگر) میں مُدرس ہیں الف الدین صاحب بھی پرانے دوستوں میں سے ہیں نانڈیڑ میں مُدرس ہیں اِن دونوں کی دوستی کا حال پھر کسی موقع پر لکھوں گا اس وقت تو بس مال کا خیال ہے گاڑی اُدھر ہی لیۓ جا رہی ہے باسر کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ اب چھپنا کیسا! کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا جھانک جھانک کر دیکھنے سے کپڑے میلے ہو گۓ تھے۔ آس پاس کے گاؤں دکھائی دے رہے تھے۔ دھرم آباد۔ بالا پُور ہاں یہ وہی

مقامات ہیں جہاں میچ کھیلنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ دوُر سے
گوداوری کا پُل دکھائی دے رہا تھا ـــــــ اسی جگہ یا سر اسٹیشن ہے
مُنہ پر ہاتھ پھیرے گرد صاف کی ـــــــ گاڑی کوُں کاں کرتی
ہوئی ٹھہر گئی

اب یہاں قُلی بھی رہنے لگے! اُتارنا صندوق کو! کیوں
بھائی۔ گاڑی (سپیشل گاڑی) تیار مل جائے گی؟" گاڑی!!
ـــــــ بابو صاحب بس تیار کھڑی ہے" قلی نے تعجب سے
کہا قُلی کو کیا معلوم تھا کہ میں سات برس کے بعد لوٹا ہوں یہیں کا
رہنے والا ہوں۔ کوئی آدھے گھنٹے میں "بس" نے مُجھ کو اُن کے
ڈاکخانے کے پاس پہنچا دیا ـــــــ

"غفار صاحب، غفار صاحب، غفار صاحب" ایک نے
کہا دوسرے نے کہا تیسرے نے کہا کچھ لڑکے دوڑتے ہوئے
نہ جانے کدھر گئے وہ اپنے ساتھ کچھ اور لڑکوں کو لے آئے
ایک لڑکے نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ آپ کے
بھتیجے ہیں" اِس بچے کو دودھ پیتے چھوڑ گیا تھا اب یہ تیسری
جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ میرا سامان گھر پہنچ گیا۔ لڑکوں کو نہ جانے
کیا لُطف آرہا تھا وہ میرے ساتھ ہوگئے اِن میں سے بعض

بہت سوں کو نہیں پہچانتا تھا مگر وہ مجھے اس طرح دیکھتے تھے
جیسے کہ میرے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔ میں اپنے گھر کی طرف
جانے لگا۔ ایک لڑکے نے کہا
"وہ گھر تو بنیے کے پاس رہن ہے ماموں کے ہاں چلیئے!!
میں کچھ سُست پڑ گیا اور لڑکوں کی طرف دیکھنے لگا۔
دوسرے نے پہلے کی طرف دیکھ کر کہا "پگلے ایسی بات یہاں کہنے
کی ہے!" پھر میری طرف دیکھ کر بولا "آپ ماموں کے گھر چلیئے
آپ کی ماں اور بھائی وہیں رہتے ہیں"
مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے پیر بھاری ہو گئے ہیں
میں خالی ہاتھ ہوں، مکان رہن ہے اور ماں مصیبت میں!
لڑکے کسی طرف لئے جا رہے تھے اور میں چلا جا رہا تھا سامنے نظر
جو پڑی تو دیکھا کہ ماں دروازے کے قریب ساری کا آنچل
سر پر رکھے کھڑی ہے (خدا کا شکر ادا کرتے وقت عورتیں
خاص طور پر سر کو ڈھک لیتی ہیں) ماں نے گلے سے لگا لیا اور
زار زار رونے لگی۔ بڑے بھائی قریب آ گئے، تھوڑی دیر میں
بولے
"ماں اب تو خوش ہونے کی بات ہے۔ اب کیوں روتی ہے"

ماں نے میرے بھی آنسو پونچھے
ایک لڑکے نے اپنی کارگزاری سُناتے ہوئے کہا "یہ پُرانے
مکان کی طرف جا رہے تھے اِدھر لے آیا"
"ہاں بیٹا وہ مکان بھی چھوٹ جائے" گا ماں نے کہا
لڑکے نے اس قِصّہ کو پھر چھیڑ دیا تھا میں نے کہا
"ماں مکان رہن ہو گیا اور مجھے خبر بھی نہ کی!!"
"بیٹا تمہارے بھائی لکھ رہے تھے میں نے کہا نہ جانے
وہ کس حالت میں ہے اگر تکلیف میں ہوا تو اس خبر کو سُن کر اور بھی
پریشان ہو گا اس لئے میں نے اطلاع نہ کروائی"
اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں لڑکے ایک ایک کر کے
چل دئے۔ ماں، پوتی کو لے کر ناشتہ کی تیاری میں لگ گئی
اب پُرانے ساتھی ایک ایک کر کے آنے لگے۔ اِن میں سے
ایک کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں اپنے ساتھ کچھ دولت نہیں لایا
ہوں طرح طرح کے سوال کرنے لگا
"امتحان کی تو بعد میں دیکھی جائے گی پہلے یہ بتائیے کہ ماہوار
کماتے کیا ہیں اور ساتھ کیا لائے ہیں" اس موقع پر ماں بھی قریب
بیٹھ گئی کہ شاید کوئی خوش خبری سُناؤں۔ میں نے آبدیدہ ہو کر کہا

"ابھی تو تنخواہ ہی کم ہے بچانے کی کوئی صورت ہی نہ تھی"
"لوگ کہتے تھے لوٹے گا تو دولت ساتھ لائے گا!!——
سُن لیا چچی —— آپ کے غفار نے کیا جواب دیا ہے!!" ساتھی
نے محبت آمیز نفرت سے کہا
"ہاں دولت ہی لایا ہے۔ بیٹا سات برس کے بعد ماں سے
ملا ہے یہی بڑی دولت ہے" ماں نے تیزی کے ساتھ اُٹھتے
ہوئے کہا
"جی ہاں آپ تو اِن کے غائبانہ میں حمایت کرتی تھیں
اب کیوں نہ کریں گی" ساتھی نے کہا
"خیر ایک زور دار ڈراما کروا دیں —— ہم سمجھیں گے
لائق ہوگئے" دوسرا دوست بولا
گفتگو کا نہج بدلا، فضا بدلی —— کچھ مذاق ہونے لگا
میں اِن چیزوں میں حصہ تو لے رہا تھا مگر اِس مصیبت کو کیسے
بھلا سکتا تھا —— بہنیں، پھوپی یاد کرکر کے مرگئی تھیں ہاں
محلے کی ایک بہن زندہ تھی جو میری محنت کی قدر کرتی تھی اور
مصیبت میں کام آتی تھی —— کچھ ٹہلنا چاہتا تھا وہیں پہنچا
کچھ اور حالات معلوم ہوئے۔ وہ یہ بھی کہتی تھیں "بوڑھی ماں

نے رو رو کر سات برس گزارے ہیں سب لوگ یہی کہتے تھے
کہ تم نے دوسری جگہ شادی کر لی ہے اب واپس نہ آؤ گے
لیکن ماں کی آس قائم تھی وہ ہمیشہ یہی کہتیں ــــــ جب تک
میں زندہ ہوں میرا بیٹا ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا ــــــ
جب کبھی تمہارا خط آتا سر پر آنچل رکھ کر پہلے بھائی سے سنتیں
پھر اس خط کو محلے کے بچوں سے پڑھواتیں ــــــ میرے پاس
خوش خوش چلی آتیں اور کہتیں غفار کا خط آیا ہے۔ اچھا ہوا تم
آئے ماں کی بات پوری ہوئی" بہن نے ناشتہ کے لیے کہا لیکن
میں یہ کہہ کر چل دیا کہ ماں انتظار کرتی ہوگی گھر پہنچا کیا دیکھتا ہوں
کہ پراٹھے، قیمہ، انڈے چائے سب کچھ تیار ہے۔ ناشتہ کیا دو
راتوں کا جاگا ہوا تھا سو گیا

دوسرے دن شام کے وقت گجری (شام کا بازار) دیکھنے
نکلا وہی مستان تنبولی (کھلے پان بیچنے والا) بیٹھا ہے جیسے بچپن
سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ موسموں کا بدلنا، بیماری، شادی،
غمی سب کچھ ہوتا تھا مگر مجھے تو یاد نہیں کہ مستان کی دکان شام
کو گجری میں نہ لگی ہو طاعون کے زمانے میں جب سب لوگ
بستی خالی کر دیتے تب یہ بھی کہیں منتقل ہو جاتا ــــــ اسی

مستان کو سات برس بعد آج کچہری میں معمول کی جگہ دیکھ کر
طبیعت خوش ہوئی

میں نے پوچھا "مستان اگر تم سال میں دو چار دن ناغہ
کر دو تو کیا ہرج ہے؟" کہنے لگا "سارا دن گھومنے پھرنے کے لئے
بہت ہے کچہری میں دو ہی گھنٹے تو بیٹھتا ہوں اتنی پابندی تو
ہونی چاہیئے نہیں تو آدمی بے لگام ہو جاتا ہے یہ میرے والد کی
نصیحت تھی۔ کہتے تھے میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ پھر گاہک
میرے وقت کا اعتبار کر کے یہاں چلے آتے ہیں انھیں خوش
رکھو تو چار پیسے مل جاتے ہیں"۔ اسی بستی میں کتنے نوجوان ہیں
جو مستان کو برا بھلا کہتے ہیں اسے خوش حال دیکھ کر حسد سے
کہتے ہیں "کیا ہوا آخر ہے تو تنبولی" لیکن خود چیتھڑے پہننے کھانے
کے لئے محتاج ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ محنت سے
بھاگنے سے اور کیا ملے گا!!

رات کا کھانا کھا کر حضور احمد صاحب کے یہاں پہنچا یہ
بستی کے دیندار لوگوں میں سے ہیں لیکن خشک مزاج نہیں ہیں امیر و
غریب سب سے تعلق ہے بھنگی اور چمار سے بھی گپ شپ ہے تحصیلدار
کے ہاں سے بھی بلاوا آتا ہے۔ چھوٹی سی معمولی ڈیوڑھی میں رہتے

ہیں اِس ڈیوڑھی کا دروازہ ہمیشہ کُھلا رہتا ہے کہا کرتے ہیں اگر
کوئی مسافر رات کو بستی میں آئے اور اسے سونے کے لیئے کہیں
جگہ نہ ملے تو وہ یہاں ٹھہر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے گھر والوں
سے خفا ہو کر کسی رات کو گھر میں نہ سونا چاہے تو یہاں آ جاتا ہے
یہ اُس کے گھر کے جھگڑے غور سے سُنتے ہیں کام کی باتیں بتلاتے
ہیں زیادہ تر غریب ہندو مسلمان اپنے گھریلو معاملات میں اِن ہی
سے مشورہ لیتے ہیں جب مَیں یہاں رات میں پہنچا تو حسبِ معمول
کئی بستر لگے ہوئے تھے یار لوگ گپ شپ کر رہے تھے معلوم ہوا کہ
لوگوں کی ادلا بدلی ضرور رہے مگر معمولات میں کوئی فرق نہیں ہے
مَیں بھی وہیں سو گیا۔ میری سیلانی طبیعت سے والدہ واقف تھیں
اس لئے اُنھوں نے کچھ نہ کہا حضور احمد صاحب کے دروازہ
کُھلا رکھنے کا اثر مجھ پر اتنا ضرور ہوا کہ کُتے بلّیوں کا ڈر میرے دل سے
جاتا رہا اور مَیں اپنا دروازہ ہمیشہ کُھلا رکھ کر سوتا ہوں مجھے
ایسے لوگوں کی صحبت پسند رہتی ہے جو اپنے لئے کام کرنے کا
ایک طریقہ مقرر کر لیں پھر اس میں فرق نہ آنے دیں بعض لوگوں
نے کہا کہ سات برس دلی میں رہ کر آیا لیکن مستان تنبولی کی صحبت
نہ چھوڑی گویا ان لوگوں کے نزدیک دوستی کا معیار ذات پات ہے

نہ صاحب میری دوستی کا معیار تو "کام کا آدمی" ہے بشرطیکہ وہ خشک مزاج نہ ہو

جوں جوں دن گزرتے گئے لوگوں سے علیک سلیک بڑھتی گئی والدہ صاحبہ ہیں کہ روزانہ نئے نئے کھانے کھلاتی تھیں حیدر آباد کی خاص چیزیں مچھلی کا سالن، ثابت بینگن، کھٹی دال میٹھی دال پھر مرغ کا سالن باری باری سے ملنے لگا حالانکہ نہ تو میرے پاس دام تھے اور نہ بڑے بھائی کے پاس بھائی صاحب کہنے لگے "مجھے بھی تعجب ہے !!"

مجھ سے رہا نہ گیا ایک دن میں نے پوچھا

"ماں ـــــ میں تو ہر مہینے صرف پانچ روپے بھیجا کرتا تھا اس میں سے تم نے کھایا کیا اور بچایا کیسے؟"

ماں کی آنکھوں سے پانی کی دو چار بوندیں ٹپکیں اور اس نے ایسی آواز میں جس میں نہ جانے ملامت کا زیادہ اثر تھا یا محبت کا کہا

"بیٹا تو! اور یہ پوچھتا ہے! ایک ایک دن تیرے ہی انتظار میں کٹا ہے۔ سات برس میں یہ تیاری کر پائی ہوں۔ بیٹا، سات برس میں ـــــ یہی خیال رہتا تھا کہ نہ جانے

تو کس حالت میں لوٹے"
ماں کی اس بات کو سن کر خاموشی کے فرشتے نے پر
پھیلا دئے پھر دیر تک کسی نے کسی سے کچھ بات نہ کی
جو لڑکے قصے کہانیاں پڑھنے کے عادی ہیں وہ چونکتے
ہوئے ہوں گے کہ ماں سے ملاقات والا حصہ تو رقیہ ریحانہ نے
اپنی کہانی "بیکاری اور ماں" میں لکھا ہے یہ اُدھر کی بات اِدھر
کیسے آ گئی! تو سنو آج اس بھید کو کھولنا ہی پڑا جامعہ میں رخصتوں
کی چھان بین کرنے والی کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے میں نے
اس بات پر زور دیا تھا کہ اور رخصتیں چاہے کم کر دی جائیں لیکن بیماری
کی رخصت زیادہ رکھیے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ لوگ جو اپنی
زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جامعہ کے کاموں کو مقدم سمجھیں
اگر یہ بیمار ہو جائیں تو اس قانون سے فائدہ ہوگا ——
ذاکر صاحب نے فرمایا " قانون خواہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو
لیکن جامعہ اپنے خادموں کو نہ بھولے گی اس کے لئے قانون
کی ضرورت نہیں ہے"
میں نے کہا " ڈاکٹر صاحب ہر شخص سے یہ توقع رکھنا
کہ وہ قانون سے بالا ہو کر بھی سوچے گا درست نہیں ہے!"

مجھے اس موقع پر ماں کا وہ سلوک یاد آ گیا جس کا میں نے اوپر
ذکر کیا ہے میرے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے میں نے بھرّائی
ہوئی آواز میں ڈاکٹر صاحب کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی میرا
خیال تھا کہ میں سمجھا نہ سکا لیکن ذاکر صاحب' دل والے آدمی
ہیں وہ سب کچھ سمجھ گئے اور واقعات میں تبدیلی کر کے "بیکاری
اور ماں" کے نام سے کہانی لکھی اور "رقیہ ریحانہ" کے نام سے
چھاپ بھی دی جب میں سچ مچ کی کہانی لکھنے لگا تو بھلا کہانی
کے اس جاندار ٹکڑے کو کیسے چھوڑ دیتا۔ ذاکر صاحب نے
جس زبان میں تم لوگوں کے لئے کہانی لکھی ہے اسی نہج پر یہ
"آپ بیتی" لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ آج کل بمبئی
میں میری طرح بیمار ہیں ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے اصلاح
لے رہا ہوں جنھوں نے تمہارے لیے "مشیر لرڈ کا" ڈراما
لکھا ہے میں نے جتنی بھی چیزیں لکھی ہیں اُن سب پر آپ ہی نے
اصلاح دی ہے جامعہ کے بیشتر لوگ آپ ہی سے اصلاح لیتے
ہیں جب میں نے اس کام کو شروع کیا تو آپ نے فرمایا کہ
بچوں کے لیے "سچی آپ بیتی" کسی نے نہیں لکھی ہے اگر یہ کام
ہو جائے تو ان کے لئے جہاں طرح طرح کی چیزیں لکھی جا رہی

ہیں اس کا اضافہ بھی ہو جائے گا

ہاں تو گھر کی مصیبت کا ذکر ہو رہا تھا لیکن اپنی مصیبت کا رونا
کوئی کب تک روئے دنیا کے کاروبار چلتے رہتے ہیں یار دوستوں
نے کہا "ہم تو صرف سرکس کی نقل ہی پر خاموش رہے۔ جب دلّی
سے آئے ہیں تو کوئی ایسا ڈراما ہو جائے جو کمپنی کو بھی مات کر دے
میں نے کمپنیوں کے ایکٹروں کے نقائص بتانے شروع کئے کہ وہ
گلے پھاڑ پھاڑ کر چلّاتے ہیں مُردے کے سامنے گاتے ہیں۔ سوال و
جواب شعروں میں ہوتے ہیں مذاق کا کام بچوں کو دکھانے کے لائق
نہیں ہوتا۔ کہنے لگے "ہمیں اس بات پر اصرار نہیں ہے کہ یہ سب
باتیں قائم رہیں۔ ہاں ایک بات کی شرط ضرور ہے یعنی ڈراما
ایسا ہو کہ لوگ کہیں اتنا اچھا ڈراما ہم نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں" تین
مہینے کی چھٹیاں باقی تھیں میں بھی تیار ہو گیا۔ ایک لڑکے کے پاس
پُرانا ڈراما "فخر عرب" تھا اس میں بُت پرستی کے نقائص اور ایک
خدا کو ماننے کی خوبیاں دکھلائی گئی تھیں اسی ڈرامہ کے ساتھ
ایک مذاق کا قصہ بھی تھا یہ دکھانے کے قابل نہیں تھا اسے
نکال دیا۔ بیکار گانے اور ناچ اُڑا دیئے ان کی جگہ دربار میں
قوّالی رکھی۔ بعض لمبے منظر چھوٹے کر دئے مثلاً ایک ہی بات کی

دلیل کے لئے لمبی اور غیر ضروری گفتگو نکال دی عشق و محبت کی
باتیں دوسرے رنگ میں تھیں یعنی ایک میاں اور بیوی خدا کی
راہ میں اپنا گھر بار لٹاتے ہیں اس لئے ان کو بدلنے کی ضرورت
نہیں تھی ۔ بیچ میں ایک بات یاد آگئی وہ ہے اسی سے متعلق۔
سید امتیاز علی صاحب تاج رجن کے کتب خانہ دارالاشاعت پنجاب
سے بچوں کے لئے اچھی اچھی کتابیں چھپتی رہتی ہیں۔ رسالہ پھول بھی
یہیں سے نکلتا ہے) نے "ناٹک سبھا" کے نام سے بحث کا ایک
سلسلہ لکھا ہے یہ آج کل اپنے دوساتھیوں کے ساتھ ریڈیو پر
بحث کر رہے ہیں کہ ڈراما کیوں کھیلنا چاہیئے ۔ کس قسم کے ڈرامے
کھیلیں ۔ اداکار چھنتے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھیں پھر اس کے
دکھانے کے لوازمات یعنی ضروری باتیں کون کون سی ہیں امتیاز صاحب
نے دوسری بحث میں راست ہی یہ کہا

" موجودہ شوقیہ لکھنے والوں کے ڈرامے روکھے پھیکے
ہوتے ہیں ہمیں پرانے ڈراموں سے تعصب نہیں برتنا چاہیئے
غور کرنے سے اس میں دلچسپی پیدا کرنے کا مواد بہت ملے گا
اچھے ڈرامے لکھنے کی کوشش تو بے شک ہم جاری رکھیں
لیکن اس عرصہ میں پرانے ڈراموں سے فائدہ اٹھائیں اس طرح

کہ ان میں ضروری ردّوبدل کرکے اعتراض والی باتوں کو
نکال دیں"
یہ بات میرے دل میں بھی تھی لیکن بڑوں کو سمجھانے اور
ان کے لئے کچھ لکھنے کا طریقہ نہیں جانتا ہوں اس لئے چُپ رہا
چونکہ اس چیز سے مجھے دلچسپی ہے اس لئے بڑے جو کچھ کہتے ہیں
وہ سُن لیتا ہوں ——— ہاں تو "فخر عرب" ڈرامے کا کام بڑے
لڑکوں میں تقسیم کردیا گیا۔ دن کا کاروبار ختم کرنے کے بعد لوگ
ایک احاطہ میں جمع ہو جاتے تھے۔ جب تک "پارٹ" یاد نہ ہو
سکھانے کا لطف نہیں آتا ہے اس لئے پہلے پہل معاملہ یوں ہی
رہا ——— پھر اداکاری دکھانے سے لوگ شرماتے تھے
بس میرا کام دیکھ کر ہنستے تھے اور لُطف اٹھاتے تھے میں نے
کہا ——— "جناب اِس کا مطلب یہ ہوا کہ میں روزانہ تماشہ
دکھایا کروں اور آپ لوگ بیڑیاں پیتے ہوئے میرے کام کی
داد دیں" میں جھوٹ موٹ خفا ہو کر جانے لگا۔ لوگوں نے
خوشامد کی اور "پارٹ" یاد کرنے کا وعدہ کیا میں نے اِس
عرصہ میں ایک دو لڑکوں کو "پارٹ" یاد کرا کے اچھی مشق
کروائی جب دوسرے دن سب لوگ جمع ہوئے تو ان لڑکوں کا

کام دیکھ کر سب کو جوش آیا اور ہر شخص اداکاری کے شوق میں دھینگا مشتی کرنے لگا (ایک بات اور یہ بتا دوں کہ کام کرنے والوں میں کچھ تو مدرسے کے بڑے لڑکے تھے کچھ میرے ساتھی جو اب کاروبار کرنے لگے ہیں اور بعض ادھیڑ عمر کے لوگ۔ جہاں میں "لڑکوں" کا لفظ استعمال کروں اس سے مُراد یہ تینوں قسم کے کام کرنے والے ہوں گے)، ڈراما عام لوگوں کو دکھایا جانے والا تھا۔ گانے بجانے کا انتظام بھی تھا۔ طبلہ اور ہارمونیم بجانے والے ایک چھوڑ کئی تھے۔ ساز کا شوق رکھنے والے تماشے دیکھتے رہتے ہیں انھیں کام دکھانے کا موقع مل گیا تھا۔ ان باجوں کی وجہ سے ابتدائی مشق کی کوفت جاتی رہی تھی جوں جوں دن گزرنے لگے لڑکوں کا کام بہتر ہوتا گیا تماشہ کھُلے میدان میں دکھایا جانے والا تھا لیکن وہاں بہت بڑا ٹیلا تھا جس کو ہموار کرنے کی ضرورت تھی تم جانو ڈراما محض اداکاروں سے تو ہوتا نہیں ہے پھر عام لوگوں کو دکھائے جانے والے ڈرامہ میں تو بیسیوں بڑی عمر کے کام کرنے والوں کی ضرورت رہتی ہے۔ چندہ جمع کرنا، ہنڈوں کا انتظام، منڈوے کے لیے بلّیاں، ٹین۔ بڑے بڑے پردوں کا لگانا، بیٹھنے کا انتظام، لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لیے جگہ جگہ رضاکاروں کا

پہرہ۔ پھر عورتوں کے پردے کا جھگڑا تو الگ ہی ہے۔ میری رائے ہوئی کہ مشق اسی میدان میں ٹیلے کے پاس ہو تاکہ بڑی عمر کے وہ "فالتو" لوگ جو رات کے نو بجے سے لے کر بارہ بجے تک بیڑیاں پھونکتے ہوئے مشق دیکھتے ہیں اس ٹیلے کو ہموار بھی کریں۔ سب لوگوں کو شوق ہو گیا تھا۔ پٹیل پٹواری۔ تاجر، کسان سب ہی دلچسپی لے رہے تھے مشق وہیں ہونے لگی۔ تین چار راتوں میں ٹیلے کی بجائے بہترین اسٹیج تیار ہو گیا۔ کسانوں کے ہاں سے بلیاں اور رسیاں مانگ کر منڈوا بنا یا گیا۔ میں اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ جوں جوں کام بہتر ہوتا جائے گا لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جائے گی حتیٰ کہ کام کرنے والوں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہو جائے گی ہر شخص یہی کہتا تھا جو مدد ہو سکتی ہے وہ ہم سے لیجئے۔ کسانوں نے منڈوے کا سامان دیا تاجروں نے چندہ۔ امیروں نے اپنا لباس دیا غریبوں نے منڈوا سجایا بانس، گتے، رنگین کاغذوں سے محل اور جیل کے مناظر تیار کئے گئے ایسے مناظر کہ محض انھیں دیکھ کر تالیاں بجتی تھیں کمشنر ضلع سے اجازت لی گئی کھیل کا اعلان ہوا۔ بستی کے لوگ منڈوں کی روشنی میں جوق در جوق جمع ہونے لگے سارا میدان بھر گیا۔ تعداد ہزاروں تک

پہنچ گئی ۔ اتفاق کی بات کہ اسی دن کوئی چار بجے سے میرے
پیٹ میں اچانک سخت درد ہونے لگا ایسا درد کہ تڑپ تڑپ
کر چلاتا تھا سب اداکار گھبرائے ہوئے تھے میرے گھر سے
منڈوے تک خبروں کا سلسلہ بندھ گیا ۔ میں ہر تھوڑی دیر
میں یہی کہتا "اعلان ہو چکا ہے دیہاتوں سے لوگ چل پڑے
ہوں گے ہزاروں کو مایوسی ہو گی میری وجہ سے کھیل بند نہ کیا
جائے " اس کا انتظام تو پہلے ہی سے کر لیا تھا کہ ضرورت پڑے
تو میری عدم موجودگی میں فلاں شخص رہنمائی کرے گا اس بات
کو جانچنے کے لئے میں مشق کے وقت الگ تھلگ ہو جایا کرتا تھا
پھر بھی کام کرنے والے اداس تھے ۔ اللہ میاں نے انسان
میں عجیب و غریب طاقتیں رکھی ہیں ۔ بعض دفعہ احتیاط رکھنے
والوں کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے !
کیوں ہو رہا ہے ! قدرت اس "عجیب و غریب طاقت" سے
کام لینے کے لئے ایسے ہی موقعے پیدا کرتی ہے ۔ حاسدوں نے
یہ خبر عام مجمع میں پھیلا دی کہ اس ڈرامہ میں ہندوؤں کی
برائی اور مسلمانوں کی تعریف کی گئی ہے اور یہ کہ ہندو مسلمانوں
میں فساد ہو جانے کا اندیشہ ہے کھیل شروع ہونے میں

شاید آدھا گھنٹہ رہ گیا تھا میں درد کی حالت میں اپنے مکان
پر ہی تھا گھر کے سب لوگوں کو تماشہ دیکھنے کے لئے بھیجدیا تھا
صرف ماں میرے پاس رہ گئی تھی۔ جوں ہی یہ منحوس خبر میرے
کانوں میں پہنچی خیال آیا "کیا آج تماشا نہیں ہوگا! اور ہوگا
تو بلوہ ہو جائے گا !! ——— میں ایک دم چارپائی سے
اُٹھ بیٹھا اور شال اوڑھے باہر نکلنے لگا۔ ماں نے مجھے پکڑ لیا
میں نے اُسے دھکّا دیتے ہوئے کہا
"ماں تو نہیں جانتی آج بلوہ ہو جائے گا ——— مجھے
جانے دے۔ مجھے جانے دے" میں لوگوں کو چیرتا پھاڑتا اسٹیج پر
پہنچا۔ ہزاروں تماشائی سارے میدان میں چھائے ہوئے تھے۔
تل دھرنے کو جگہ نہ تھی بستی کے پڑھے لکھے اور بے پڑھے سب ہی
لوگ تھے پہلے پردے کے سامنے کھڑا ہو گیا لوگوں نے دیر تک
تالیاں بجائیں۔ شاید بعضوں کو یہ خیال ہوا ہو کہ افواہ سُن کر
تماشہ کے بند ہونے کا اعلان کرنے کے لئے سامنے آیا ہے۔
میں نے کہنا شروع کیا "حضرات ——— یہ خبر پھیلانے کی کوشش
کی گئی ہے کہ آج کے ڈرامہ میں ہندوؤں کی مذمت اور مسلمانوں
کی تعریف ہے یہ غلط ہے اوّل تو اس تماشے کی کہانی سمندر پار کے

عربوں اور رومیوں سے متعلق ہے۔ چنانچہ کام کرنے والوں کو آپ اسی لباس میں دیکھیں گے رہی یہ بات کہ ایک خدا کو مانیں یا کئی خداؤں کو اس بارے میں مسلمان تو رہے ایکطرف خود ہندوؤں کے پڑھے لکھے اور بے پڑھے لوگوں میں بحث رہتی ہے کہ خدا کو کس طرح مانیں یہ تو دونوں ہی کا مسئلہ ہے اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے! پھر ہماری بستی میں سارے کام ہندو مسلمان مل کر کرتے ہیں۔ طبلہ بجانے والا کون ہے "لکا رام" بلیاں کس نے دیں "باؤ بھلل بھائی" اور "پوشٹی" نے۔ ہنمنت راؤ وکیل نے جو اس قدر کٹر سناتنی ہیں اپنا ہارمونیم دیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے اگر جھگڑے کی بات ہوتی تو یہ لوگ پہلے سے الگ ہو جاتے" سنا ہے کہ میں نے آدھے گھنٹے تک تقریر کی لوگ اس طرح چپ چاپ سنتے رہے جس طرح مدرسے کے لڑکے جلسوں میں سنتے ہیں ریاستوں میں نعرے لگانے کا قاعدہ نہیں ہے ورنہ لوگ "انقلاب زندہ باد" "غفار صاحب زندہ باد" کے نعرے ضرور لگاتے۔ بیچارے تالی بجا کر چپ رہے مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس تقریر میں اور کیا کیا کہا ہاں اتنا یاد ہے کہ پیٹ کا درد غائب ہو گیا تھا وہی پیٹ کا درد جو میری جان لے رہا تھا

رات کے تین بجے تک کھڑے ہو کر ڈراما کروایا آخر میں بستی کے
معزز لوگوں کی طرف سے انعامات کا اعلان ہوا
وہ لوگ جو ڈرامے کے کام کو اخلاقی حیثیت سے گرا ہوا
اور اس میں حصہ لینا عیب سمجھتے تھے انھیں بھی یہ ساری
روئداد معلوم ہوئی کہنے لگے

"ہمارا خیال تھا کہ لڑکے ایک جگہ جمع ہو کر
اُلٹے سیدھے گانے گائیں گے۔ آدھی رات تک جاگنے
سے صحت خراب ہو گی۔ اپنے کاروبار سے جی چُرائیں
گے۔ پھر عشق و محبت کی باتیں گلی گلی سُنائی دیں گی
آپ نے ان سب باتوں کا خیال رکھا اور سُنا ہے
کہ رات کو سب لوگ تماشے کے قائل ہوئے
غازی مُصطفیٰ کمال پاشا کے ڈرامے میں تو
صرف تاریخی باتیں ہیں جب اس قدر منڈان (سارا
کاروبار) سجا سجایا ہے تو دوسرا ڈراما کھیلنے میں
سہولت رہے گی گرمیوں کے دن ہیں اسٹیج خراب
نہ ہو گا، آپ ہماری خاطر اس دوسرے ڈرامے
کو بھی دکھا دیجیے"

مجھے ڈرامے کے "پلیٹ فارم" پر سب لوگوں کو متفق کرنا اور اس کی اخلاقی حیثیت کو اونچا کرنا تھا اس سے بہتر موقع اور کیا ملتا میں راضی ہو گیا اس تماشے کے دیکھنے میں تھانے کے امین (انسپکٹر) صدر مدرس صاحب مع عملہ۔ مقامی ڈاکٹر، وکلا، بزرگ لوگ سب ہی موجود تھے۔ تحصیلدار صاحب کہتے تھے کہ میں بھی اپنے بنگلے پر سنتا رہا۔ بچوں کی ایک فوج بھی تیار کرائی تھی ان کی لڑائی بہت پسند کی گئی۔ لوگ اسٹیج کے آداب سے واقف نہیں تھے، ایک صاحب تو اسٹیج پر چلے گئے اور اس ننھی سی فوج کے کمانڈر کو انعام میں پانچ پانچ کے دو نوٹ دیئے کہ سب مل کر مٹھائی کھائیں

بستی میں بے روزگاری پھیلی ہوئی تھی بعض دوستوں کی رائے ہوئی کہ میں کمپنی قائم کر دوں۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ مجھے جامعہ میں کام کرنے کا بہت موقع ہے۔ وہاں تین سال تک مدرسی کی ہے۔ جامعہ والوں نے موگا بھجوایا ہے وہاں کے لڑکے بھی ڈرامے کے شوقین ہیں اس لئے میں تو اس کام کے لئے تیار نہیں ہوں ایک جاننے والے دوست نے کہا "غالباً آپ کو اُن روپیوں کا خیال ہے جو جامعہ نے معاہدہ لے کر موگا کی

تعلیم پر خرچ کیا تھا !! اس کی تو فکر نہ کیجئے چند کھیلوں میں یہ رقم نکل آئے گی بلکہ جامعہ کی ماہوار امداد مقرر کردیں گے حال ہی کی بات کہ "بانگلنڈہ کمپنی" جس کے کھیل ہمارے کھیلوں سے کہیں گرے ہوئے ہیں ضلع کے لوگوں کو لوٹ رہی ہے۔ مانا کہ ہمارے کھیلوں میں بازاری عورتیں ناچ. خراب مذاق نہیں ہے لیکن اس سے تو ہمارے کھیلوں کی قدر بڑھ گئی ہے ہر جگہ پڑھے لکھے لوگ ہمارا استقبال کریں گے !!"

"مہربان من یہ صحیح ہے کہ اگر کمپنی قائم کی تو انشاء اللہ خاص بلدہ کے (مراد شہر حیدرآباد دکن سے ہے) پڑھے لکھے لوگوں کو بھی قائل کردیں گے لیکن سوال جامعہ سے علیٰحدگی کا ہے وہاں ایسے لوگ کام کرتے ہیں جنھوں نے معاہدے دے رکھے ہیں کہ مرتے دم تک کام کریں گے اور ڈیڑھ سو روپیوں سے زیادہ نہ لیں گے جی نہیں چاہتا ہے کہ ایسے لوگوں کا ساتھ چھوٹے پھر ایک بات میرے دل میں اتر گئی ہے کہ لڑکے سارے کام کرسکتے ہیں میں نے موگا میں بھی یہی بات سیکھی ہے میں لڑکوں ہی کے ساتھ کام کرتے ہیں خوش رہوں گا" تم جانو کسی کو "سچا شوق" ہو جائے تو پھر اسے پورا کرنے کے لئے آدمی طرح طرح کے راستے

ڈھونڈھتا ہے۔ ایک نہ شد دوسرا شد۔ کچھ لوگوں نے کہا آپ کی چھٹی
ختم ہونے میں ایک مہینہ باقی ہے ایک کھیل اور سکھا دیجئے یہ تین
ہو جائیں گے مُدھول سے باہر کسی مقام پر تین کھیل کھلا کر آپ
جامعہ چلے جائیے۔ ہم خود دو ایک کھیل اور تیار کر لیں گے اتنے
آپ دہلی سے کوئی ڈائرکٹر بھجوا دیجئے" میرے ذہن میں فوراً ہی
فیاض حسین صاحب لقمانؔ رسالہ ہونہار کے مُدیر کا خیال آیا
یہ حضرت بھی بڑے من چلے ہیں ڈراموں سے دلچسپی ہے
حیدر آباد کی مقامی کمپنیوں کے ڈائرکٹروں سے تو کہیں اچھے ہیں
جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ میں عبدالواحد صاحب کی طرح ان کے
ساتھ بھی یہ طے پایا تھا کہ کوئی اور اچھا کام نہ ملا تو کمپنی ضرور
قائم کریں گے نوکری سے انھیں دلچسپی نہیں ہے کتابت جانتے
ہیں لیکن اس کام سے لگاؤ نہیں ہے اور یہ کام ہے بھی
مُردہ دل لوگوں کا۔ جامعہ سے ایف اے کامیاب ہونے کے
بعد رسالہ ہونہار نکالنے لگے مجھ سے کئی دفعہ کہا تھا کہ کسی ایسے
کام کا مشورہ دوں جس کے کرنے میں رسالہ ہونہار کا کام بھی
جاری رہے ــــــــ میں نے خیال کیا اس کمپنی کا کام ان کے لئے
اچھا رہے گا۔ کھیلوں کے ذریعہ جب بہت سارا روپیہ جمع

ہو جائے تو اِس فن کے بہترین لوگ یعنی ڈرامہ لکھنے والے
سٹیج سجانے والے۔ تماشے تیار کرانے والے (ڈارکٹر) مُلازم
رکھ لیے جائیں گے۔ فیاض صاحب کا تجربہ اور بڑھ جائے گا
اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے رضامندی ظاہر کر دی اب ایک
بڑی مشکل یہ تھی کہ اس شوق میں حصہ لینے والے، تین چوتھائی
لوگوں کو تو کسی کا ڈر نہیں تھا لیکن ایک چوتھائی ساتھیوں کو اندیشے
ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ یہ بات ان کے سرپرستوں کو معلوم ہوگئی تو
وہ سخت مخالفت کریں گے اور کمپنی کے قائم ہونے میں طرح طرح
کی رُکاوٹیں ڈالیں گے ان کی بجائے اور لوگوں کو لیتے ہیں تو
انھیں پچھلے دو کھیل یاد نہیں ہیں میری موجودگی میں اس کام کا چل پڑنا
ضروری تھا بہت سوں کو یقین تھا کہ وقت آنے پر یہ جامعہ کی
طرف چل کھڑا ہو گا اُس وقت کوئی سمجھا بھی نہ سکے گا۔ جن لوگوں
کے سرپرستوں کی طرف سے اندیشہ تھا انھوں نے کہہ رکھا تھا کہ
اگر ہماری بجائے اور لوگ لیے گئے تو ہم رُکنے والے نہیں چاہے
ہماری جان چلی جائے غرض کہ ایسی ایسی بیسیوں رکاوٹیں تھیں۔

میں نے کہا آپ لوگ گھبرائیے نہیں میرے کہنے پر
چل کر تمام تیاریاں خفیہ طور پر کیجیے۔ عہد کیجیے کہ ہم اِس کا ذِکر

زبان پر نہ لائیں گے مجھ سے زیادہ میرے ساتھی شوقین تھے۔
بھلا وہ ان ہدایتوں پر عمل کیسے نہ کرتے۔ طے پایا کہ پندرہ دن
کے بعد چل پڑیں گے اس عرصہ میں ایک ساہوکار کو ابتدائی
رقم خرچ کرنے کے لیے تیار کر لیا وہ بھی حصہ دار کی حیثیت سے
شریک ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ سات آدمیوں کی ایک انجمن
بنی جو کمپنی قائم کرنے والی اور اس کے نظام کو چلانے والی ذمہ دار
تھی (یعنی یہ سات آدمی کمپنی کے مالک ہوئے ان ہی میں سے
ایک ساہوکار تھا باقی چھ اداکار تھے) اور لوگوں کو سات روپیے
سے تیس (۳۰) روپیے تک ملازم رکھا گیا یہ تو طے تھا کہ جب کمپنی کا کام
چل پڑے تو تنخواہوں میں من مانا اضافہ ہو جائے گا۔ دو دن
کے لیے ضلع میں جا کر میں نے اشتہارات، ٹکٹ چھپوا لیے، مطبع
والے پوچھتے تھے "یہ کمپنی ضلع میں بھی آئے گی یا نہیں" میں نے کہا
قائم اسی لیے ہوئی ہے"! ایک اور ساتھی نے "دی نیشنل تھیٹریکل
کمپنی آف حیدرآباد دکن" کے منیجر کی حیثیت سے ایک مہینے کے
کھیلوں کی اجازت لے لی۔ جگہ کے انتخاب میں اس بات کا خیال
رکھنا تھا کہ ریلوے اسٹیشن نہ ہو تاکہ اس کی خبر فوراً ہی عام نہ
ہو جائے۔ مُدھول سے کافی دور جنگل کے علاقہ میں ایک مقام

زرخیز ہے یہاں کے لوگ خوش حال ہیں چھوٹی چھوٹی کمپنیاں
یہاں سے کافی رقم لے جاتی ہیں تین چار دن پہلے ایک معتبر آدمی
کو بھیج دیا کہ وہ ہم لوگوں کے ٹھہرنے اور اسٹیج کے لیئے جگہ کا
انتظام کرے تاریخ مقررہ پر رات کے بارہ بجے تین لاریاں بستی
سے باہر کھڑی تھیں چپ چاپ سامان لادا اور خدا کا نام لے کر
ہم لوگ چل پڑے۔ اندھیری رات تھی راہگیروں کا آنا جانا بند
ہوگیا تھا یہ میرا دوسرا خفیہ سفر تھا لیکن اس دفعہ میں تنہا نہیں
بلکہ پچاس کے لگ بھگ شوقین لوگوں کی جماعت تھی، یہ سب
تہیہ کر چکے تھے کہ ہم مشکلوں کا مقابلہ کریں گے" صبح اٹھتے ہی بستی
والوں میں کھلبلی مچ جائے گی پچاس آدمی غائب ہیں شاید صبح ہی سے
تلاش شروع ہو جائے" لیکن ہم نے ہوشیاری یہ کی تھی کہ جس سرپرست
کی طرف سے سب سے زیادہ اندیشہ تھا ان کے آدمی کو وہیں
چھوڑ آئے تھے کہ وہ کھیل سے چند گھنٹے پہلے ہمارے پاس پہنچ جائے گے
"میرے متعلق لوگ کیا کہیں گے"!! —— لیکن مجھے اطمینان تھا میرے
ساتھ اُن لوگوں کی جماعت تھی جو بے روزگاری کی وجہ سے پریشان
تھے ان میں سے بعض کے کھیت اور گھر بستی کے "شریف لوگوں"
نے چند ٹکوں میں رہن رکھ لیئے تھے یا قبضہ جما لیا تھا مجھے بستی

کے اور بھی "شریف لوگوں" کا حال معلوم تھا جو سفید لباس میں "با عزّت" طریقے سے لوگوں کو لوٹ رہے تھے ۔ میں اُن بے عنوانیوں سے بھی واقف تھا جو بستی میں ہو رہی تھیں اگر کمپنی قائم کرنا عیب ہے تو مجھے یقین تھا کہ اُن عیبوں کے مقابلے میں اِس کا کوئی شمار ہی نہیں ہے اور اگر عیب ہے تو یہ "شریف لوگ" تماشے کیوں دیکھتے ہیں !!" نہ معلوم ساتھیوں کے دل میں کیا کیا خیالات آ رہے تھے ہماری لاریاں صبح صبح ندی کنارے پہنچ گئیں ناشتہ کیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برات جا رہی ہے نرنگل وہاں سے قریب تھا تھوڑی دیر میں وہیں جا پہنچے

"آپ لوگ غلط وقت آئے آس پاس کے گاؤں میں ہیضہ ہے اور یہاں بھی افواہیں پھیل رہی ہیں" بستی کے ایک شخص نے کہا ـــــ میں نے دل میں کہا "اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلیہِ رَاجِعُوْن" ایسے موقعوں پر بدحواس ہونے سے معاملہ اور بھی خراب ہوتا ہے جس شخص کو پہلے سے بھیجا گیا تھا یہ اُس کی غلطی تھی کہ اُس نے ہمیں اطلاع نہ دی لیکن وہ چپکے سے کہنے لگا

"غفار صاحب خفا نہ ہوں اللہ بہتر جانتا ہے یہی خیال تھا کہ اگر میں نے وبا کی اطلاع دی تو یقینی بات ہے کہ کمپنی

باہر نہ نکل سکے گی!"

ساتھی پر غصہ ضرور آیا مگر "شوق" کا مطلب خوب جانتا تھا میں نے کہا

"کمبخت اب اس کام کو نبٹانا بھی تو ہے۔ میرے ساتھ چلو" ہم دونوں تلنگی کمپنی کے منیجر کے پاس پہنچے۔ یہ کمپنی کافی روپیہ کما کر ہیضہ کی افواہوں کی وجہ سے واپس جا رہی تھی (ساتھی کی ایک غلطی یہ بھی تھی کہ اس کمپنی کے ٹھہرنے کی اطلاع نہ دی ایسے موقعوں پر دوسری کمپنی کے آجانے سے دونوں کو گھاٹا رہتا ہے) اسٹیج لگا لگایا تھا وہ مشکل سے بیس (۲۰) روپئے فی کھیل کے حساب سے تین کھیلوں کے لیئے راضی ہو گیا، دوسرے دن کے لیئے کھیل کا اعلان ہو گیا صبح ہوئی کھیل کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اسی ساتھی کا انتظار تھا جسے چھوڑ آئے تھے۔ یہ بہترین اداکاروں میں سے تھا۔ خفیہ خبر رسانی کے لیئے چند آدمی لگا رکھے تھے اتنے میں خبر آئی کہ اس اداکار کو "کوٹھری" میں بند کر دیا گیا ہے "اب کیا ہو! ــــــ تماشے کا اعلان تو ہو چکا!! ــــــ تین دن سے پچاس آدمیوں کے کھانے پینے پر کافی رقم خرچ ہو رہی ہے ــــــ" میرے ساتھی پریشان تھے میں نے کہا گھبرانے کی

ضرورت نہیں شام تک اسی پارٹ (کام) کو میں خود یاد کروں گا
اور آج کے کھیل میں ادا کار بنوں گا" سکھانے میں بہت سارے
جملے یاد ہو گئے تھے۔ شام تک یاد کرتا گیا۔ کھیل ساڑھے نو بجے
شروع ہونے والا تھا۔ ٹکٹ گھر پر باجا بج رہا تھا۔ ہیضہ سے مرے
ہوئے ایک آدمی کی میت اسی راستے سے گزری۔ شہر ہو تو
پتہ نہ چلے یہ بات عام ہونے لگی محلے میں خوف و ہراس پھیلنے لگا
اور دروازے بند ہونے شروع ہوئے جو لوگ چل پڑے تھے
انھوں نے ٹکٹ خرید لئے۔ ہر درجے میں کچھ نہ کچھ لوگ نظر آتے
تھے۔ میں نہ جانے کن کن خیالات میں ٹہل رہا تھا۔ باجے کی آواز
"بے روح" معلوم ہوتی تھی ——— "آج بستی والوں کے لئے
کتنا خوشی کا دن ہوتا۔ ٹکٹ گھر پر لوگوں کی بھیڑ ہوتی۔ اسٹیج کھچاکھچ
بھرا ہوا نظر آتا۔ لوگ دوسرے کھیل کے انتظار میں رہتے" ہاں
یہ خیالی باتیں ثابت نہ ہوتیں مجھے یقین تھا کہ ایسا ہوگا۔ مگر حادثات
پر کون قابو پا سکتا ہے اگر قابو پالے تو زندگی میں اُتار چڑھاؤ کیسے
ہو بغیر اس کے زندگی کی کہانی بے مزہ رہے۔ ساڑھے نو بجے
ساتھیوں نے کہا لوگوں کا کچھ اور انتظار کریں میں نے سیٹی
بجا دی۔ باجے کی آواز کے ساتھ تماشہ شروع ہوا۔ لقمہ

دینے والے کی مدد سے اپنا کام نبھاتا گیا بعض حرکتوں سے
لوگ محظوظ (خوش) ہوئے لیکن یہ حرکتیں پارٹ بھولنے کی
وجہ سے کرتا تھا دھیان دینے کا موقع ہی نہ ملتا تھا کہ میں یہ
کیا کر رہا ہوں۔ سوال کے بعد جواب، جواب کے بعد سوال ہی کا
سلسلہ بندھا ہوا تھا——— کسی اداکار کے گاتے وقت کچھ خیال
آتا بھی تو یہی کہ "آج پہلا کھیل ہے اور لوگوں کی بھیڑ نہیں" صبح
حساب لگایا تو ساٹھ روپیوں کی آمدنی ہوئی۔ بیس روپئے سٹیج
والے کو دئے اور چالیس روپئے کمپنی کے محاسب نے رکھ لئے
ہر شخص یہی کہتا تھا کہ ہیضہ شروع نہ ہوتا تو پہلا کھیل ڈھائی سو سے
اوپر کا تھا۔ خیال تھا کہ اگر کسی نے ٹھیکہ لیا تو ہم ڈھائی سو سے
کم کی بات نہیں کریں گے ایک دن بیچ کر کے کھیلنے کا ارادہ تھا
تاکہ اداکاروں کو آرام ملے۔ ہیضہ سے ایک تو موتیں ہونے لگیں
مدرسے بند ہوگئے بازاروں میں رونق نہ رہی۔ تھانے
کے امین (انسپکٹر) نے اطلاع دی کہ اب تماشے دکھانے کی اجازت
نہیں ہے۔ اگر اطلاع نہ دیتے تو میں خود کسی کھیل کی اجازت نہ دیتا
کسی دوسری جگہ جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ وبا کا نام برا ہوتا
ہے، وہاں بھی یہی مشکلیں ہوتیں ڈھول والوں کو ان حالات

کی اطلاع ہو چکی تھی ۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم فوراً واپس ہو جائیں
غرض یہی طے ہوا کہ کمپنی کا کام اس وقت ملتوی رکھا جائے
ہم سب مزید پریشانی اٹھائے بغیر گھر پہنچ گئے
جامعہ کھلنے والی تھی میں دہلی چلا آیا

گیارھواں سال

اگست ۱۹۳۰ء سے جولائی ۱۹۳۱ء

شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کو علم ہو گیا تھا کہ میں کسی کمپنی کے چکّر میں پھنس گیا ہوں لیکن انھیں یقین تھا کہ توڑوں گا ضرور۔ جب دہلی پہنچا تو انھیں بھی اطمینان ہوا فرمانے لگے :-

"میں نے ایک کام ایسا سوچ رکھا ہے جو آپ کی طبیعت کے مناسب ہے جسے آپ رفتہ رفتہ بہتر بنا سکتے ہیں۔ پہلی چار جماعتیں (ابتدائی اوّل سے چہارم تک) آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ چھوٹی سی نئی عمارت جو بن رہی ہے اس میں چند کمرے تیار ہیں اپنا کام وہیں شروع کیجیے۔ جن جن لوگوں اور

چیزوں کی ضرورت ہوگی وہ آپ بتائیں گے میں انتظام کر دوں گا"

اگرچہ پچھلے ساڑھے تین مہینے رات دن جاگ کر ایک کر دئے تھے چند راتیں بھی آرام سے سونے کے لئے نہیں ملی تھیں لیکن مجھے یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ میں تھکا ماندہ ہوں نہ جانے یہ طاقت کہاں سے آ گئی تھی خدا کا نام لے کر جب اس نئے کام کو شروع کیا تو اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ طاقتور محسوس کرتا تھا، غالباً اس نئے کام کے شوق نے میری ہمت میں اضافہ کر دیا تھا، یہ اللہ میاں کا قانون ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں ہلانے والوں کی مدد کرتے ہیں۔

جس وقت یہ چار جماعتیں ملی ہیں ان سب میں چالیس کے قریب لڑکے تھے سب سے زیادہ تعداد چہارم کی تھی کچھ کرنے سے پہلے نئے سامان کی لمبی چوڑی فہرست پیش کرنا اچھا نہ معلوم ہوا۔ اُس زمانے میں ڈسک نہیں تھے ٹاٹ کے چند ٹکڑے اور پھٹی پرانی دریوں پر کام شروع ہو گیا کہانی کا طریقہ اور منصوبی طریقہ ان دونوں کو بیک وقت جاری کر دینے کو جی چاہتا تھا مگر اس کام کے لئے میں اکیلا ہی تھا یہ ترکیب سوچی کہ

آدھا وقت تو پہلی جماعت میں دؤں اور آدھا چہارم میں
نئے طریقے سے پڑھانے والوں کی تعداد کو بڑھانے کے لئے
احمد علی صاحب کو موگا بھیج دیا گیا دوسری جماعت محمد عثمان صاحب
کے پاس تھی تیسری شیخ مفتاح الدین صاحب نے لے رکھی تھی
پہلی جماعت میں میرے گھنٹے صبح صبح ہوتے تھے تصویریں
اور کھلونے دکھاتا گھر اور رشتہ داروں کے بارے میں بچوں سے
سوالات کرتا باغیچہ تو تھا نہیں جہاں نئے اور پرانے بچوں کو
لے جاکر ان کا دل بہلاتا البتہ باغیچہ کی تصویریں جماعت میں
لگا رکھی تھیں ان ہی کی سیر کراتا کہانیاں سنتا سناتا کچھ کھیل
کھلاتا اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا پھر قاعدے کی کہانی یاد کرادی
گتے کے ٹکڑوں پر کہانی کے جملے اور الفاظ لکھ لئے تھے طرح طرح
کے کھیلوں کے ذریعہ بچوں نے کوئی ایک مہینہ میں کہانی کے
سارے جملے اور لفظ پہچان لئے۔ پھر ان لفظوں کے ذریعے
نئے نئے جملے بنانے لگے۔ تختہ سیاہ سے دیکھ دیکھ کر نقل بھی
کرنے لگے تھے جملوں اور لفظوں کے خاکہ میں رنگ بھرنے لگے
'کوّا' میں کالا رنگ 'طوطا' میں ہرا 'چڑیا' میں جس طرح
کا جی چاہے بچے کہتے تھے بس ایسا کام زیادہ کروائیے" مگر

میں بھی اپنا کچھ مطلب نکال کر ہی ایسا کام کراتا تھا ان سے کہتا کہ فلاں
فلاں لڑکے لفظ نہیں پہچانتے ہیں انھیں رنگ بھرنے کا کام نہیں
دیا جائے گا لڑکے اس شوق میں سارے لفظ پہچان لیتے۔ غرض
ڈیڑھ مہینے میں پڑھنے پڑھانے کے دھندے کو یہ لڑکے سمجھ گئے تھے
لیکن یہ لکھنا پڑھنا جھوٹ موٹ کا تھا حرف تو پہچانتے نہیں تھے
لفظ کے ذریعے حرف کی شناخت کرائی۔ آوازوں کی اونچ نیچ بتائی
ا، و، ی، کی مشق میں بہت دلچسپی لیتے تھے اور دلچسپی کیوں
نہ لیتے کہہ دیا تھا کہ جب "آ" کی آواز نکالیں تو لڑکے ہاتھ
کو اونچا کریں (جا، تا، وا، میں) جب "و" کی آواز نکالیں تو
انگلیوں سے گول چیز کا اشارہ کریں (جو، تو، دو) میں "ی"
کی آواز کے وقت ہتھیلی کو نیچے لے جائیں (جی، تی، دی میں)
جب دو حروف صحیح کی ملی ہوئی آواز نکالنی ہو تو بولنے کے
ساتھ ساتھ دونوں ہتھیلیوں کو ملاکر زور کی آواز نکالیں
(سب، جب، تب وغیرہ میں) اس وقت بڑا مزہ آتا
تھا جب جماعت کے سارے لڑکے مل کر ایسی آوازیں نکالتے
تھے قاعدے میں اصل چیز تو ان ہی چیزوں کا سیکھنا ہے
جب یہ چیزیں آگئیں تو زیر، پیش میں کیا رکھا ہے کہہ دیا تھا

کہ جب نیچے (ــِ) نشان ہو تو "ی" کی آواز ذرا سی نکالیں
اسی طرح (ــُ) نشان پائے جانے پر "وُ" کی آواز تھوڑی سی
نکالیں۔ بھلا لکھنے میں کہیں "زبر" کی ضرورت بھی پیش آتی ہے
اسے تو غیر ضروری سمجھ کر کہیں سکھایا ہی نہیں۔ مُصعب سے
پوچھ لو جواب میٹرک میں پڑھتے ہیں کہتے تھے مجھے تو "زبر"
کا پتا ہی نہیں چلا اور پتہ چل بھی جاتا تو کیا کرلیتے۔ کہاں استعمال
کرتے ؟ البتہ تشدید کے بارے میں تھوڑا سا اشارہ کرنا پڑا
یہ نون غنہ تو مذاق مذاق میں ناک سے آواز نکال کر
لڑکے خود ہی سیکھ گئے۔ کہتے تھے "ن" کی ناک میں (ــّ)
نشان لگ جانے سے رُکاوٹ ہو گئی اور آواز صاف نہیں
نکلتی ہے" ان چیزوں کے سیکھنے کے بعد پھر کیا تھا "چوہے
اور مینڈک کی کہانی" "تصویروں کی کہانی" "ہمارا بکرا" یہ سب
چھوٹے چھوٹے سبق پڑھنے لگے اور تو اور نظمیں پڑھنے کا شوق
بھی ہوا یہ سب کام چھ مہینے میں ہو گیا ان کی ایک نظم یہ ہے

ایک تھی چڑیا ایک تھا کوا — دونوں نے اک دن یہ سوچا
آؤ آج پکائیں چاول — دونوں مل جل کھائیں چاول
دونوں کو یہ بات جو بھائی — چڑیا جاکر چاول لائی

کوّا بیٹھا آگ جلائے | چاول پھر دونوں نے پکائے
کھانے کا جب موقع آیا | تو کوّے نے شور مچایا
بولا چونچ ذرا دھو آؤ | کھانا اچھے ڈھنگ سے کھاؤ
چڑیا چونچ کو دھو کر آئی | اُجلی اُجلی ہو کر آئی
کوّا تب لالچ کے مارے | کھا گیا چاول جھٹ پٹ سارے
پھر ہنڈیا سب راکھ سے بھری | ڈوئی میں بھی گلی کر دی
پھر کونے میں چھپ گیا جاکر | چڑیا نے جب دیکھا آکر
دیکھی ہنڈیا ڈوئی تھالی | یہ بھی خالی وہ بھی خالی
اُس نے اب کوّے کو ڈھونڈا | پکڑا اور چونچوں سے مارا
کوّے نے تب دھوم مچائی | رام دُہائی رام دُہائی

چڑیا اُس کو کیوں نہ ستائے
جس نے پرائے چاول کھائے

مدرسہ کا کام دلچسپ ہو تو یہ ناممکن ہے کہ اقامت گاہ میں اس کا چرچا نہ ہو جب میں چھوٹے لڑکوں کے بورڈنگ خاکسار منزل میں جاتا تو پہلی جماعت کے لڑکے مجھے دیکھتے ہی اپنے ہاتھ اونچے کرتے ہوئے کہتے "ماسٹر صاحب - آ، جا پا (وغیرہ)۔ میں بھی شاباشی دیتے ہوئے اُنگلیوں سے گول

چیز کا اشارہ کرتے ہوئے کہتا "س ــــ و" لڑکے کہتے "سو"
"ج ــــ و" لڑکوں کا جواب ہوتا "جو" اسی طرح سے
ذرا سی دیر میں سب چیزوں کی مشق ہو جاتی اور لڑکے بھی
جمع ہو جاتے۔ مصعب اور نورالرحمٰن صاحب کے بیٹے اسد
کو گود میں لے کر اُستادوں کے پاس جاتا ان سے کہتا دیکھئے
صاحب یہ تماشہ دکھائیں گے۔ بس وہی مشق ہوتی جس کا
ذکر اوپر کیا گیا ہے

پہلی جماعت کی پڑھائی میں موگا والے جملے۔ لفظ
اور حرف پہچاننے کا کام ساتھ ساتھ اس طرح کرتے ہیں کہ
سال کے آخر میں حرف شناسی کا کام ختم ہوتا ہے تم تعجب
سے پوچھوگے کہ آخر سال بھر تک جملے لفظ بلکہ بعض چھوٹی
چھوٹی کہانیاں لڑکے کس طرح پڑھتے رہتے ہیں!! اس کے
کے لئے انھوں نے خاص طرح کا مواد تیار کر رکھا ہے۔ ایسے
جملے، عبارت، کہانیاں بنا رکھی ہیں جو صرف سیکھے ہوئے
حرفوں کی مدد سے پڑھی جا سکتی ہیں سال بھر کا یہ کام
دلچسپ تو ضرور ہے لیکن اس میں بعض نقائص بھی ہیں
مثلاً جو لڑکے پڑھنے کے دھندے کو جلدی سے سمجھ لیں

اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیں تو ان کے لئے موقع نہیں
رہتا ہے جماعت کا ساتھ دینا پڑتا ہے صاحبزادے اگلے حرف
تو جانتے نہیں ہیں اس لئے ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار ہی
نہیں سکتے سال کے آخر میں جاکر اپنے پیروں پر آپ کھڑے
ہو سکتے ہیں کوئی سبق اُستاد کی تیاری کے بغیر جاری نہیں
رہ سکتا اگر استاد اپنے کام میں غفلت برتے تو لڑکے نئی نئی
چیزیں سیکھ ہی نہیں سکتے پھر ایک چیز جس کے متعلق میں ہمیشہ
سے زور دیتا چلا آرہا ہوں ہر ایک کے سامنے اس کا ذکر
کرتا ہوں موگا والوں نے اس پر توجہ کم دی ہے' وہ ہے
حرُوف علّت کا استعمال۔ تم اِسی کتاب کا کوئی ایک صفحہ
لو اور یہ دیکھو کہ اس میں ا، و، ی، کی آوازیں کتنی
دفعہ استعمال میں آئی ہیں اور زیر پیش کتنی دفعہ آیا
ہے میں نے اِسی صفحے کا جو حساب دیکھا تو وہ
اس طرح بیٹھا ا۔پچپن ، و۔پچیس ، ی۔اسّی باقی زیر
پیش ، تشدید، نون غنہ تو ان سے کم ہیں۔ اس سے میں اِس
نتیجہ پر پہنچا کہ اگر ا ، و ، ی ، کی مشق اچھی طرح کرادیں تو پڑھنے
پڑھانے کی بات اچھی طرح اور جلدی سمجھ میں آسکتی ہے

عام لوگ زیر پیش کی علامتوں کو اہمیت دے کر پہلے پہل ان ہی کی مشق کراتے ہیں جو آوازیں استعمال میں زیادہ آنے والی ہیں یعنی (ا، و، ی)، ان پر کوئی دھیان نہیں دیتا ہے میں نے ان سب باتوں کو سامنے رکھ کر "بچوں کا قاعدہ" لکھا ہے۔ ایک علیحدہ کتاب میں "رہنمائے قاعدہ" کے نام سے پڑھانے کا طریقہ بھی لکھ دیا ہے تم چاہو تو اس کا نام "جامعہ کا کہانی کا طریقہ" کہہ لو میں نے تو سب چیزوں کا خیال رکھ کر لکھا ہے اور ہماری جامعہ میں گیارہ سال سے رائج ہے۔ یہ ثانوی چہارم (میٹرک) والے مصعب احسان، شیر افگن اسی طریقے سے تو پڑھے ہوئے ہیں لوگوں کی دیکھا دیکھی حرفوں کے نام یاد کر لئے ہیں ویسے تو سب کچھ حرفوں کی آواز ہی کے ذریعے سیکھا ہے بات ذرا دلچسپ تھی اس لئے کچھ تفصیل سے کہی ورنہ تمھیں ان جھگڑوں میں کیوں لے چلتا !! یہ کام تو استادوں کے سیکھنے کے ہیں لو اب اپنے ساتھیوں کے کام سُنو

باغبانی کا کام مدرسے کے دلچسپ مشغلوں میں سے ایک ہے زمین کافی ہو تو بیک وقت بہت سے لڑکے مصروف رہ سکتے ہیں جس زمانے میں پودے اُگے ہوئے ہوں، پانی

دینے اور سزائی کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہ رہے تو طلبار بوئی ہوئی چیزوں کے متعلق علمی معلومات حاصل کرسکتے ہیں مضامین لکھ سکتے ہیں، باغبانی کا شغل سب کے لئے دلچسپ ہے
نہ جانے لڑکوں کو کس طرح معلوم ہوگیا تھا کہ باغیچہ کی زمین کے بارے میں روزانہ کچھ نہ کچھ پوچھتے رہتے تھے باقی وقت چہارم والوں کو پڑھایا کرتا تھا
"جب بلنے کو زمین بیچنی ہے تو وہ دیر کیوں لگا رہا ہے"؟! چہارم کے ایک لڑکے نے کہا
"زمین کے لین دین میں بہت سے جھگڑے ہوتے ہیں روزانہ شہر جایا کرتا ہوں اللہ نے چاہا تو کام جلدی ہی طے ہو جائے گا" میں نے کہا
مدرسہ کے قریب بنجر زمین تھی خریداری کی بات چیت سے پہلے کوئی لڑکا ادھر کا رُخ بھی نہ کرتا تھا مگر اب جھانک جھانک کر دیکھتے تھے۔ میں ایک دن رنجیدہ سا ہوکر جماعت میں داخل ہوا" کیا بتاؤں، زمین کا معاملہ تو ——"
"ہائیں" لڑکے چونکتے ہوئے
"بلنا کہتا ہے یہاں مکان بنے گا" میں نے دبی زبان

سے کہا

"مکان بنے گا"! لڑکوں نے تیز آواز سے کہا

چھوٹے موٹے کی بات کب تک نبھاتا! کچھ مسکرانے لگا

"اچھا اچھا —— یہ بات ہے —— جی جی"

ایک لڑکا جوں جوں یہ لفظ وہ ایک ایک کرکے کہہ رہا تھا

میری مسکراہٹ بڑھتی جاتی تھی بالآخر لڑکوں نے تالیاں

بجادیں سب کچھ معلوم ہوگیا میں نے کہا "خدا نے چاہا تو

کل سے باغبانی کا کام بھی شروع ہوجائے گا"

"کل سے نہیں آج سے" ایک لڑکے نے کہا

"سوت نہ کپاس —— آگے کیا ہے؟ کس سے

لٹھم لٹھا؟؟" ——

"کوری سے لٹھم لٹھا" لڑکے نے جواب پورا کیا

"ٹھیک ہے کدال نہ پھاوڑا۔ آج ہی سے باغبانی

ہوگی" میں نے پھر کہا

"آپ چلیے تو سہی" ایک لڑکے نے میرا ہاتھ کھینچتے

ہوئے کہا اتنے میں جماعت اٹھ گئی اور ہم سب نئی زمین پر

پہنچ گئے۔ ایک لڑکے نے پیش پیش ہوکر کہا

"دیکھئے صاحب اتنی ساری زمین ہے اس کے کریں ٹکڑے دو ایک ٹکڑے میں تو اوّل، دوم، سوم، والے اور آدھے میں ہم لوگ۔ ہماری تعداد بھی زیادہ ہے کام بھی زیادہ کریں گے"

"پھر" میں نے کہا

"پھر" لڑکا کچھ سوچنے لگا

"یوں کہو نا کہ پھر ہم لوگ ٹکڑیوں میں ہو کر زمین تقسیم کرلیں گے" میں نے سہارا دیا

"جی ہاں ہم لوگ ٹکڑیاں بنا کر زمین بانٹ لیں گے" لڑکے نے سر ہلاتے ہوئے رضا مندی ظاہر کی

"بہتر ہے آپ لوگ فریق بنا لیجئے مگر کاپی پنسل لائیے کہ یہ سب باتیں لکھتے بھی جائیں"

لڑکے دوڑ کر کاپی پنسل لائے۔ ایک صاحب کرسی بھی اُٹھا لائے

"بہت بہت شکریہ مگر پھینکو اِس کرسی کو اس پر بیٹھے بیٹھے طبیعت بیزار ہو گئی ہے" میں ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا لڑکے بھی اِرد گرد بیٹھ گئے لڑکوں نے فریق بنا کر اُن کے

نام اپنی اپنی کاپیوں پر لکھے
"کیا بونا چاہیئے ؟" میں نے سوال کیا
"پھول، سبزی، ترکاری وغیرہ" لڑکوں نے
جواب دیا
میرے تینوں گھنٹے ختم ہو گئے ہیں اب آپ یوں کیجیئے کہ
سبزیوں کے جتنے نام آپ لوگوں کو یاد ہیں یا کہیں لکھے ہوئے
ہوں تو اسے دیکھ کر اپنی اپنی کاپیوں پر لکھ لائیے پھر یہ
دیکھیں گے کہ ان میں سے کون کون سی سبزیاں بوئی مناسب
رہیں گی"
دوسرے دن یہ کام لڑکوں نے دکھایا۔ سردیوں کا
زمانہ آنے والا تھا طے ہوا کہ گاجر، مولی، شلجم، آلو، میتھی
پالک اور مٹر بوئی جائے
یہ ایک دن کا کام تھا اسی طرح مہینوں کام ہوتا رہا
روزانہ نئی نئی باتیں اور نئی نئی دلچسپیاں نکلتی رہیں اگر ان
سب پر دھیان دے کر لکھوں تو اسی کی ایک علیحدہ موٹی سی
کتاب تیار ہو جائے گی کچھ باتیں "باغبانی پروجکٹ" کے نام
سے ایک کتاب میں چھاپ بھی دی ہیں لیکن اس زمانہ میں

فرصت نہ ہونے کی وجہ سے تفصیلی باتیں تو اس میں بھی نہیں
لکھ سکا اس کہانی میں خلاصے کے طور پر چند باتیں اور لکھ دوں
صرف چار صفحوں میں اس سے زیادہ نہیں، جس سے تمھیں یہ
معلوم ہو جائے گا کہ یہ کام سلسلہ وار ہوتا کس طرح ہے لیکن جو کچھ
لکھوں گا تمھارے ساتھیوں کے حوالے سے

فیتہ اور قدم سے ناپ ناپ کر زمین تقسیم کی گئی ایک جگہ
رحیم الدین خاں صاحب (جو اب بی۔ اے میں پڑھتے ہیں)
لکھتے ہیں

"جب ہم لوگ باغیچہ میں گئے تو ہمارا باغیچہ
بالکل جنگل بیابان میں پڑا ہوا تھا اور تمام میں صرف
جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ انار کے، کانٹوں کے
درخت تھے انار کے درختوں پر بہت سی بھڑیں
رہتی تھیں اور سارے باغیچہ میں جنگلی درخت اُگے
ہوئے تھے ماسٹر صاحب ہم لوگوں کو باغیچہ میں لے گئے
(یہ غلط بات ہے لڑکے مجھے باغیچہ میں لے گئے تھے
میں نے پہلے ہی لکھ دیا ہے) وہاں جا کر سب سے
پہلے لڑکوں کی پارٹی بنائی پھر کھیت ناپے تو

ہر ایک لڑکے کو بارہ فٹ لمبا اور چھ فٹ چوڑا
کھیت ملا ہر ایک کھیت میں خوب بڑی بڑی
جھاڑیاں تھیں میرا ساتھی جمیل الدین تھا جب ہم
لوگوں کے جھاڑیاں کاٹنے کا وقت آیا تو ہم سب
لوگ کاٹنے کو کھڑے ہوئے تو ایسے ایسے کانٹے چبھے
جیسے کسی نے پیروں میں آگ لگا دی۔ ہم نے سب
چیزیں کاٹ لیں پھر زمین کو کھودا اور یہ چیزیں بوئیں
مولی، شلجم، میتھی، گاجر، چقندر وغیرہ"

رحیم الدین خاں نے ایک چیز کا تو ذکر ہی نہ کیا مستری کی مدد
سے پختہ نالی بنائی، پانی اور گارے میں لت پت ہو گئے، رہٹ
لگوایا گیا ایسا رہٹ جسے لڑکے بھی آسانی سے چلا لیں "سپرٹ لیول"
نہ ملنے پر دیسی آلہ "آلدی" لگا کر نالی کو ڈھلوان رکھا

اب اس کے آگے کچھ میں بتاتا ہوں کُدال اور پھاوڑے
سے زمین کھود کر کھاد ڈالی گئی، پانی دیا گیا "وتر" کی حالت میں
(وتر ایسی حالت کو کہتے ہیں کہ پانی دینے کے بعد زمین نہ تو
بالکل سوکھی رہے اور نہ اتنی گیلی کہ اس میں پیر رکھنے سے دھنس
جائے) مٹی کو اُلٹ پلٹ کر بیج بوئے کوئی ایک ہفتہ میں

پودے اُگنے لگے دیکھتے دیکھتے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آنے لگا۔ رحیم الدین خاں کے کہنے کے مطابق کہاں خاردار جھاڑیاں اونچے نیچے ٹیلے اور اب ہری بھری کیاریاں نظر آنے لگیں
بونے کے بعد فرصت ملی تھی (۱) ہمارے باغیچہ کی ابتدائی حالت (۲) زمین کی تقسیم (۳) زمین کی تیاری (۴) کھاد کی قسمیں (۵) بیج بونا (۶) پودوں کا اُگنا بڑھنا (۷) سبزیوں کا فروخت کرنا۔ ان پر مضامین لکھوائے گئے باغبانی کے اوزاروں کا چارٹ بنایا گیا جس میں اوزاروں کی کیفیت درج تھی۔ کس کام آتا ہے، کس قیمت کا ہے، کہاں ملتا ہے وغیرہ سبزی کے تصویر والے اشتہارات تیار کیے گئے جب میں نے پچھلے کام کی جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ اور بہت سے کام ایسے ہیں جو کرنے میں نہیں آئے مثلاً موسموں کے لحاظ سے سبزیوں کا چارٹ، پھولوں کا چارٹ، اجناس کا چارٹ، اوزاروں کی تصویریں وغیرہ،
سبزیوں کی تصویریں تو لڑکے ساتھ ہی ساتھ بناتے گئے
مضامین لکھے تقریباً سب ہی لڑکوں نے لیکن جن لڑکوں کے مضامین سب سے اچھے تھے وہ باغبانی پروجکٹ میں چھاپ دیئے گئے، اوپر کے سات مضمون ان سات لڑکوں

کے تھے ۱۔ رحیم الدین خاں ۲۔ قمرالدین خاں ۳۔ فضل الرحمٰن
۴۔ آفتاب احمد ۵۔ محمد نور خاں ۶۔ محمد صدیق ۷۔ محمد ابراہیم
حساب کے کام کا ذکر کرنے کی گنجائش کہاں ہے بس یوں
سمجھو کہ ماسٹر برکت علی صاحب نے اِن ہی کاموں کو دیکھ دیکھ کر
"بچوں کا حساب نمبر ۴" میں سبزیات سے متعلق روپے، آنے
پیسے کی جمع تفریق، ضرب تقسیم کے بہت سے سوالات بنا ڈالے
بعد میں حساب نمبر ۳، ۵، ۶ بھی تیار کر لیا
سبزیوں کا بونا اور ان کا بیچنا کوئی غیر معمولی بات نہیں
ہے لیکن جس مدرسہ میں پہلے پہل یہ کام ہو اور وہ بھی لڑکوں کے
ہاتھوں اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے استادوں نے بھی
سبزی خریدنے میں بڑی آؤ بھگت سے کام لیا پہلی دفعہ کوئی
تیس روپیے جمع ہوئے۔ سیکھنے کے لینے اور دینے میں جو رقم وصول
ہو اسے یوں ہی خرچ نہیں کر دیتے ہیں اب سوال یہ پیدا
ہوا کہ ان روپیوں سے کوئی یادگار قائم کی جائے باغبانی
کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے کتابیں نہیں تھیں طے ہوا
کہ یہ کتابیں منگوائی جائیں
لاہور کے پروفیسر.......... رسالہ مُشیر باغبانی

جاری کر رکھا تھا اور سبزیوں کے متعلق چند کتابیں بھی لکھی تھیں، وہ بھی یہی کاروبار کرتے تھے انھیں یہ روئداد لکھ کر بھیج دی گئی جس کے جواب میں اُنھوں نے بچّوں کے اس کام کو سراہا، ہمت دلائی، آئندہ کے لئے مشورے دیئے اور اپنی کتابیں بہت کم قیمت پر دے دیں۔ رسالہ "مشیر باغبانی" بھی جاری کرا یا گیا ان دو چیزوں کا آنا تھا کہ بچّوں کا کتب خانہ قائم کر دیا گیا۔ اس کے قائم ہونے کے بارے میں ابتدائی چہارم کے طالب علم فضل الرحمن صاحب نے (جو آج کل عربک کالج میں پڑھتے ہیں) ایک جگہ لکھا ہے

"ہمارا کتب خانہ ۱۹۳۰ء جنوری میں کھلا یہ اس طرح قائم ہوا کہ ہم نے اپنے باغیچہ میں سبزی بوئی تھی۔ اس سبزی کو ہر ایک ماسٹر صاحب کے گھر "تحفے" کے طور پر لے گئے کسی نے چار آنے کسی نے آٹھ آنے، کسی نے ایک روپیہ دیا۔ سب مل کر تیس روپئے ہوئے ان روپیوں سے ہم نے اپنا کتب خانہ قائم کیا"

ایک اور بلکہ دو چیزوں کے قائم ہونے کی داستان بھی

بہت دلچسپ ہے جب اس سال کی کہانی لکھنی شروع کی تو
بار بار ان ہی دو چیزوں کے بارے میں لکھنے کو جی چاہتا تھا
اگر شروع ہی میں لکھ دیتا تو عابد صاحب اسے کاٹ دیتے کہ
بے جوڑ چیز کیوں لکھ دی! مگر اب موقع نکل آیا ہے
باغبانی میں لڑکے جو کچھ کام کرتے تھے اُس کی اُجرت
مقرر کر دی گئی تھی کام ختم ہونے کے بعد ہر لڑکے کو ایک پرچی
دے دی جاتی تھی سطے یہ تھا کہ جمعرات کے دن سب لڑکے اپنی
اپنی پرچیوں کے دام دفتر مدرسہ سے لے لیں اُس دن خاص
چہل پہل رہتی تھی ایسے کہ جیسے کسی بڑے مکان کے بنوانے میں
ایک دن راج مزدوروں کا چٹھا بٹتا ہے۔ پہلی جمعرات کو تو
سب کے دام دے دیئے گئے دوسری جمعرات کو اعلان ہوا کہ
جو لڑکے نقدی نہ لینا چاہیں ان کے دام محفوظ رہیں گے اس طرح
کہ ایک کاپی میں ان کی جملہ رقم لکھ کر انھیں بتا دیا جائے گا کہ اب
اب تک اتنی رقم جمع ہے اور پرچیوں کی میزان ایک چھوٹی سی
کاپی (پاس بُک) میں لکھ کر پرچیوں کے عوض یہ کاپی دے دی
جائے گی کچھ لڑکوں نے تو اپنی نقدی لے لی اور بعض اپنی رقم
جمع رکھنے کے لیے تیار ہو گئے دام جمع کرنے والوں کو ڈاکخانے

بچوں کا کتب خانہ
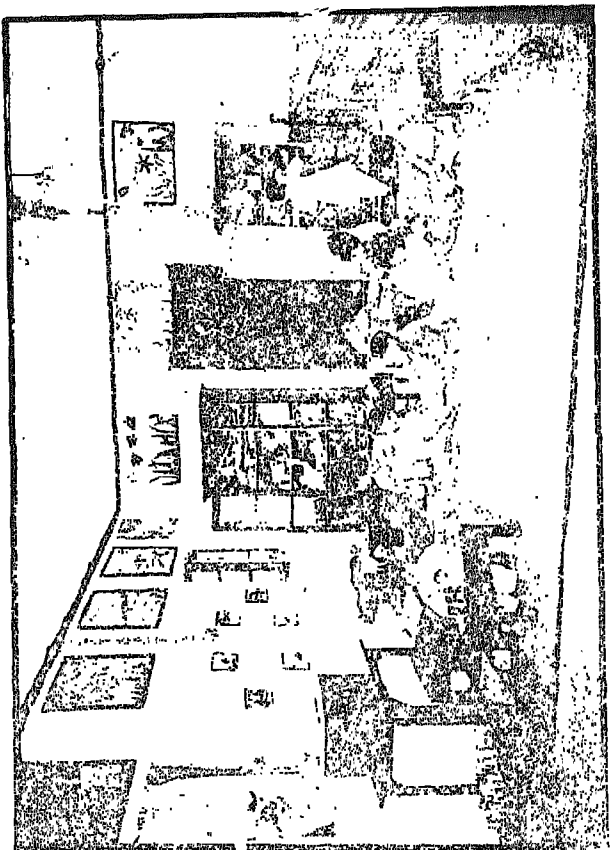
کے نمونہ کی ایک چھوٹی سی "پاس بک" دی گئی جس میں پیسے جمع
کرنے اور نکالنے کا حساب درج ہو جایا کرتا تھا اس پاس بک
میں صرف پانچ قاعدے درج تھے جوں جوں ہفتے گزرتے گئے
جمع کرنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی بعض دفعہ سادہ پرچی (رسید)
کے ذریعے لڑکے اپنی رقم نکال بھی لیتے تھے۔ یہ رقم ان کے حساب
سے گھٹا دی جاتی تھی یہ کاروبار ایک چھوٹے سے کمرے میں
ہونے لگا جہاں ٹاٹ کے دو تین ٹکڑے بچھے ہوئے تھے ایک
ڈسک پر کاپی، دوات قلم رکھا رہتا تھا لڑکے مقررہ وقت میں
پیسوں کا لین دین استاد کی نگرانی میں کرتے تھے جب لڑکوں کو
یقین ہو گیا کہ اس کاروبار میں ان کے پیسوں میں کوئی گڑبڑ نظر
نہیں آتی ہے اور نہ داموں کے بروقت ملنے میں کوئی رکاوٹ
ہوتی ہے تو وہ جیب خرچ کے بچے ہوئے دام اور والدین کے
عطیے بھی جمع کرنے لگے یہ تھی بچوں کے بنک کی ابتدا اس کا
کاروبار اور اس کی کُل کائنات

لین دین کے بعد پھر بھی کچھ رقم جمع ہی رہتی تھی پڑوس
کی اتحادی دُکان موجود تھی لڑکوں نے کہا جب ہمارے مدرسہ
کی کئی چیزوں میں علیحدہ سے کام ہو رہا ہے تو کیوں نہ ایک

دُکان کھول لیں بنک کا جو روپیہ بچا رہتا ہے اس سے سامان
خریدا جائے اس طرح نفع بھی ہوتا رہے گا۔ ضرورت کی چیزیں
پاس کے پاس مل جایا کریں گی اور جتنا سامان چاہیئے ویسا ہی
منگوا لیا کریں گے بنک کی نسبت دُکان کا چلانا مشکل تھا کیونکہ
ذراسی بے احتیاطی سے نقصان ہو سکتا ہے مثلاً غلط داموں پر
چیزیں بیچنا یا حساب کتاب ٹھیک سے نہ رکھنا اُدھار کی وصولی
کا بندوبست نہ کرنا وغیرہ اس لیئے یہ کام بہت احتیاط سے
آگے بڑھایا گیا شروع میں صرف لکھنے پڑھنے کی معمولی معمولی
چیزیں رکھیں کتابوں کا لین دین اس سال رکھا ہی نہیں کھانے
پینے کی چیزیں بھی نہیں منگوائیں یہی خیال تھا کہ لڑکے جب
چھوٹے پیمانے پر کام کرکے سیکھ جائیں تب رفتہ رفتہ سب
چیزوں کا اضافہ کیا جائے گا

مئی کے پہلے ہفتہ میں بنک کا پہلا سالانہ جلسہ ہوا جس کے صدر
حافظ فیاض احمد صاحب تھے منافع تقسیم ہوا منافع ہی کیا تھا
لین دین کے بعد سال کے آخر میں کوئی چھبیس (۲۶) روپیئے جمع تھے
مگر ہر چیز کی ابتدا چھوٹے پیمانے پر تو ہو ہی رہی تھی کسی کو پیسہ
کسی کو دو پیسے غرض کہ دو آنے تک نفع دیا گیا حساب جو لگایا

تو یہ منافع پچیس فی صدی بیٹھا یعنی ایک روپئے پر چار آنے
مگر ایک روپیہ کس کا جمع تھا !! شاید رافع کا جمع رہا ہو ورنہ
اوسطاً چار چھ آنے کے دام جمع تھے

جب باغبانی کا کام شروع ہوا تو اُس وقت ذاکر صاحب
حیدرآباد کے روپیوں کی کوشش کرنے کے لئے وہیں چلے
گئے تھے لوٹ کر آئے تو نومبر کا مہینہ تھا۔ مُولی، میتھی، پالک
اور غالباً شلجم بھی کھانے کے لائق ہو گئے تھے ہم لوگ چاہتے
تھے کہ باغیچہ دکھانے سے پہلے سبزیوں کا تحفہ ایک جلسے میں
پیش کریں تاکہ وہ تعجب کرنے لگیں لیکن بات کہاں چھپتی ہے
انھیں پہلے سے کسی نے ساری کارروائی بتلا دی لیکن ہم نے بھی جلسہ
کرکے ہی چھوڑا حیدرآباد سے روپئے ملنے کی وجہ سے یہ
ویسے بھی بہت خوش تھے بچوں کا یہ پہلا جلسہ جس میں مدرسہ
ابتدائی کے لڑکے اور استادوں کے سوا اور کوئی نہ تھا
تھا بھی یہ کچھ نرالا۔ ہر چیز کا انتظام چھوٹے پیمانے پر بچوں ہی
نے کیا تھا۔ ہاں اُس وقت تک تیار نہیں ہوا تھا صحن میں دیوار
کے سائے تلے جلسہ کا انتظام تھا صبح کے دس بجے کا وقت تھا
لڑکوں کی چھوٹی سی جماعت یعنی پچاس کے قریب لڑکے،

صاف ستھرے کپڑے پہنے سامنے بیٹھی تھی ۔ چھوٹی سی فرشی میز اس پر سفید کپڑا ، گلدستہ ، ٹائم پیس ، ایک پنسل ، چند کاغذ اس پر شیشہ کا پتھر رکھا تھا دس بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے یہ ٹولی چپ چاپ بیٹھی تھی اور ٹائم پیس ٹک ٹک چل رہی تھی ذاکر صاحب نے کسی لڑکے کی طرف اشارہ کرکے کہا

"اب دیر کیا ہے !"

"بس پانچ منٹ باقی ہیں" لڑکوں نے جواب دیا اس پر ذاکر صاحب نے چونکنے ہونے کے انداز میں تیوری چڑھائی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے ۔ ٹھیک دس بجے "تلاوت قرآن شریف" کے ساتھ جلسہ شروع ہوا ایک لڑکے نے باغیچہ کا حال مختصراً لکھ کر سنایا پھر سبزیوں کا تحفہ پیش کیا گیا کارروائی لمبی چوڑی نہ تھی ذاکر صاحب بچوں سے مخاطب ہونے کے لئے اُٹھے اور لڑکوں کی تعریف میں بہت کچھ کہہ دیا استاد اور لڑکے جو کچھ کر رہے تھے انھیں خود اس کام میں لطف آرہا تھا ۔ اس تعریف سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ہمارے کام کو اچانک آکر دیکھے تو وہ بھی اس لطف میں حصہ دار ہو جائے ۔ ہمارا پروگرام ہی ایسا تھا کہ ہر طرف کچھ نہ کچھ ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا

ہمارے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے اور نئے نئے کاموں کی راہ ہمارے سامنے خود بخود دکھلتی جا رہی تھی جو مواقع بھی ہمیں ملتے گئے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے رہے

مارچ ۱۹۳۱ء میں حافظ فیاض احمد صاحب آزادی کے لئے چار مہینے کی قید کاٹ کر جیل سے باہر آئے یہ اوروں سے بعد میں جیل گئے تھے اور پہلے ہی چلے آئے کہتے تھے کہ میں نے تو شراب بیچنے کی ممانعت کے لئے کام کیا تھا اور لوگوں کو کھادی پہننے کے لئے کہتا تھا اس لئے عدالت نے فقط چار ہی مہینے کی سزا دی پہلے سے علم ہو گیا تھا کہ فلاں گاڑی سے آ رہے ہیں لوگ اسٹیشن پر پہنچے ہوئے تھے جوں ہی حافظ صاحب گاڑی سے اُترے ایک لڑکے نے دعوت نامہ دیا گلیوں کو جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا جلسہ میں نظمیں سُنائی گئیں سپاسنامہ کے ساتھ مولانا محمدؐ علی کی ایک تصویر بھی پیش کی گئی۔ مدرسہ ابتدائی کی یہ عمارت جس میں یہ جلسہ ہو رہا تھا حافظ صاحب کی کوشش ہی سے تیار ہو رہی تھی لڑکوں نے آپ سے درخواست کی کہ مجوزہ ہال جلدی سے تیار کرا دیجئے تاکہ جماعت کے سامنے سائے کا رُخ دیکھ کر جلسہ نہ کرنا پڑے حافظ صاحب

نے جامعہ میں بڑے بڑے جلسے دیکھے تھے بالکل چھوٹے بچوں کو
ایک قیدی کا اس طرح استقبال کرتے ہوئے دیکھ کر رحم آیا اور
سال بھر کے اندر ایک شاندار ہال بنوا دیا جیسا کسی مشہور
کُلیہ کا ہوتا ہے۔ بارھویں سال سے جامعہ کے سب جلسے اسی
میں ہونے لگے

حافظ صاحب جیل کے کھاتوں کی کسر نکالنے کے لئے
اِدھر اُدھر دعوتیں اُڑا رہے تھے کہ دو دن کے اندر شفیق صاحب
بھی آملے، کہتے تھے "سپرٹ کا چولھا جلانے اور حلوہ پکانے کا
موقع بہت دنوں سے نہیں ملا ہے" لوگوں نے دعوتوں میں
حلوے کا جُز بھی شامل کر لیا اتنے میں پیام تعلیم کے مُدیر حسین حسان صاحب
دیوداس جی گاندھی کُلیہ کے دو اور طالب علم "کرشنا نائر" اور
"ڈیکا" بھی رہا ہو کر آگئے۔ شفیق صاحب کہتے تھے کہ اگر کوئی
شخص چاہے تو جیل کی زندگی میں اپنے آپ کو بہت باقاعدہ
بنا سکتا ہے

مولانا محمد علی بھی آزادی کی کوشش کے لئے ولایت کے
لوگوں سے بحث کرنے کے لئے لندن پہنچے ہوئے تھے۔ بہت
بیمار تھے لیکن دن رات ہندوستان کے معاملات پر بحث کیا

کرتے تھے ان کی انگریزی تقریر کے انگریز بھی قائل تھے۔ انگلستان کا مانا ہوا مقرر تھا "برک" لوگ کہتے تھے کہ مولانا برک کی زبان میں یعنی ان ہی کے جیسی تقریر کرتے ہیں آپ نے بھرے مجمع میں زور دار الفاظ میں یہ کہا تھا "میں آزادی لئے بغیر زندہ ہندوستان نہیں جاؤں گا" ابھی آزادی کے دن دور تھے مولانا کی زندگی پوری ہو چکی تھی اس لئے وہ ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئے۔ مولانا کے انتقال کی خبر جب جامعہ میں پہنچی اس وقت سردیوں کی چھٹیاں تھیں پھر بھی جو لڑکے یہاں رہ گئے تھے انھیں ایک جلسہ میں خواجہ عبدالحی صاحب نے اس رنج وہ واقعہ کی تفصیل بتائی مدرسہ کھلنے پر ۱۳ر جنوری کو جامعہ کے بڑے کتب خانہ میں طلبار اور اساتذہ کا جلسہ ہوا جس میں چھوٹے اور بڑے سب لڑکوں نے مولانا کی سیرت پر مضامین پڑھے اور جامعہ سے گہرے تعلق کو ظاہر کیا

حکیم صاحب کے بعد جامعہ کا دوسرا سرپرست اٹھ گیا وہی سرپرست جس نے مایوسی میں ہمت دلائی، بے حسی میں جوش دلایا، اساتذہ کی ہمت بڑھانا بڑوں سے علمی بحث کرنا، بچوں سے پیار و محبت کی باتیں، مولانا کو ان

باتوں سے مسرت حاصل ہوتی تھی بیماری کی حالت میں تندرستوں سے زیادہ کام کرتے تھے مولانا کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا کہتے تھے اگر مجھے موقع ملا تو جامعہ کی اُردو اکادمی (کتابیں لکھوانے والی مجلس)، کا انتظام چلاؤں گا آپ نے وصیت کی تھی کہ میرا پورا کتب خانہ جامعہ کو دے دیا جائے چنانچہ آپ کے انتقال پر بیگم صاحبہ نے ایک ایک کتاب جامعہ کو دے دی جب آپ بیت المقدس کا مدرسہ دیکھنے گئے تو وہاں کے بچے قرآن شریف کی جلدیں بہترین نمونے کی بنا رہے تھے مولانا نے ایک نمونہ جامعہ کے بچوں کے لئے بھی بھجوا دیا۔ جب تک جامعہ علی گڑھ میں تھی لڑکوں نے پھوس کے ایک بڑے کمرے کا نام "محمد علی ہال" رکھا۔ دہلی آنے کے بعد یہی نام قائم رہا چھوٹے لڑکوں نے اپنی اقامت گاہ کا نام "جوہر منزل" رکھا ہے "جوہر" مولانا کا تخلص ہے آپ شاعر بھی تھے مکتبہ جامعہ نے "کلام جوہر" شائع کیا ہے غرض لڑکے جہاں بھی گئے مولانا کے نام کو اپنے ساتھ ساتھ لئے رہے جامعہ نگر میں جو سب سے بڑا مستقل ہال بنے گا اس کا نام بھی "محمد علی ہال" رہے گا مدرسہ ابتدائی والوں نے مولانا کی ایک اور یادگار قائم کی

ہے وہ ہے "محمد علی ٹرافی" یہ اُس مدرسہ کو دی جاتی ہے جو تحریر و تقریر اور جسمانی کھیلوں میں اول آئے کیونکہ مولانا کی تحریر و تقریر مانی ہوئی تھی اس کا تفصیلی حال تیرھویں سال کی کہانی میں پڑھوگے

مولانا کا انتقال ہوئے ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ پنڈت موتی لال نہرو کے انتقال کی خبر ملی جامعہ کا سب کاروبار فوراً ہی بند کرکے ایک جلسے میں پنڈت جی کے بیٹے جواہر لال کو تعزیت کا تار بھیجنے کی تجویز منظور ہوئی استادوں نے بتایا کہ آزادی کی کوشش میں باپ اور بیٹے کس طرح کام کررہے تھے پنڈت موتی لال خوش نصیب ہیں کہ اپنا کام اپنے بیٹے جواہر لال کو سونپ کر گئے ہیں حکیم صاحب کی یادگار قائم کرنے کے لئے دہلی میں جو سب سے بڑا جلسہ ہوا تھا اس کے صدر پنڈت جی ہی تھے

اس واقعہ کے چند ہفتوں بعد پنڈت جواہر لال نہرو جامعہ میں تشریف لائے۔ انجمن اتحاد والوں نے آپ کو اپنی انجمن کا مستقل اعزازی رُکن بنالیا پنڈت جی نے اس پر فخر کا اظہار کیا

اسی سال "آل ایشیا تعلیمی کانفرنس" اور "آل انڈیا مُسلم تعلیمی کانفرنس" کے جلسے بنارس میں ہوئے تھے جامعہ سے

پہلی دفعہ "تعلیمی نمائش" کے لئے سامان بھیجا گیا کہانی کے طریقے
سے پڑھانے کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے
وہ سب ماسٹر عبدالحئی صاحب کے شاگردوں سے تیار کروا کر
"تعلیمی صندوق" کے نام سے اس نمائش میں بھیجا گیا نمائش
والوں نے جامعہ کے کام پر کئی "سرٹیفکٹ" دیئے تھے استاد
اور طلبار کی ایک جماعت ان کانفرنسوں میں شریک ہونے
کے لئے بنارس گئی تھی امرود کا زمانہ تھا راستے میں لڑکوں
نے الہ آباد کے اسٹیشن پر امرود کی کئی ٹوکریاں خریدیں میں
بھی اس قافلے میں شریک تھا

عیدالفطر پر بچوں نے حسب معمول ڈراما کھیلا اس کی
تیاری پر کافی رقم خرچ ہوئی تھی ڈراموں کا کام اس حد تک
ترقی کر چکا تھا کہ لوگوں کو دام دے کر تماشہ دیکھنے میں کوئی
عُذر نہیں رہا۔ کُلیہ کے دو طالب علم امتیاز صاحب اور
حُسین صاحب نے ٹھیکہ لیا تھا اس لئے ٹکٹوں کی فروخت کی
طرف سے اطمینان رہا۔ ڈرامہ کی کہانی ہارون رشید کے
زمانہ کے مشہور واقعہ سے متعلق تھی جس میں ایک مقدمے
کا فیصلہ ہارون کے دربار میں بچوں نے کیا تھا اصلی ہارون

ڈراما ''بچوں کا انصاف'' کا ایک منظر

حسن خواجہ، علی خواجہ، حسن خواجہ کا ملازم بالترتیب۔ نبی احمد محمد ہارون، میر اصغر علی اور عبداللطیف بنے تھے جن لڑکوں نے ان کے بھیس میں مقدمہ کا فیصلہ کیا وہ مسعود حسین خاں، محمد نور خاں، آفتاب احمد، ابوالکلام ان کے علاوہ اور بھی کئی لڑکے تھے سب کا لباس عربوں کا سا تھا سر پر عقال اس کے نیچے رومال لٹکا ہوا تھا بدن چغوں سے ڈھکا ہوا۔ بعض نے صافے بھی باندھ رکھے تھے ہارون کے دربار کے لئے گتے کا محل تیار کیا گیا۔ بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ جھالر والی چھتری لٹک رہی تھی ایک اونچے تخت پر گاؤتکیہ، یہ بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ تھی اس سے کچھ نیچے ایک اور تخت تھا جس پر وزیروں کے بیٹھنے کے لئے قالین بچھائے گئے تھے عرب کا صحرا دکھانے کے لئے ایک پردہ پر کھجور کے درخت، ریتلا میدان، اس میں نخلستان خیمے اور اونٹ دکھائے گئے تھے حسن خواجہ کے گھر پر دعوت میں فنجان اور اس میں سرخ قہوہ پیتے ہوئے دکھایا گیا، لڑکے بول چال میں ملتے جلتے وقت عربوں کے آداب کا خیال رکھتے تھے ہنسانے کے لئے ملازم کا کام مزاحیہ انداز میں رکھا گیا تھا یوں تو سب کا کام اچھا رہا لیکن عبداللطیف رجو ملازم کا کام

کر رہے تھے، چونکتے رہ کر اپنا کام ہر وقت اس انداز سے کرتے تھے کہ لوگ ان کے جواب کے منتظر رہتے کہ دیکھئے اب یہ کیا کہتے ہیں۔ انھیں اور محمد ہارون کو انعام ملا۔ ایک منظر کا سامان ہٹانے اور دوسرے کو سجانے میں جو وقفہ نکل آتا اُس وقت باری باری سے نظم خوانی رکھی گئی تھی احمد بن سالم (چہارم) نے اس قطعہ کو اتنی اچھی لے سے گایا کہ لوگوں نے دو دفعہ تالیاں بجائیں پروفیسر مجیب صاحب نے انعام کا اعلان کیا۔ انعام کیوں نہ ملتا احمد کی آواز اچھی تھی ہی اس پر انھیں نئی نئی طرزیں معلوم کرنے کا شوق رہتا تھا آواز کو جس طرح چاہیں اونچی نیچی کر لیتے تھے۔ قطعہ یہ ہے

یا دو باراں کی سہ لوں گا میں ساری سختیاں
ہاں مشقت کو بھی خاطر میں نہ لاؤں گا گراں
گر مری ان کوششوں اور محنتوں کے فیض سے
ایک چھوٹا سا چمن پھولے پھلے پروان چڑھے

ڈاکٹر انصاری صاحب اس ڈرامے کو دیکھنے کے لئے خاص طور پر تشریف لائے تھے۔ محمد مجیب صاحب، سلیم الزماں صاحب ...... صاحب (جو آج کل بمبئی کے ایسٹرن ہوٹل کے

مالک ہیں، کے مشوروں سے کام میں خوبی پیدا ہوگئی تھی، آخری مشق کے دن صبح کی نماز کے بعد ہی یہ لوگ تنقیدی نظر سے ڈراما دیکھنے کے لیے تشریف لائے تھے سلیم صاحب فرماتے تھے "دیکھئے جناب میں وقت پر آگیا ہوں"۔ قرول باغ والوں کو دکھانے کے لئے یہ ڈراما دوسرے دن بھی کھیلا گیا۔ یہ ڈراما میں نے ہی لکھا ہے، مکتبہ جامعہ نے "بچوں کا انصاف" کے نام سے شائع کیا ہے

جو لڑکے بغیر لکیروں کے کاغذ پر لکھنے کے عادی نہیں ہیں اگر انھیں ایسے کاغذ پر لکھنا پڑے تو سطریں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں لکھائی خوبصورت نظر نہیں آتی ہے اور لکیروں والے کاغذ پر اسی ناپ کی پابندی کرنی پڑتی ہے لکیروں کی وجہ سے لکھائی اچھی نہیں ہے۔ شروع میں جیسی عادت ڈالی جائے قائم رہتی ہے ان ہی باتوں کا خیال کر کے یہ طے کر دیا گیا تھا کہ مدرسہ میں لکیروں والا کاغذ کبھی استعمال ہوگا ہی نہیں۔ پہلی جماعت اور زیادہ سے زیادہ دوسری جماعت میں کچھ دشواری پیش آتی ہے پھر لڑکے سیدھی سطریں لکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں

اسی طرح قلم واسطی کا معاملہ ہے۔ تب دھات کا ہونے کی وجہ سے اس میں سختی رہتی ہے لکھنے کا طریقہ نہ جاننے سے لڑکے

نب کی نوک استعمال کرتے ہیں جس سے حرف ٹھیک سے نہیں
بنتے ہیں۔ اُردو میں حرفوں کے دائرے، نوک پلک کی لکھائی
جب تک نہ سیکھیں خط میں خوبصورتی پیدا نہیں ہوتی ہے۔ یہ
سب چیزیں نب سے نہیں بلکہ قلم واسطی سے سکھائی جا سکتی ہیں
اس قلم کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے جس طرح چاہیں موٹا یا
باریک بنا سکتے ہیں اس لئے یہ بات بھی طے پائی کہ ہر حالت میں
قلم واسطی کا استعمال کریں گے جس کسی لڑکے کے ہاتھ میں ہولڈر
نظر آ آئیں اُسے قلم واسطی دے کر اس کا ہولڈر لے لیتا اس طرح
بہت سے ہولڈر جمع ہو جاتے تھے۔ جب لڑکوں کو اس کی عادت
ہو گئی تو ایک ایک لڑکے کے پاس کئی کئی قلم واسطی نظر آنے لگے
مدرسہ میں ایک چھوڑ کئی اُستاد خوشخط لکھنے والے موجود تھے،
منشی علی محمد خاں صاحب جو ہندوستان کے بہترین "خطاط" تھے
لڑکوں کو اچھے اچھے قلم بنا کر دیا کرتے تھے جنھیں استعمال کر کے
لڑکوں کی طبیعت خوش ہو جاتی تھی۔ شیخ مفتاح الدین صاحب کی
یہ عادت ہے کہ وہ ہمیشہ صاف ستھرا لکھتے ہیں اپنے رجسٹر
صاف ستھرے رکھنے کے لئے انھیں بعض دفعہ تکلیفیں بھی اٹھانی
پڑی ہیں مگر ۱۹۲۲ء سے آج تک یہ اپنی وضع پر قائم ہیں۔

جب تک یہ مدرسہ ابتدائی میں کام کرتے رہے لڑکوں نے ان کی اس عادت سے فائدہ اٹھایا اور قلم واسطی کا بنانا سیکھتے رہے۔ آج کل بھی حمید صاحب کی وجہ سے لڑکوں کے پاس اچھے اچھے قلم نظر آتے ہیں اور شوقین لڑکے ان سے قلم بنانا سیکھتے رہتے ہیں

نیلی روشنائی قلم واسطی میں اگر زیادہ لگ جائے تو دھبے پڑ جاتے ہیں، حرف پھیل جاتے ہیں، کالی روشنائی کے مقابلے میں اس کے حرف اُبھرتے نہیں ہیں۔ سیکھتے وقت اگر ہماری لکھائی ہمیں اچھی نظر آنے لگے تو اور لکھنے کو جی چاہتا ہے، کالی روشنائی سے ہماری لکھائی چمکنے لگتی ہے بعض لڑکے ان خوبیوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے جو چیز ہاتھ لگ جائے اسی کا استعمال کرنے لگتے ہیں، ہم نے اِن دشواریوں کو دور کرنے کے لئے بغیر لکیروں کا کاغذ، قلم واسطی اور کالی روشنائی کا استعمال مدرسہ کی ضروری چیزوں میں شمار کرلیا اِن سب چیزوں پر ہمیشہ دھیان دیا جاتا ہے جو لڑکے واقف نہیں شاید وہ یہ پوچھیں کہ یہ ثانوی اور کلیہ والے ہولڈر اور نیلی روشنائی کا استعمال کرتے ہیں، تو بات صرف یہ ہے کہ

ابتدا میں سیکھنے کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں اُن کا استعمال کرنا پڑتا ہے جب خط اچھا ہو جائے، لکھائی میں پختگی پیدا ہو جائے تو ہولڈر کی لکھائی بھی سمجھ میں آجاتی ہے پھر چاہے جس چیز سے لکھیں اپنا اصلی خط جس کی ہم نے متواتر چھ سال تک مشق کی ہے قائم رہتا ہے آگے چل کر کسی اچھے لکھنے والے کی نقل اُتار سکتے ہیں، ہماری جامعہ میں کئی اُستادوں کے خط اچھے ہیں جن کی لڑکے نقل اُتار رہتے ہیں بعض دفعہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ لڑکے کا خط ہے یا اُستاد کا بس اِس معاملے میں پیچھے ہوں کیونکہ لکھائی کے لئے جن چیزوں کے استعمال کی ضرورت تھی بچپن میں ان کا خیال نہیں رکھا

اب ثانوی کا حال سنو۔ شانتی نکیتن کے مدرسہ میں پڑھنے پڑھانے کا طریقہ معلوم کرنے کے لئے سعید انصاری صاحب وہاں تشریف لے گئے تھے واپسی پر آپ نے "بزم ادب" کی طرف خاص توجہ دی۔ حافظ صاحب سے بزم کے عجائب خانہ کا اور حامد صاحب سے کتب خانہ کا افتتاح کروایا، بیت بازی کی نئی "طرح" ڈالی یعنی اس مقابلے کے لئے یہ شرط رکھی کہ ایک وقت میں ایک ہی شاعر کے اشعار سنائے جائیں اس کے لئے وہ پُرانی قید ہٹانی پڑی کہ جو فریق مقررہ حرف سے شروع ہونے والا

شعر نہ سُنا سکے وہ ہار جائے گا بلکہ کامیابی کا معیار اچھے اشعار کے سُنائے جانے پر رکھا گیا ظاہر ہے فیصلہ کا یہ معیار لڑکوں کے لئے مفید ہے اس کھیل کا مقصد اچھے اشعار کا یاد کرنا ہے۔
سعید صاحب کی اقامت گاہ والوں نے بیت بازی کے دو جلسے کئے ایک میں حالی اور دوسرے میں اقبال کے اشعار رکھے گئے تھے

انجمن اتحاد نے مولانا شوکت علی، مسز سروجنی نائیڈو پروفیسر گرمانس، پروفیسر ٹکر (شانتی نکیتن) اور مولانا آزاد سبحانی سے تقریریں کروائیں

ایک جلسہ میں مولانا شرف الدین صاحب مومن اور حفیظ جالندھری نے اپنی نظمیں سُنائیں یہ وہی حفیظ ہیں جنھوں نے تمھارے لیئے' عید، شب برات، دیوالی، دسہرہ، موسم بہار، تاروں بھری رات' وغیرہ پر بھی اچھی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ موسم بہار کی ایک نظم میں لکھتے ہیں

لو پھر بسنت آئی پھولوں پہ رنگ لائی

چلو بے درنگ

لب آب گنگ

بجے جلترنگ

من میں اُمنگ چھائی پھولوں پہ رنگ لائی
لو پھر بسنت آئی
لڑکوں کی جنگ دیکھو ڈور اور پتنگ دیکھو
کوئی مار کھائے
کوئی کھلکھلائے
کوئی مُسکرائے
طفلی کے رنگ دیکھو ڈور اور پتنگ دیکھو
لڑکوں کی جنگ دیکھو
کھیتوں کا ہر چرندہ باغوں کا ہر پرندہ
کوئی گرم خیز
کوئی نغمہ ریز
سُبک اور تیز
پھر ہو گیا ہے زندہ باغوں کا ہر پرندہ
کھیتوں کا ہر چرندہ
پھولی ہوئی ہے سرسوں پھولی ہوئی ہے سرسوں
نہیں کچھ بھی یاد

یوں ہی با مراد
یوں ہی شاد شاد
گویا رہے گی برسوں پھولی ہوئی ہے سرسوں
پھولی ہوئی ہے سرسوں

اس دفعہ سالانہ کھیل کود کے انعامات شمس العلماء عبدالرحمٰن صاحب نے تقسیم کئے آخر میں آپ نے فرمایا :۔

"شیخ الجامعہ صاحب کو ایک انعام حاصل کرکے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی مجھے بہت سارے انعامات تقسیم کرکے۔ جامعہ میں اتنے انعامات تقسیم ہوئے ہیں کہ شاید ہی کسی دوسری درسگاہ میں دئے جاتے ہوں"

شیخ الجامعہ صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا

"ہمارے ہاں کھیل کود اور پڑھائی دونوں کو برابر کی اہمیت دی جاتی ہے کاش ہم اس سے زیادہ انعامات دے سکتے"

اس سال کی ایک رنج کی خبر بھی ہے، سیّد نذیر نیازی صاحب (استاد جامعہ) کے بھائی شبیر احمد (جامعہ کے طالب علم) اللہ کے پیارے ہوئے۔ شبیر بڑا بھولا، فرماں بردار اور ہوشیار بچہ تھا ساتھیوں سے محبت تھی کھیلوں سے دلچسپی تھی

سال ختم ہونے سے پہلے نئے سال کی تیاریاں ہونے لگیں مجلس تعلیمی نے جامعہ کے پورے نصاب پر نظر ثانی کر کے چھپنے کے لئے دے دیا ایک سال کے نئے تجربے کے بعد میرے لئے اب موقع تھا کہ آئندہ سال کے لئے تجاویز پیش کروں میں ان کی تیاری میں لگ گیا۔ تجاویز مرتب ہونے سے پہلے ہی ذاکر صاحب فرمانے لگے :۔

"دیکھئے نا! کام کرتے والے لڑکوں کو پھٹی پرانی دریوں پر بیٹھتے ہوئے اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے ان کے لئے نئی دریاں خرید لیجئے، ڈسک بھی کمروں کا حساب لگا کر بنوا لیجئے" ڈاکٹر صاحب کی نیت یہ تھی کہ ان چیزوں کو بھی نئے پروگرام میں شامل کر لوں میں نے حسب عادت ایک ایک چیز کی تفصیل لکھ کر دے دی حتیٰ کہ نیا "ٹائم ٹیبل" بھی منسلک کر دیا، استادوں کے جلسے میں "منصوبی طریقہ" پر ایک مضمون بھی سُنایا

میری یہ خواہش تھی کہ نئے سال سے ارشاد الحق صاحب پورے وقت کے لئے مدرسہ ابتدائی میں آجاتے، آپ اِس مدرسہ کے چھوٹے بچوں کے اتالیق تھے لڑکوں کو صاف ستھرا رکھنے اور اِن کی نگہداشت میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔

اِس کا نمایاں اثر بچوں کے کام اور ان کے جلسوں پر پڑ رہا تھا محض لکھنے پڑھنے سے آدمی ہوشیار نہیں ہوتا ہے جب تک وہ لکھنے پڑھنے کا استعمال ٹھیک سے نہ کرے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے ایسے ساتھیوں کی ضرورت ہے جو مدرسہ اور اقامت گاہ دونوں میں یکساں دلچسپی لیں، میری نظر بار بار ارشاد صاحب کی طرف جاتی تھی میں اپنا ایک ایک ارادہ ان پر ظاہر کرتا تھا ان کے بچے مجھ سے بہت مانوس ہیں اسی بہانے گھنٹوں ان کے یہاں بیٹھا رہتا مگر یہ میرے ساتھ مدرسہ میں کام کرنے کے لئے راضی نہیں ہوئے میری خواہش یہ تھی کہ کوئی بزرگ ہمارے کاموں میں شریک رہے۔ پہلی سی محبت ان سے اب بھی ہے تب ہی تو یہ باتیں صاف صاف لکھی ہیں

اس سال گرمیوں کی چھٹی میں پنجاب کے بعض ابتدائی مدارس دیکھنے کے لئے میں نے پندرہ دن کا دورہ کیا پہلے تو موگا گیا، وہاں کے استادوں سے اپنے ایک سال کے کام کے بارے میں گفتگو کی، پھر پنجاب کے عیسائی مدرسوں کے پتے پوچھ کر وہاں پہنچا۔ قصور، شاہدرہ (لاہور) پسرور کے مدرسوں کو خاص طور پر دیکھا۔ پسرور کے مدرسے کی خاص بات یہ ہے

کہ ابتدائی چھ جماعتوں کو پڑھانے والی سب کی سب اُستانیاں ہیں کوئی دو سو لڑکوں میں پندرہ استانیاں کام کرتی ہیں ان کی نگران امریکہ کی ایک خاتون ہیں، "صدر معلمہ" کے کہنے پر استانیوں کے جلسے میں اپنا ایک سال کا تجربہ بیان کیا وہاں کی جماعتوں میں "کانگڑہ" کی سلیٹ کے، قد کے برابر ٹکڑے دیوار کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لگے ہوئے ہیں۔ لڑکے آزادی کے ساتھ ان پر لکھنے اور ڈرائنگ بنانے کی مشق کرتے ہیں۔ یہ مدرسہ بستی سے دُور جنگل میں ہے آس پاس کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ یہاں سے منوں "ٹنڈے" منڈی میں جاتے ہیں اِس دَورے سے واپس ہوکر ذاکر صاحب کے ہاں قائم گنج پہنچا۔ میرے پُرانے ساتھی قُدوس صاحب نے جی بھر کر تو نہیں ہاں پیٹ بھر کر آم کھلائے۔ امتیاز صاحب بھی وہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان ہی دنوں ابتدائی جماعتوں کا اُردو نصاب تیار کر رہے تھے، پہلی دوسری جماعت کے نصاب میں میں نے بھی مدد دی۔ ڈیوڑھی کے اندر احاطے میں دھوبی کا گدھا بندھا تھا کہتے تھے "بعض دفعہ یہ بہت چلّاتا ہے۔ جب سے ہم لوگ دہلی میں رہنے لگے ہیں یہ اور

اس کا مالک یہیں رہتا ہے۔ مجھے اس کو یہاں سے علیحدہ کرتے ہوئے اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ تھوڑے دنوں میں ہم لوگ دہلی چلے جائیں گے، آج کل تو ہم اس کے مہمان ہیں!!"

مکتبہ کے مہتمم حامد علی خاں صاحب کو مدرسہ اور اس کی دلچسپیوں سے لگاؤ رہتا ہے، رنگون میں استاد رہ چکے ہیں طبیعت بھی ایسی ہی پائی ہے لڑکوں کی بہت قدر کرتے ہیں ان کو چاق چوبند زندہ دل دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اسکاؤٹ ماسٹر رہ چکے ہیں کسی اہم کام کے پیش آنے پر صورت حال پر قابو پانے کی باتیں سوچتے ہیں۔ چند باہمت لڑکوں نے آپ کی نگرانی میں سائیکلوں پر کشمیر کا سفر کیا۔ یہ ٹولی محمد طیب، مسعود اختر، ڈاکٹر عالم کے صاحبزادے محمد اقبال پر مشتمل تھی۔ محمد طیب سائکل چلانا معمولی جانتے تھے لیکن یہ خیال تھا کہ جموں پہنچنے تک جو میدانی علاقہ ہے اس میں یہ سب کچھ سیکھ جائیں گے ایسا ہی ہوا، گرتے پڑتے یہ سیکھ ہی گئے۔ سیالکوٹ پہنچ کر انھیں جموں کی روشنیاں نظر آنے لگیں بے ساختہ ایک کی زبان سے نکلا " لو مبارک نظر آنے لگے منزل کے نشان" جموں سے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہو جاتی ہے دو دن میں یہ رام بن

پہنچے ۔ یہاں کے گھنے جنگلوں نے ان کی کوفت دور کردی،
دوپہر میں درختوں کے سائے تلے کھایا پکایا، گایا بجایا۔ شام
کے وقت پھر چلنے لگے، سنسان راستہ چاروں طرف پہاڑ
چشموں کے بہنے کی سنسناہٹ، طیب کہتے تھے کہ ہیں اب
آگے آگے رہنے لگا، سری نگر پہنچ کر جامعہ کے ایک طالب علم
عبدالملک صاحب کے ہاں ٹھہرے شالا مار دیکھا، نشاط باغ دیکھا،
گل مرگ پہنچے ۔ کوئی آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر وہاں سے
بھی اونچے کھلن مرگ پہنچے جہاں برف کے تودے اور طرح
طرح کے پھول دیکھے واپسی میں راولپنڈی تک کی پہاڑیوں
کی سیر کی، کشمیر کی آب و ہوا نے تازہ دم کردیا تھا، واپسی
میں ویسے بھی ڈھلان رہتا ہے پھر بھی تعجب ہے کہ ایک دن
میں اٹھانوے میل کا سفر کیا اگر اس کے آگے دو میل کے
فاصلہ پر کوئی گاؤں ہوتا تو سینکڑہ کی خوشی میں یہ دو میل
بھی چل لیتے ۔ حامد صاحب نے کہا " بھائی حسرت کیوں رہے
پلنگ کے اردگرد ہی گھوم لو سو میل پورے ہو جائیں گے"
جب خبر ملی کہ جولائی کی آخری تاریخوں میں دہلی پہنچے والے
ہیں تو جامعہ والوں نے لکھ دیا تھا کہ مدرسہ کھلنے پر آئیں تاکہ

سب لڑکے اِس خوشی میں حصہ لے سکیں۔ انھیں یہ خبر راستہ میں ملی کچھ دنوں کی مہلت تھی، شملہ کا چکر بھی لگا آئے غرض کہ ۶؍ اگست کو روشن آرا باغ میں ان لوگوں کا استقبال ہوا، تصویریں لی گئیں، نظمیں ہوئیں، ہار پہنائے گئے۔ ہمت سے کام لیا، لُطف بھی اُٹھایا اور دوں کو کشمیر کی سیر کا شوق بھی دلایا

اِن کی دیکھا دیکھی جامعہ کے بعض اُستادوں (شفیق صاحب، سعد صاحب، سعید صاحب، ارشاد صاحب) کو بھی کشمیر کی سیر کا شوق ہوا، سعد صاحب کی تجویز ہوئی کہ جموں تک ریل پر چلیں وہاں سے پیدل۔ کچھ دُور پیدل چل کر ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ پیدل سفر کسی اور زمانے کے لئے اُٹھا رکھیں۔ اِس وقت لاریوں میں چلیں۔ سعد صاحب نے بہت کہا مگر باقی لوگ نہیں مانے۔ واپسی پر شفیق صاحب تو یہی کہتے تھے کہ ہم نے سارا سفر پیدل طے کیا ہے مگر سعد صاحب فرماتے ہیں کہ "بالکل جھوٹ بات ہے" مولانا میرے اُستاد ہیں شاگرد کو اُستاد کی بات سچ جاننی چاہیے۔ آپ کی اب بھی یہی آرزو ہے کہ کشمیر کا سفر پیدل کریں

بارھواں سال

اگست ۱۹۳۱ء سے جولائی ۱۹۳۲ء

ابتدائی چہارم کے لڑکوں نے جب سالانہ امتحان کامیاب کرلیا
تو ان کے لئے پانچویں جماعت اس مدرسہ میں کھولی گئی۔ نئے
داخلے بھی ہونے لگے۔ ستمبر کے مہینہ میں پانچوں جماعتوں کے
لڑکوں کی تعداد دسنو ہونے پر ایک دن کی چھٹی منائی گئی کیونکہ
دہلی آنے کے بعد کبھی ابتدائی جماعتوں کی تعداد اس سے زیادہ
نہیں ہوئی تھی۔ مولوی فضل الرحمٰن صاحب شاخ سے منتقل ہوکر
یہاں آ گئے تھے۔ نوجوان استادوں میں ایک بزرگ کی ضرورت
تھی، مولانا پکے دیندار اور نماز روزے کے پابند ہیں۔ پرہیزگاری
کے ساتھ ساتھ جوشیلی طبیعت پائی ہے اس لئے پڑھاتے وقت

ہنستے ہنساتے بھی ہیں۔ جامعہ کے کتب خانے میں عربی کتابوں کا
بہت بڑا ذخیرہ ہے اس سے آپ فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں
نظام اوقات میں میں نے اُن لڑکوں کے گھنٹے لے لئے جنھیں
چہارم میں پڑھا چکا تھا اور جو اب پنجم میں آگئے تھے۔ اوّل
والوں کے ساتھ دوم میں نہ جا سکا اس لئے کہ پہلی جماعت کی
پڑھائی کے لئے اور کوئی استاد نہیں تھا اس طرح میرا کام
اب بھی دو جگہ رہا۔ فرق یہ ہوا کہ پانچ کی بجائے چار پیریڈ
کر لئے۔ دو تو اول کی اُردو کے اور دو پنجم کی اُردو کے۔
باقی وقت مدرسہ کا انتظام، دفتری کار روائی اور دیکھ بھال
میں صرف کرتا تھا۔ مدرسہ کی مصروفیات بڑھ رہی تھیں لیکن
میں جانتا تھا کہ اپنی توجہ محض نگرانی تک محدود رکھنے کا زمانہ
ابھی نہیں آیا ہے کئی سال کی متواتر محنت اور مختلف کاموں کے
نمونے قائم کرنے کی ضرورت تھی یہ بھی خواہش تھی کہ جب تک
ہاتھ پیر میں طاقت ہے کچھ کر لوں آگے نہ جانے کیا صورتیں
پیش آئیں۔ جوں جوں میں کاموں کو آگے بڑھاتا گیا مجھے محسوس
ہو رہا تھا کہ کام کرنے کی صلاحیت پہلے سے زیادہ ہوتی جا رہی
ہے، میرا پچھلا کام اگلے کام میں مدد دے رہا تھا۔ میری ہمیشہ

یہ خواہش رہی کہ ساتھی بھی اس دوڑ میں میرے ساتھ رہیں
تاکہ جماعتوں کے کام کا توازن قائم رہے
جامعہ کے کاموں کا اب تک یہ رنگ تھا کہ عام دلچسپیاں
تو موجود تھیں لیکن جماعت کے کام کا ان سے تعلق نہ تھا۔
اس لئے لڑکوں کی توجہ جماعت کے کام سے کم ہوتی تھی اور
وہ بیرونی دلچسپیوں میں زیادہ حصہ لیتے تھے یہ پہلا موقع تھا
کہ عام دلچسپیوں کو جماعت کے کام کا جزء بنا دیا گیا اور اس سے
لکھنے پڑھنے میں مدد لی جانے لگی اس میں لڑکوں کے لئے تو
آسانی اور دلچسپی پیدا ہوگئی تھی مگر استادوں کو یہ سوچنا پڑتا تھا
کہ ان چیزوں سے لکھنے پڑھنے کا کام کس طرح لے سکتے ہیں اب
ہمارے سامنے تین طرح کے کام تھے ۔ ایک تو (۱) 'جماعتی پروجکٹ'
وہ کام جسے ایک جماعت والے مل کر کریں ، دوسری جماعت
والوں کو ان کے کام سے کوئی لازمی تعلق نہ رہے مثلاً 'صابن
پروجکٹ'، 'ڈاکخانہ پروجکٹ' 'باغبانی پروجکٹ' وغیرہ دوسرے
وہ کام تھا جسے سب جماعتوں والے مل کر کریں مثلاً آنحضرتؐ
کی پیدائش پر 'میلاد النبی پروجکٹ' جامعہ کی سالگرہ پر "تحریک
جامعہ پروجکٹ"، 'قومی ہفتہ پروجکٹ' وغیرہ اس قسم کے

کام کو ہم امتیاز پیدا کرنے کے لئے (۲) "مشترکہ پروجکٹ" کہہ سکتے ہیں تیسرے وہ کام بھی ضروری تھے جسے ہم شعبوں کے نام سے چلا رہے تھے مثلاً "بنک پروجکٹ" "دُکان پروجکٹ" وغیرہ اس تیسری قسم کے کام کو "شعبہ جاتی پروجکٹ" کہہ لو[1] "جماعتی پروجکٹ" کا کام احمد علی صاحب کے سپرد کرکے میں "مشترکہ پروجکٹ" کی تیاری میں لگ گیا اور اس کے لئے "میلا دُالنبی پروجکٹ" کو شروع کیا مگر ایک مشکل یہ تھی کہ باقی دو جماعت والے اس کام سے ناواقف تھے اس لئے زیادہ کام پنجم والوں سے لینا پڑا جہاں میرے گھنٹے تھے۔ یہ کام کوئی ایک مہینہ جاری رہا۔ اس کی تفصیل " میلا دُالنبی پروجکٹ" کے نام سے ایک کتاب میں چھاپ دی ہے اِس کی نقل کرنے کو اس لئے جی نہیں چاہتا ہے کہ وہ چیز کہانی کے طرز پر نہیں ہے بلکہ اُستادوں کو مخاطب کرکے ایک کام کی تفصیل لکھ دی ہے، کوئی کام نیا ہو اور

---

(۱) جماعتی، مشترکہ، شعبہ جاتی (پروجکٹ)، یہ تینوں پروجکٹ کی باقاعدہ قسمیں نہیں ہیں بلکہ سہولت کے لئے ایسے نام رکھ لئے ہیں ورنہ یہ اپنے اصلی نام سے پکارے جائیں گے مثلاً "صابُن پروجکٹ" "میلا دُالنبی پروجکٹ" "بنک پروجکٹ" وغیرہ

پہلی دفعہ ہو تو اسے نمونہ کا کام کہنا بھی ٹھیک نہیں ہے اس لئے
وہ کتاب ایک نامکمل خاکہ ہے حساب کا کام تو اُس میں کہیں
نظر ہی نہیں آتا ہے کیونکہ مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا تھا ۔
دوسرے سال جب اس کام کو کیا گیا تو پہلی غلطیاں اور تجربہ
سامنے تھا اس لیۓ لڑکوں نے دل کھول کر اچھے سے اچھا کام
کیا میں نے اِس کام کی ضروری باتیں لکھ کر اپنے پاس رکھ لی
تھیں " داشتہ بکار آید " اِسی کو کہتے ہیں اگلے سال کی کہانی
میں اِن باتوں کو اس انداز میں لکھوں گا کہ یہ کام بھی تمھیں
کہانی کا ایک حصہ معلوم دے ۔ بے جوڑ باتیں لکھنے میں نہ تو
میرا جی لگتا ہے اور نہ تمھیں پڑھنے میں مزہ آئے گا ۔ پھر
ایک ہی چیز کا ذکر بار بار آنے سے لکھنے اور پڑھنے والے
کی طبیعت اُکتا جاتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو کام
نئے انداز میں بار بار ہو رہا ہو اُس کی خاص خاص باتوں کا
ذکر نہ کروں ۔ تم جانو مدرسہ میں لڑکوں کا آنا جانا بندھا رہتا
ہے اور وہ ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی
کرتے رہتے ہیں یہ کام چاہے استادوں کے لئے پُرانا ہو
مگر لڑکوں کے لئے تو نیا رہتا ہے ۔ تو بھائی جس کی جو بات

اچھی معلوم ہوگی موقع نکلنے پر لکھ دوں گا اور جو بات مجھے یاد ہی نہ ہو تو اس کی لاچاری ہے —— ہاں تو اس سال کے "میاں دا لبنی پروجکٹ" کا ذکر ہو رہا تھا - ان ہی لڑکوں نے اگلے سال بھی یہی کام کیا تھا - یہ کام کس طرح ہوتا ہے اس کی تفصیل تو اگلے سال آئے گی مگر دو چیزیں جو پڑھنے کے لائق ہیں یہاں نقل کئے دیتا ہوں - ان میں سے ایک تو آنحضرتؐ کے خطبہ کا خلاصہ ہے جو مولانا سعد انصاری صاحب نے دیا تھا دوسری "بچے کی دُعا" ہے جو ڈاکٹر ذاکر صاحب نے چھوٹے بچوں کا خیال کر کے لکھی ہے - منصور احمد بٹلہ (جن کی ڈاڑھی اب اچھی خاصی نکلی ہوئی ہے) کی عمر اُس وقت آٹھ سال کی ہوگی اس دعا کو ٹھہر ٹھہر کر سُنایا تھا - محمد نور خاں نے خطبہ کو اچھی طرح زبانی یاد کر لیا تھا اور گرج گرج کر سنایا تھا - پہلے خطبہ پھر دُعا یہاں درج کرتا ہوں

آنحضرتؐ کا آخری خطبہ

لوگو! سنو! شاید میں اس سال کے بعد تم سے اِس جگہ اِس مہینہ میں اِس شہر میں مل نہ سکوں - تم جانتے ہو یہ کون سا دِن ہے! کون سا مہینہ ہے! کون سا شہر ہے! یاد رکھو یہ دِن حُرمت کا

ہے۔ یہ مہینہ حُرمت کا ہے، یہ شہر حُرمت کا ہے۔ خدا نے
تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری آبرو تم پر اِس مہینے میں
اِس شہر میں اِسی دن کی حُرمت کی طرح حرام کی۔ میرے بعد
کافر نہ ہو جانا کہ تم ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگو۔ تمہارا
خدا ایک ہے تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹّی کے
تھے۔ خدا کے نزدیک تم میں سب سے شریف وہ ہے جو
سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ عربی کو عجمی اور عجمی کو عربی
پر کوئی فضیلت نہیں ہے، مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔ تمہارے
غلام جو خود کھاؤ وہی اُن کو کھلاؤ جو خود پہنو وہی اُن کو
پہناؤ۔ عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو، تمہارا عورتوں
پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔ تم میں ایک چیز چھوڑے
جاتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے
وہ چیز کیا ہے اللہ کی کتاب قرآن

بچے کی دُعا:۔

اللہ میاں میں نے آپ کو کبھی دیکھا نہیں پر اماں کہتی
ہیں کہ آپ چیونٹی تک کی سُنتے ہیں پھر میری کیوں نہ سُنیں گے!
اللہ میاں مجھے خبر ہے کہ آپ کے پاس اچھے اچھے

موہنی صورت کے فرشتوں کی فوجیں کی فوجیں ہیں۔ دو چار فرشتوں
سے کہہ دیجئے کہ میرے ساتھ رہا کریں، مجھے صبح صبح اٹھا دیا کریں
کہ میں مدرسہ ٹھیک وقت پر پہنچ جایا کروں سڑکوں پر موٹر
والے دیوانوں کی طرح زن زن موٹریں اُڑاتے پھرتے ہیں
ان سے مجھے بچا لیا کریں گھر میں ابّا اماں اور مدرسہ میں
ماسٹر صاحب کو مجھ سے خوش رکھا کریں باغ میں میری کیاری
کی دیکھ بھال کیا کریں۔ محنت اللہ میاں میں خود کروں گا
اس میں بڑا مزہ آتا ہے اور میں نے سُنا ہے آپ بھی
محنت کرنے والے سے پیار کرتے ہیں

اللہ میاں میں کبھی بیمار نہ پڑوں۔ بیمار پڑوں گا تو پھر
کام کیسے کروں گا! ہاں اللہ میاں ایک فرشتہ سے یہ بھی
کہہ دیجئے کہ مجھے کبھی جھوٹ نہ بولنے دے۔ میں کبھی بڑوں کے
ڈر سے جھوٹ بول دیتا ہوں، سب کے ڈر کی جگہ بس اپنا ڈر
دل میں ڈال دیجئے، آپ سے جھوٹ بول کر کچھ چھپا نہیں سکتا

اللہ میاں —— میں ابھی ننھا سا ہوں سب باتیں نہیں
جانتا ان فرشتوں سے جتا کر کہہ دیجئے کہ ہر کام میں ہر بات میں
مجھے اُس طرف چلا دیا کریں جس میں آپ خوش ہوں اور

آپ کا وہ پیارا آمنہ کا دُلارا جسے آپ نے بے ماں باپ کا
کر دیا تھا اور پھر سارے جہانوں کے لئے رحمت بنا دیا تھا
آپ خوش رہیں اور آپ کا وہ پیارا تو بس ساری دُنیا
خوش رہے گی

اللہ میاں آپ سب کی سُنتے ہیں میری یہ دُعا بھی
سُن لیجئے اور مان لیجئے مگر ضرور"

مولانا شرف الدین صاحب نے اس دُعا کو یوں نظم
کیا ہے مقابلہ کرکے دیکھو وہی چیزیں ہیں

اے میرے اللہ اے مرے مولا — میں نے تجھ کو نہیں ہے دیکھا
پر مری اماں ہیں یہ کہتی — تو سُنتا ہے چیونٹی تک کی
پھر بھلا میری کیوں نہ سُنے گا — جو مانگوں گا مجھ کو نہ دے گا

اللہ میاں یہ سُنا ہے میں نے — آپ کے ہیں بہتیرے فرشتے
کام وہ کرتے ہیں ایسے ایسے — جو انساں سے ہو نہیں سکتے
اپنے فرشتوں سے کہہ دیجئے — ساتھ رہیں وہ ہر دم میرے
اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے — ہوں نہ جُدا وہ پاس سے میرے
اللہ میاں یہ دُعا ہے تجھ سے — تو میرے سب کام بنا دے

جی پڑھنے لکھنے میں لگاؤں وقت پہ جاؤں وقت پہ آؤں
خوش مجھ سے ماں باپ ہوں میرے اور اُستاد دُعا دیں دِل سے
اللہ میں نے یہ بھی سُنا ہے تو محنت سے خوش ہوتا ہے
میں بھی ہوں تیرا محنتی بندا کھیتی کا کرتا ہوں دھندا
ہری بھری رہے میری کیاری کثرت سے ہوں پھل پھلواری
تو مالک اور بندے ہیں سب ہم کہتے ہیں تجھ کو اپنا رب ہم
پھر آخر میں دُعا کرتا ہوں ختم یہ اپنی صدا کرتا ہوں
ہم کو چلا تو سیدھے رستے رستے پر اچھے بندوں کے

پنجم کے یہ لڑکے جنھوں نے پچھلے سال چہارم میں "باغبانی پروجکٹ" پھلایا تھا اس سال اور کاموں میں مصروف ہوئے جن میں سے ایک کام کا ذکر ابھی کیا ہے پھر بھی "باغبانی" کو معمولات (روز مرّہ کا کام) کے طور پر کرتے رہے اور معلومات عامہ کے سلسلہ میں "سبزیات" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب تیار کی اس میں موسم گرما اور موسم سرما کی سبزیاں علٰحدہ علٰحدہ درج تھیں ہر سبق کے ساتھ اس کی سبزی کی ڈرائنگ بھی لگا دی تھی عبدالعزیز پشاوری نے تو ہر سبق کے ختم ہونے پر منشی علی محمد خاں صاحب کی نقل

میں سیاہ روشنائی سے کوئی نہ کوئی چھوٹی سی چیز باریک قلم
سے بنا دی مثلاً پھول پتی، اُس سبزی کا اصل حصہ وغیرہ،
ہر ایک لڑکے نے ایک خوبصورت چھوٹی سی لغت جس کا نام
"مبادی اللغات" ہے خرید لی تھی اسے دیکھ دیکھ کر درسی کتاب
کی فرہنگ تیار کی

یہ لڑکے اس بات سے بہت خوش تھے کہ جامعہ کے سب سے
بڑے سردار یعنی ڈاکٹر ذاکر صاحب شیخ الجامعہ انھیں انگریزی پڑھایا
کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب اپنی جگہ خوش تھے کہ چھوٹے بچوں کے ساتھ
کام کرنے کا موقع ملا ہے یہ کام ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اپنے
لئے پسند کیا تھا میں کبھی کبھی نگران کی حیثیت سے ان کی جماعت
کا بھی چکر لگا لیا کرتا تھا شاید یہ دل میں خیال کرتے ہوں کہ معلوم
نہیں وہ اس وقت باقاعدگی سے کام لے رہے ہیں یا بے قاعدگی
سے جب یہ بات سرپرستوں کو معلوم ہوئی تو وہ بھی فخر کرنے
لگے کہ اُن کے لڑکوں کو شیخ الجامعہ پڑھایا کرتے ہیں سننے والوں
کے لیے یہ بات اس لئے نئی تھی کہ ہمارے ملک میں چھوٹی جماعتوں
کی پڑھائی کے لئے استادوں کے انتخاب میں احتیاط نہیں کی جاتی
ہے جو شخص جتنی اونچی جماعت کو پڑھائے اُتنا ہی تجربہ کار

سمجھا جائے گا حالانکہ تجربہ کی جگہ تو چھوٹے بچے ہیں یہاں خون پسینہ ایک کرنا ہوتا ہے تب جاکر موتیوں کی آب وتاب نظر آتی ہے جب کوئی شخص مجھ سے سوال کرتا ہے کہ "آپ کس جماعت کو پڑھاتے ہیں" تو میں ہمیشہ پہلی جماعت کا نام لیتا ہوں خواہ اُن دنوں میرے پاس کوئی اور جماعت کیوں نہ ہو اس طرح سوال کرنے والے کو کچھ مایوسی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آگے چل کر یہ سوال باقی تو رہے گا لیکن اِس کے پوچھنے کا مقصد وہ نہ رہے گا جو اب ہے اِن چیزوں پر زور دینے میں میرے لئے ایک مشکل یہ ہے کہ بعض دفعہ مجھے یہ خیال آتا ہے چونکہ خود تو ثانوی کی جماعتوں کے کام سے زیادہ واقف نہیں ہے اس لئے ایسی باتیں سوچا کرتا ہے اِس کی ایک مثال یوں بھی سمجھو کہ کسی مجمع میں ہندوستانی تقریر کا موقع ہو لیکن کوئی شخص خواہ مخواہ کے لئے انگریزی میں بولنے لگے تو بار بار میرا جی چاہتا ہے کہ اعتراض کروں لیکن اس لئے خاموش ہو جاتا ہوں کہ لوگ یہ خیال نہیں کریں گے کہ یہ اصلاح چاہتا ہے بلکہ یہ سمجھیں گے کہ اسے انگریزی نہیں آتی ہے اِس لئے اعتراض کر رہا ہے میں نے اس قسم کے تجربے سے ایک نتیجہ یہ بھی نکالا کہ کام

کرنے والا آدمی جب تک اعلیٰ تعلیم نہ پائے اُس کے لیے کام کرنے
اور کام لینے میں بہت رُکاوٹیں پیش آتی ہیں بس یوں سمجھو کہ کوئی کام
مُشکل ہو تو وہ مُشکل تر ہو جاتا ہے۔ تمھیں یہ سُن کر خوشی ہو گی کہ ڈاکٹر
ذاکر صاحب جیسے ذہین، سمجھ دار اور دِل والے آدمی، تن من
دھن سے اِسی بات میں لگے ہوئے ہیں کہ لوگ تمھیں اور تمھارے کاموں
کو سمجھیں۔ اگلی سطروں میں ان کے چند جُملے یہاں نقل کروں گا جو
اُنھوں نے اِسی سال کے یوم تاسیس پر لوگوں کے مجمع میں کھُلم کھُلا
سُنائے ہیں کہ تعلیم کے بارے میں ہمارا خیال کیا ہے اور ہم کیا چاہتے
ہیں۔ تقریر لمبی تھی لیکن ثبوت کے لیے چند ہی جملے نقل کیے ہیں
یہ پہلا موقع تھا کہ ابتدائی کے لڑکوں نے "یوم تاسیس"
کی تقریب میں نُمایا حصہ لینا شروع کیا، دستور کے مُطابق
شیخ الجامعہ صاحب سال بھر کی رپورٹ سُنا کر کاموں پر تبصرہ
بھی کرتے ہیں ایک جگہ فرمانے لگے

"پچھلے پانچ سال کے تجربے سے جامعہ والوں
نے یہ سیکھا ہے کہ ملّتِ اِسلامی کی اِصلاح و ترقی
کے لیے سب سے ضروری چیز چھوٹے بچّوں کی
تعلیم کا معقول انتظام کرنا ہے یہی وہ بُنیاد ہے

جس پر قومی تعلیم کی نئی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے
اس خیال سے جامعہ سب سے پہلے ابتدائی تعلیم کے
مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے"
اسی طرح کچھ اور باتیں کہتے رہے آخر میں سنجیدہ تقریر
کا لہجہ بدلا اور خوش ہوتے ہوئے فرمانے لگے
"مدرسہ ابتدائی والے جن کے ہال میں
اس وقت ہم جمع ہیں اُن تمام پرانی رسموں کو جو
انھیں پسند نہیں ہیں نکال باہر کر رہے ہیں ان کی
خواہش ہے کہ نہ صرف دیکھ کر بلکہ عمل کے ذریعے
چیزوں کو سیکھنے کی کوشش کریں اس لئے ایک
صاحب آپ کے سامنے تشریف لاتے ہیں"
شیخ الجامعہ صاحب کے بیٹھنے پر تالیاں بجنے لگیں تالیوں
کی گونج مدھم ہو کر پھر تیز ہونے لگی یہ تیزی اس لئے تھی کہ
جناب رحیم الدین خاں صاحب ابتدائی جماعت سر سے پیر تک
کھدر کے سفید لباس میں چلے آ رہے ہیں۔ اور تو اور موزے
بھی سفید پہن رکھے تھے مدرسے کے تمام لڑکوں کی طرف سے
ایک سال کا کام لوگوں کے سامنے رکھا اس رپوٹ کو جماعت کے

سب لڑکوں نے لکھا تھا انتخاب اس طرح کیا گیا کہ جس کی رپوٹ کا جو حصہ پسند آیا وہی سے لیا گیا۔ طلبا کے اعداد و شمار، باغیچہ کی کیفیت تو رحیم صاحب کی لکھی ہوئی تھی "میلادالنبی" کا حال فضل الرحمٰن "سبزیات" منظہر، "بنک" خلیل الرحمٰن، کتب خانہ محمد صدیق، "دُکان" محمد یحییٰ "ابتدائی حال" اسلام اللہ مرحوم نے لکھا تھا ان کا انداز تھا بھی کچھ بزرگانہ۔ "تمہید" محمد نور خاں نے لکھی تھی۔ یہ حضرت لکھنے میں اوروں سے کچھ زیادہ ہی تھے تعجب ہے کہ "شکریہ" کا حصہ عبدالحی خاں کی رپوٹ سے لیا گیا اس لئے کہ یہ اپنے ساتھیوں میں لڑاکو مشہور تھے مگر اصل میں تعجب کی کوئی بات نہیں کام کے وقت سب لڑکے ویسی ہی بات کیا کرتے ہیں جیسی ہونی چاہیئے بہر حال "لڑاکو" کے یہ جملے مجھے پسند آئے

"بزرگو اور بھائیو آپ نے جو ہمارے
اس جلسہ میں زحمت فرمائی اس کا ہم بہت بہت
شکریہ ادا کرتے ہیں اور ہم لوگ آپ کی اس
محبت کو کبھی نہ بھولیں گے"

رپوٹ رحیم احمد کے اس جملے پر ختم ہوئی "جامعہ کی یہ

سالگرہ آپ کو بھی مبارک ہو" جلسہ ذاکر صاحب کے اس اعلان پر ختم ہوا کہ عمارت کے لیئے اعلیٰ حضرت حضور نظام نے جس رقم کا وعدہ فرمایا تھا وہ مل گئی ہے اس طرح سب لوگ خوش خوش اپنے گھروں کو لوٹے

اسی سال ان داموں سے شہر سے آٹھ میل دور جمنا کے کنارے جہاں سے آگرہ نہر نکالی گئی ہے جامعہ کی عمارتوں کے لیئے زمین خرید لی گئی اس کے قریب ہی اوکھلا گاؤں ہے

اس جلسہ کی ایک اور چیز یاد آئی ہے ہنگری کے مشرقی زبانیں جاننے والے مشہور پروفیسر گرمانس نے نعرۂ تکبیر کی گونج میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا بعد میں آپ کا نام عبدالکریم ہوگیا

اسی رات کو جامعہ میں دوسرا مشہور مشاعرہ ہوا جس میں ثاقب لکھنوی، حسرت موہانی، حفیظ جالندھری، اصغر گونڈوی، سعید بریلوی، ساحر دہلوی، کے علاوہ مانی جائسی عشرت رحمانی اکبر حیدری نے اپنا اپنا کلام سنایا

حفیظ جالندھری نے مولانا محمد علی کے غم میں تازہ مرثیہ لکھا تھا غم کے ساتھ ساتھ مولانا کی خصوصیات کو گرجتی ہوئی

آواز میں خاص انداز میں پڑھا تھا لوگ بھی جوش کے ساتھ سُنتے رہے بعد میں یہ طرز جامعہ میں عام ہوگئی

پہلے سے یہ طے ہو گیا تھا کہ ابتدائی والے عید پر اور ثانوی و کُلیہ والے تاسیس پر ڈراما کھیلیں چنانچہ بڑے لڑکوں نے پروفیسر محمد مجیب صاحب کی رہنمائی میں ڈراما "کھیتی" اسٹیج کیا جو مُجیب صاحب ہی کا لکھا ہوا تھا۔ بشیر صاحب نے لمبی لمبی تقریروں کو یاد کرکے "یا تونی مولوی" کی جو نقل اُتاری وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ اِن ہی دنوں دہلی میں کانگرس کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہو رہا تھا ڈاکٹر انصاری صاحب اس ڈرامے کے دِکھانے کے لئے مجلس کے سب لوگوں کو اپنے ساتھ لے آئے تھے

ڈاکٹر عابد صاحب نے عید کے لئے ایک ڈراما "شریر لڑکا" لکھ دیا تھا اِس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اگر لڑکوں کو ٹھیک باتیں بتانے والا نہ ملے تو وہ اپنی شرارت سے اُودھم مچاتے پھرتے ہیں لیکن ان کی طبیعت کے موافق کام نکل آئے یا انھیں ایسا کام بتایا جائے تو وہ اپنی طاقت کو بڑی خوشی سے اچھے کاموں میں لگا دیں گے عابد صاحب

کی یہ عادت ہے کہ وہ لڑکوں کے سامنے سمجھ بوجھ کی باتیں رکھتے ہیں اور مثالوں اور دلیلوں کے ذریعہ سمجھاتے بھی ہیں یہ نہیں کہ شرارت کرنے پر کان پکڑے اور دو طمانچے مار دیئے تمام واقعات اقامت گاہ اور مدرسہ سے متعلق ہیں اس لئے اس تماشے کے کھیلنے سے طرح طرح کے لڑکے اور ان کی بولیاں سامنے آتی ہیں دیکھنے والے جگہ جگہ بے اختیار ہنس بھی دیتے ہیں ایک منظر میں کسی لڑکے نے دوسرے سے کہا کہ تمھارا لحاف تو جاپانی ہے اس پر وہ لڑکا بگڑ بیٹھا اور سر ہو گیا کہ تم نے میرے لحاف کو جاپانی کیسے کہہ دیا لحاف دکھاتے ہوئے کہنے لگا "خاص فرخ آباد کا چھپا ہوا ہے، فرخ آباد کا" سامان تیار کرنے کی ضرورت یوں نہ ہوئی کہ اقامت گاہ، مدرسہ اور کھیل کا میدان دکھانے کے لئے سچ مچ کی سب چیزیں موجود تھیں لڑکوں کو بہت زیادہ سکھانے کی ضرورت یوں نہ پیش آئی کہ عابد صاحب نے جن جن لڑکوں کو سامنے رکھ کر لکھا تھا اُن ہی کو چُن لیا گیا اس لئے انعام کا سوال ہی پیدا نہ ہوا، پھر بھی جناب احد حسین صاحب نے محمد نور خاں کو ایک سونے کا تمغہ دے ہی دیا

اس سال کی ایک اور خاص چیز تعلیمی کھیل کود کا جلسہ ہے
جس طرح میدان میں ورزشی کھیل کود ہوتے ہیں اسی طرح ہال کے
ایک حصہ میں تماشائی اور دوسرے حصہ میں یہ کھیل دکھائے گئے
پہلی جماعت سے گتوں کے ذریعہ دیوار میں لگے ہوئے فریم
میں کہانی جوڑنے کا مقابلہ، لفظوں کے ڈھیر سے مقررہ لفظ
نکال لانا، دوسری جماعت والوں سے "ریلے ریس" کی طرح
ہند سے لکھنے کی دوڑ، غرض کہ ہر ایک جماعت سے طرح
طرح کے کھیل کروائے گئے اور آخر میں اوّل، دوم اور سوم
آنے والوں کو انعامات دیئے گئے اِس میں بعض ہنسنے
ہنسانے کے بھی کھیل تھے گتّوں پر مختلف ہدایتیں لکھ دی تھیں
مثلاً "ایک پیر پر کھڑے رہو" "زور زور سے روؤ"
"خوب ہنسو" "فلاں کے کان پکڑو" "قلا بازی کھاؤ" "لکھنوی
سلام کرو" وغیرہ۔ یہ گتّے تاش کی طرح اُلٹے کر کے رکھ دیئے
تھے پہلی جماعت والوں سے کہا گیا تھا کہ کوئی ایک گتّا اٹھالو
اور اسی کے مطابق عمل کرو اسدالرحمٰن نے جب لکھنوی سلام
کیا تو خوب تالیاں بجیں، معلوم نہیں اب یہ کہاں ہیں کیا کرتے
ہیں پہلی جماعت سے چھٹی جماعت تک کے تمام کھیل

"تعلیمی کھیل" کے نام سے میں نے چھپوا بھی دیئے ہیں

پہلے سال بنک، دُکان کا کاروبار ہی کتنا تھا یہ سب کام ایک ہی کمرے میں ہوتا تھا مگر اب طلبار کی تعداد، ان کی ضروریات کا خیال کرکے بنک، دُکان علیحدہ علیحدہ کمروں میں کر دیئے گئے تاکہ لڑکوں کی بھیڑ سے کام کا حرج نہ ہو۔ مکتبہ والوں سے کہا گیا کہ وہ کمیشن پر دُکان کی معرفت کتابیں فروخت کریں۔ حافظ صاحب نے جامعہ کے خاص سرورق کے ساتھ اچھی اچھی کاپیاں بنوا دیں، آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اتحادی دُکان سے کوئی تعلق ہی نہ رہے، دہلی منتقل ہونے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے تو یہ دُکان شفیق صاحب نے چلائی مگر پھر حافظ صاحب ہی اس کے ذمہ دار ہو گئے،

۳۰ اپریل کو بنک کا دُوسرا سالانہ جلسہ ہوا، آخر میں اُنتیس روپئے تین آنے نو پائی کی رقم باقی رہ گئی تھی اس لئے پچیس فی صدی کے حساب سے دس روپئے تین آنے نفع دیا گیا

بچوں کے کام کے نمونے جمع ہو گئے تھے تجویز ہوئی کہ ان چیزوں کو ایک مستقل کمرے میں سجا کر رکھ دیں تاکہ

چیزیں تیار ہونے پر پرانی ہٹالی جائیں اور نیا کام رکھ دیا جایا کرے۔ اس تجویز کے وقت دو باتیں سامنے تھیں، ایک تو یہ کہ نئے آنے والے لڑکوں کو اس کام سے مدد ملے دوسرے یہ کہ مہمانوں کے لئے یہاں کا کام سمجھنے میں سہولت ہو جائے۔ تعلیمی صندوق، بچوں کے مضامین، لکھائی کے نمونے، کہانی یا نظم کو تصویروں کے ذریعے ظاہر کرنے والے چارٹ، باغبانی پروجکٹ اور میلا ڈالینی پروجکٹ کی روئداد، مختلف چارٹ اور نقشے، بچوں کی بنائی ہوئی چھوٹی چھوٹی کتابیں اور رسالے یہ سب چیزیں دیوار کے ساتھ ساتھ اونچی میزوں پر سلیقے سے رکھ دی گئی تھیں، ڈرائنگ کا پچھلا کام فائلوں میں اور نیا کام گتوں کے ذریعے دیوار میں لگا دیا گیا تھا

اوپر کی جماعتوں یعنی چہارم اور پنجم کے سالانہ امتحان کے لئے تجویز ہوا کہ طلبار اپنے سال بھر کے کام کی ایک کتاب تیار کریں کام ترتیب دینے کے لئے سلسلہ وار سوالات دے دئیے گئے تھے مثلاً کون سی کتابیں پڑھی ہیں، کتنے مضمون لکھے ہیں تمہارا کون سا مضمون اچھا ہے اور کیوں، کون کون سی نظمیں سیکھی ہیں، کتب خانے کے کن رسالوں کو پسند کرتے ہو

اور کیوں۔ تم اپنے مدرسہ میں کس قسم کی کمی دیکھتے ہو۔ تم نے اپنی جماعت یا مدرسہ کو خوبصورت بنانے کے لئے کون سی مدد کی۔ جلسوں کا رنگ کیسا رہا، تمھاری سب سے اچھی ڈرائنگ کون سی ہے، غرض کہ اسلامیات، حساب، باغبانی، ڈرائنگ اردو، شعبہ جات، جلسے، مدرسہ کا انتظام وغیرہ کے متعلق بہت سے سوالات دیئے گئے تھے جن سے ہر ایک کے کام کی جانچ پڑتال ہو جائے۔ لڑکوں نے اس کتاب کے لئے اچھا سا سرورق بھی بنایا۔ محمّد نور خاں نے مور، طوطا، مچھلی، دو جھنڈے اور ایک ٹہنی ان سب چیزوں کو ایک ہی صفحے میں اس طرح ترتیب دیا تھا جس سے خوبصورت "سرورق" بن جائے، درمیان میں لکھا ہوا تھا "ہمارا سال بھر کا کام" اِس سوال کے جواب میں کہ املاء کی غلطیاں کس طرح درست ہوئیں محمّد نور خاں ایک جگہ لکھتے ہیں

"پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہم کو جماعت میں ایک
ایسا طریقہ سمجھایا گیا ہے کہ اگر ہم اس پر دھیان دیں
تو حرفوں کا جوڑ توڑ کتنا ہی مشکل ہو غلطی نہ ہوگی
دیہ چیز ہیں ہمیں اُستادوں کے مدرسے کی کہانی

میں سمجھاؤں گا) دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم کو مضامین
کثرت سے لکھوائے گئے ہیں ہر دفعہ املار کی
غلطیوں کے نیچے نشان کر دیا جاتا تھا جس سے
یہ غلطیاں درست ہو گئیں، تیسری وجہ یہ ہے کہ
میں کتابوں کا مطالعہ اکثر کیا کرتا ہوں اس لئے
غلطیاں بہت کم ہوا کرتی ہیں"

امتحانات کے قاعدے قوانین میں تبدیلی ہوئی، کامیابی کا
معیار پچاس فی صدی کر دیا گیا اِس بنا پر کہ لڑکوں کو جو کچھ بتایا
جائے اُن سے بہت کچھ واقف رہنا چاہیئے۔ پھر ان نمبروں کو
دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، آدھے نمبر تو اُستادوں کے اختیار میں
دیئے گئے، کہ وہ لڑکوں کا سال بھر کا کام دیکھ کر دیں اور آدھے
نمبر ممتحن کے لیے رکھے گئے کہ وہ اپنے طور پر لڑکوں کو جانچ کر
فیصلہ کرے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ جانچ میں غلطی کے امکانات
جاتے رہے

ثانوی اور کلیہ والے ہمارے کاموں کو غور سے دیکھ
رہے تھے یہاں بھی پڑھائی میں جستجو اور تلاش شروع ہو گئی
تھی، جن کاموں میں چھوٹے بچوں کی مدد کرنی چاہیئے وہ

اس کے لیئے تیار تھے چنانچہ میلاد النبی کے جلسے میں ثانوی دوم
والوں نے سعید صاحب کی نگرانی میں بڑے پیمانے پر ہندوستان
اور عرب کے راستوں کا نقشہ پیش کیا تھا اس میں سمندر اور
خشکی کا راستہ اور ہوائی جہازوں کا زیرِ غور راستہ بھی دکھلایا
تھا۔ مدرسہ شاخ نے بید کی کشتی میں روضہ پاک کا نقشہ
بنا کر دیا

انجمن اتحاد والوں نے ڈاکٹر ہاشم امیر علی، کرنل جیرڈ
اور مولانا آزاد سبحانی سے تقریریں کروائیں انجمن کی دعوت
پر جگر مراد آبادی نے بھی اپنا کلام سنایا مگر یہ بچوں کے لئے کچھ
نہیں لکھتے ہیں

رئیس احمد صاحب جعفری نائب صدر انجمن اتحاد کی
رپوٹ میں ایک چیز دلچسپ ملتی ہے اور وہ ہے انجمن کے قیام
سے اس وقت تک کے جلسوں کی تعداد، فرماتے ہیں کہ "میری
صدارت کامیاب رہی یا ناکامیاب، اس سے اندازہ لگا لیجیے
کہ انجمن کے دوسرے صدر* مولانا سعدالدین صاحب کے زمانے میں
دو، ٭ شفیق صاحب کے وقت چھبیس، ٭ ظہیرالدین صاحب
سینتیس ٭ ڈاکٹر یوسف صاحب اٹھائیس، ٭ احراری صاحب

---

* انجمن کے پہلے صدر سید نور اللہ صاحب تھے جو علیگڈھ کے زمانہ سے چلے آرہے تھے

چھبیس، ٭ حمید صاحب زبیری سینتالیس ٭ محمود حسین خاں صاحب چونتیس، ٭ عبدالکریم صاحب پشاوری چالیس، انور خاں صاحب سینتالیس، ٭ محمد حسین صاحب حیدرآبادی سینتیس اور میرے (یعنی رئیس احمد صاحب) زمانے میں اکتالیس جلسے ہوئے

میں نے یہ فہرست اس لیے درج کی ہے کہ اس سے انجمن کے نائب صدروں کے نام اور ان کے کام سلسلہ وار سامنے آ جاتے ہیں ان میں سے چھ آدمی جن پر ٭ نشان بنا ہے اُستاد ہو گئے ہیں، ٭ والے جن کی تعداد تین ہے رہنما (لیڈر) ہوئے ہیں، انور خاں صاحب اپنا کاروبار کرتے ہیں، رئیس احمد صاحب اخبار خلافت کے مُدیر ہیں جب کبھی جامعہ کا معاملہ لوگوں کے سامنے آتا ہے یہ اچھے اچھے مقالے (ایڈیٹوریل نوٹ) لکھتے ہیں۔ بات میں بات نکل ہی آتی ہے جامعہ کے پُرانے طالب علم مُعین الدین صاحب حارث جو بمبئی سے حکیم اجمل خاں صاحب کی یادگار میں روزانہ اخبار "اجمل" نکال رہے ہیں یہ بھی جامعہ کی ترقی میں نہ صرف اپنے اخبار میں لکھتے ہیں بلکہ کچھ اور کام بھی کرتے رہتے ہیں مثلاً رسالہ جامعہ اور پیام تعلیم کے خریدار بنانا، مکتبہ کے لیے کتابوں کی فرمائش دلوانا۔ ہمدردان جامعہ

کے رُکن بنانا وغیرہ جامعہ کے نمونے کے طالب علم کی حیثیت سے
حارث صاحب جس طرح کام کر رہے ہیں اس کا حال اُنیسویں
سال کی کہانی میں لکھوں گا جب کہ میں بمبئی کے استادوں کو کچھ
سمجھانے کے لئے وہاں گیا تھا اور حارث صاحب کے ہاں ٹھہرا تھا
ڈاکٹر عابد صاحب کی نگرانی میں اس سال اُردو اکادمی
والوں نے بھی لائق لائق لوگوں سے علمی مضامین پڑھوانے کا
خاص انتظام کیا تھا پہلے جلسے میں پروفیسر وہاج الدین صاحب نے
مذہب کی باتوں پر روشنی ڈالی یہ عجیب اتفاق ہے کہ مُدرسوں
کی طالب علمی کے زمانہ میں مجھے جن جن لوگوں سے خاص طور پر
واسطہ رہا ہے یعنی مولوی عبدالحق صاحب پروفیسر وہاج الدین صاحب
مولوی احمد علی صاحب ان سب لوگوں کا تعلق جامعہ سے اتنا
ہی گہرا ہے جتنا اس کے خاص ہمدردوں کا ہو سکتا ہے ،
وہاج الدین صاحب تو آج کل جامعہ عثمانیہ کے نائب امیر جامعہ
کے مددگار ہیں ۔ انتظامی قابلیت بلا کی ہے ۔ اپنا کام بہت پھرتی
سے کرتے ہیں ۔ لُطف یہ کہ ایک طرف علمی مقالے پڑھتے ہیں
دوسری طرف دفتری کاروبار بہترین طریقے سے انجام دیتے
ہیں ۔ کُلیہ کے لڑکوں کے لئے ڈرامے بھی لکھتے ہیں رسالہ جامعہ میں

آپ کے اچھے اچھے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں۔ پڑھاتے بھی
خوب ہیں "اُستادوں کا مدرسہ" (حیدرآباد دکن) میں ایک سال تک
میں نے آپ سے پڑھا ہے۔ بہت محنتی اور محبتی آدمی ہیں،
مجھے اس قسم کے لوگ پسند ہیں جن میں علمی اور انتظامی دونوں
قابلیتیں پائی جائیں۔ جب میں جامعہ عثمانیہ دیکھنے گیا تو آپ نے
ذاکر صاحب، عابد صاحب، اور مجیب صاحب کی خیریت پوچھی
تھی ڈاکٹر یوسف صاحب کے یہاں جب بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے
جامعہ کا تذکرہ رہتا ہے۔ جامعہ کا کوئی شخص جو انھیں جانتا نہ ہو
اپنا تعارف جامعی کی صورت میں کرائے تو میرا خیال ہے یہ اُسی
طرح پیش آئیں گے جس طرح میرے ساتھ پیش آتے ہیں جامعہ
کی محبت نے کتنے ہی دور دور کے لوگوں کو ایک دوسرے سے
ملا دیا ہے ——— ہاں تو جلسوں کی بات ہو رہی تھی دوسرے
جلسے میں قاضی عبدالغفار صاحب نے جمال الدین افغانی کی سیرت
پر مضمون پڑھا تیسرے میں مولانا اسلم صاحب جیراجپوری نے
"مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر" کے عُنوان سے اپنے
خیالات سُنائے، مولانا کو تاریخ اسلام سے خاص دلچسپی ہے
واقعات کو عقیدے سے نہیں بلکہ عقل سے دیکھنے کی کوشش

کرتے ہیں، قرآن شریف کو سیدھے سادے طریقے سے سمجھا دیتے ہیں۔ فارسی خوب پڑھاتے ہیں۔ بچوں کے لئے اسلامیات کے ایک دو رسالے بھی لکھے ہیں۔ اپنی زندگی جامعہ کے لئے وقف کردی ہے

اردو اکادمی کی تاریخ میں ۹ر اپریل ۱۹۳۲ء کا وہ جلسہ مباحثہ یادگار رہے گا جس میں ایک مضمون کی موافقت میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے اور اس کی مخالفت میں خواجہ غلام السیدین صاحب نے تقریر کی تھی مضمون یہ تھا کہ "ہندوستانی یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم ناقص ہے" حمایت میں ڈاکٹر سعید، ڈاکٹر عبدالعلیم، مولوی نورالرحمٰن صاحب اور سید تجمل حسین صاحب نے تقریریں کیں لیکن مخالفت کے میدان میں ایک ہی سردار تھا یعنی سیدین صاحب۔ سید تجمل حسین صاحب تو اپنی تقریر میں بات بات پر ہنسا دیتے تھے لوگ اس جلسے سے بہت خوش تھے۔ کبھی کبھی اس قسم کی محفلیں بھی گرم ہو جایا کریں تو چہل پہل رہتی ہے اور تفریح بھی ہوتی ہے۔ نقل کرنے والوں کو موقع مل جاتا ہے اور سیکھنے والے فائدہ اٹھاتے ہیں

پچھلے سال کی طرح اس سال بھی استاد اور اتالیق صاحبان

کے جلسے میں میں نے ایک مضمون پڑھا جس میں اس بات
پر زور دیا تھا کہ مدرسہ اور اقامت گاہ میں ہم یہ سمجھ کر کام
کریں کہ یہ مدرسہ ہمارا ہے اس کے چلانے والے ہم ہی لوگ
ہیں اس کا نقصان ہمارا نقصان ہے اس کا فائدہ ہماری زندگی
کو قوت بخشنے والا ہے۔ جو کچھ سُنا رہا تھا وہ ایک جلسہ کی
خانہ پوری کرنے کے لئے نہیں بلکہ دل سے نکلی ہوئی باتیں تھیں
اس لئے سب نے دھیان سے سُنا

نواب اکبر یار جنگ بہادر، خواجہ غلام السیدین صاحب
قاضی عبدالغفار صاحب، مس کوپ لینڈ (گلاسکو) ڈاکٹر ارش ٹیلے
منشی پریم چند نے مدرسہ کا معائنہ فرما کر ایک کتاب میں اچھی
اچھی رائیں لکھیں

جس مدرسہ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہو بھلا وہاں کا پُرانا
نصاب تعلیم بدلا نہ جاتا!! نصاب کی تیاری کا کام سال کے
شروع میں مختلف لوگوں کو دے دیا گیا تھا ان لوگوں نے چھ
مہینے تک تلاش اور جستجو سے کام لے کر اپنے اپنے خاکے
تیار کئے پھر کئی مہینوں تک ان خاکوں پر اُستادوں کے
جلسوں میں گفتگو ہوتی رہی بالآخر مجلس تعلیمی نے اس کی منظوری

دے دی اور حافظ صاحب مہتمل جامعہ نے بڑی محنت سے چھپوا دیا۔ بڑے سائز کے سوا سو صفحوں کا یہ نصاب صرف ابتدائی چھ جماعتوں کا ہے۔ اس میں پڑھائی جانے والی چیزوں کی تفصیلات اور استادوں کے لئے اشارے درج ہیں کوشش کی گئی ہے کہ جس عمر میں جو چیز بچوں کو پڑھانی چاہیئے وہی اس میں لکھی جائے۔ ایسا مواد استادوں کے سامنے رکھا گیا ہے جس سے لڑکوں کی زندگی سنورے وہ اپنے آس پاس کی چیزوں سے زیادہ سے زیادہ واقف ہو جائیں خدائے تعالیٰ نے ہر ایک لڑکے میں جو جو صلاحیتیں دے رکھی ہیں وہ رفتہ رفتہ اسی طرح بڑھیں جس طرح ایک اچھا ہرا بھرا پودا بڑھتا رہتا ہے اگر استاد اس نصاب کو غور سے پڑھ کر لڑکوں کی مدد کریں تو انھیں بھی اپنے کام میں لطف آئے گا کیونکہ اس میں کام کرنے اور کام لینے کا ڈھنگ ہی اس طرح کا لکھا ہے اُردو، انگریزی، ڈرائنگ کا نصاب ذاکر صاحب نے حساب اور معلومات عامہ کا برکت علی صاحب نے، اسلامیات کا سعد انصاری صاحب نے اور لوگوں کی مدد سے تیار کیا ہے

تعلیمی سال ختم ہوتے وقت میں نے آئندہ سال کا مکمل
پروگرام تیار کرکے شیخ الجامعہ صاحب کے پاس بھجوادیا حتیٰ کہ
مختلف کاموں اور جلسوں کے شروع ہونے کی تاریخ دن
اور وقت بھی لکھ دیا تھا

یہ چندہ ون کا کام بھی پیچھے لگا رہتا ہے ایک سال ناغہ
کرنے کے بعد استاد پھر جھولیاں لے کر نکلے ایک وفد تو
محمد مجیب صاحب کی نگرانی میں لنکا اور مالدیپ گیا۔ علی احمد صاحب
اپنے ساتھیوں کو برما لے گئے سعید انصاری صاحب نے
بنگلور اور ملابار کا دورہ کیا۔ حفیظ الدین صاحب نے اردو اکادمی
کے رکن بنانے کے لئے حیدر آباد دکن کو منتخب کیا

گرمیوں کی یہ چھٹیاں میں نے گھر پر گزاریں تھوڑے سے
دام جمع ہوگئے تھے اور کیوں نہ جمع ہوتے تنخواہ بھی پچیس
کی بجائے چالیس ہوگئی تھی۔ کچھ قرض لے کر مرحوم بڑے
بھائی کی بچی کی شادی کردی۔ اس بچی کے ماں باپ بچپن
ہی میں اللہ کے پیارے ہوئے تھے۔ دادی نے پالا پوسا تھا
جب میں گھر گیا تو والدہ یہی کہتی تھیں کہ ان کی زندگی ہی
میں اس کی شادی کرادوں۔ انھیں اس بات کی بہت فکر

رہتی تھی کہ ان کے سامنے ہی یہ بچی گھر بار کی ہو جائے شاید والدہ کو یہ خیال بھی رہا ہو کہ گھر کی طرف سے بے فکری کا جو الزام مجھ پر لگا یا گیا تھا اس کی صفائی ہو جائے کیونکہ وہ میرے خلاف کچھ سُننا نہیں چاہتی تھیں

واپسی پر پربھنی (دکن) میں محمد حُسین صاحب کے ہاں ٹھہرا حُسین صاحب جامعہ کے بی اے ہیں، ابتدائی جماعت میں داخل ہوئے تھے ـــــــ بعض لڑکے جامعہ کی خصوصیات اور روایات کو اس طرح اپنا لیتے ہیں کہ وہ جہاں بھی رہیں جس حال میں رہیں ان خصوصیات پر عامل رہتے ہیں حُسین صاحب جامعہ کے ایسے ہی طالب علموں میں سے ہیں۔ اپنی فرصت کا زمانہ آپ کے ساتھ گزار کر جو خوشی مجھے حاصل ہوتی ہے وہ اُن نعمتوں میں سے ایک ہے جو خدا نے مجھے دے رکھی ہیں

بیماری کے زمانے میں کسی کا خیال کر کے اگر تسکین ہوتی ہے تو وہ حُسین صاحب ہیں حالانکہ جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے سینکڑوں میل دور رہتے ہیں ایک دوسرے کے قریب پہنچنا بھی ایک مرحلہ ہے حُسین صاحب کا چال چلن ہونے کا ہو جاتا

ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ دُکھ میں دوستوں کے قریب
اور سکھ میں اُن سے لاپرواسے رہتے ہیں
عرب کی مہمان نوازی مشہور ہے اِس بارے میں
حُسین صاحب تو ایک طرف رہے ان کے بھتیجے (جن کی عمر
اُس وقت چار پانچ سال کی تھی)، اس مہمان نوازی کا ثبوت تھے
مدرسہ ابتدائی کا انتظام بدلے دو ہی سال ہوئے تھے
باغیچہ کا ہنگامہ مستقل صورت اختیار کر چکا تھا۔ بنک، دُکان کا
کاروبار چلنے لگا۔ کتب خانے کی رونق بڑھی، جماعتوں کے
سامنے نئے نئے کام رکھے جانے لگے۔ تعلیمی کمرے کی نمائش
میں اضافہ ہونے لگا لڑکوں کی تعداد بڑھنے سے اقامت گاہوں
میں چہل پہل نظر آنے لگی۔ نئے لڑکے شروع میں ہنگامہ برپا
کرتے کہ "مجھے گھر بھیجدو" لیکن چند ہفتوں بعد اُستاد اِس
جُملے کو دُہراتا تو یہ مُسکرا دیتے۔ مس کوپ لینڈ (گلاسگو)
نے بچوں کے چہروں سے شوق ٹپکتا دیکھا۔ ڈاکٹر اریش ٹیلے
(برلن) نے یہاں کے کام میں اپنے لئے اجنبیت محسوس نہیں
کی۔ منشی پریم چند کو بچوں کی تحریروں میں ادبی جھلک نظر
آنے لگی۔ قاضی عبدالغفار صاحب کو "زندگی کے اُفق پر

اس چھوٹی سی شعاع سے آفتاب کی آمد کی خبر معلوم ہونے لگی
قاضی صاحب کا انداز شاعرانہ ہے۔ انھوں نے بات ہی ایسی
کہہ دی۔ معلوم نہیں تم سمجھے یا نہیں مگر ہر چیز کا سمجھنا ضروری
بھی نہیں ہوتا ہے۔ یہ سنو کہ خواجہ غلام السیدین صاحب نے
کیا کہا۔ یہ ٹھہرے اُستادوں کے استاد مگر تمھارے کام نے
ان پر بھی اثر کیا فرمانے لگے " یہ ایک نہایت قیمتی تجربہ ہے
اور جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں صحیح اُصولوں پر کیا جا رہا ہے"
بھلا ان باتوں کو دیکھ کر ایک شاعر سے چُپ رہا جاتا!
مولانا شرف الدین صاحب اگرچہ بوڑھے تھے مگر دل جوان تھا
مدرسہ میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا نقشہ نظم میں کھینچ دیا لُطف یہ
کہ لکھا بھی تم ہی لوگوں کو مخاطب کرکے لو سُنو

ہماری جامعہ

اب سے چند مہینے پہلے — رہتے تھے ہم خوش گھر اپنے
دیکھتے پھرتے سیر تماشے! — کھاتے پیتے مزے اڑاتے
لکھنے پڑھنے سے نہ خبر تھی — جانتے تھے بس کھیل کھلونے
ایک دن ابّا گھر میں آکر — سینہ سے مجھ کو لگا کر

کہنے لگے او میرے پیارے — دل کے ٹکڑے آنکھ کے تارے
تم سے میں ایک بات ہوں کہتا — مانو گے تم میرا کہنا ؟
دہلی میں ہے ایک مدرسہ اچھا — جامعہ اس کا نام ہے بیٹا
تم کو وہاں میں پہنچا دوں گا — جا کے وہاں تم لکھنا پڑھنا
گھر اپنا اسے کہتے ہیں بچے — خوش بہت وہاں رہتے ہیں بچے
سن کے یہ سب ابا کا کہنا !! — دھک سے کلیجہ ہو گیا میرا
سسکیاں لے کر رونے لگا میں — آنسوؤں سے منہ دھونے لگا میں
سینے سے پھر ابا نے لگایا — پھسلایا سمجھایا بجھایا
دی پھر اماں نے بھی تسلی — آنے پر میں ہو گیا راضی!
جامعہ میں لائے مجھے ابا — چھوڑ کے جب جانے لگے ابا
اب تو بہت ہی میں گھبرایا — آنکھوں میں آنسو بھر لایا
ارشاد الحق صاحب آئے — ساتھ کئی لڑکوں کو لائے
مجھ سے کہا یہ بھی تو ہیں بچے — یہ تو ذرا نہیں روتے دھوتے
تم بھی یوں ہی بہلا لو دل کو — ساتھ اب ان کے کھیلو کودو
آہا یہ پنجرہ کیسا ہے — طوطا اس میں پلا ہوا ہے
یہ قمری تو سفید ہے بالکل — بولی سنو تو جیسے بلبل
پلے ہوئے ہیں جانور اکثر — مرغ ہرن خرگوش کبوتر

لو وہ بجی اب دوسری گھنٹی   آؤ چلو اسکول کو جلدی
پھر دل پر اک ہیبت چھائی   پڑھنے کی اب باری آئی
اتنے وہ مدھولی صاحب آئے   ہاتھ میں کچھ تصویریں لائے
پیار سے ہم کو پاس بلایا   اور ایک اچھا قصہ سنایا
روز ہمیں ہیں تاش دکھاتے   اور کہانی ایک سناتے
یوں ہی کئی دن تک سمجھایا   یوں ہی انہیں رستہ پہ لگایا
پہلے آپ سنائی کہانی   پھر ہم سے سنوائی کہانی
اے لو ہم تو پڑھنے لگے اب   جتنے لفظ تھے جان گئے سب
الف نہ بے تے جیم نہ حے خے   زیر زبر ہے ستّے نہ وچّے
گھول کے ہم کو پلا دیا یوں ہی   پڑھنا وڑھنا آ گیا یوں ہی
اب یہ بجی ہے کیسی گھنٹی   یہ گھنٹی ہے باغیچہ کی
آؤ وہاں اب کام کریں گے   کھیت کو اپنے پانی دیں گے
باغ بھی اچھا کھیت بھی اچھا   واہ وا! واہ وا! واہ وا! واہ وا!
ایک طرف ہے گاجر مولی   ایک طرف ہے سرسوں پھولی
ایک طرف سبزی ترکاری   ایک طرف ہے پھل پھلواری
اب تو یہاں جی لگ گیا میرا   اچھی ہے شام اچھا ہے سویرا
گھر پر یہ سب حال لکھوں گا   ابا کو خوش خبری دوں گا

کھیلنا پڑھنا کھیت کی محنت — لگ گئی سب کاموں میں طبیعت
پانچوں وقت خدا کی عبادت — ہوتی ہے ہر وقت جماعت
جامعہ میں آرام سے ہیں ہم — خوش اپنے ہر کام سے ہیں ہم
بچوں کی اور اُستادوں کی — یارب سب ہوں مُرادیں پوری
جامعہ کا ہر کام ہو اچھّا — جامعہ کا دُنیا میں ہو چرچا

ہر دِل میں ہو اُلفت اِس کی
دِن دوُنی ہو اِس کی ترقی

تیرھواں سال

اگست ۱۹۳۲ء سے جولائی ۱۹۳۳ء

ابتدائی پنجم نے جب سالانہ امتحان کامیاب کر لیا تو اب
یہ سوال کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا تھا کہ ششم کی پڑھائی کا
انتظام کس مدرسہ میں رہے۔ مدرسہ ابتدائی ہر طرح سے اس
جماعت کی ذمہ داریوں کو اُٹھانے کے قابل ہو گیا تھا لڑکوں کو
بڑی خوشی ہوئی جب انھیں یہ بتایا گیا کہ اِسی مدرسہ میں مزید
ایک سال رہ کر وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں۔ تقریباً یہ سب
وہی لڑکے تھے جنھوں نے چہارم اور پنجم کا زمانہ اسی مدرسہ میں
گزارا تھا پھر انھیں خوشی کیسے نہ ہوتی! ان سے یہ بھی کہہ دیا گیا
تھا کہ آپ لوگ خوش تو بہت ہو رہے ہیں لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ

آئندہ سال ساتویں جماعت یعنی ثانوی اول کا اضافہ یہاں نہ ہوگا
یہ مدرسہ ابتدائی ہے اس کی حد یہیں تک ہے پھر آپ کا ڈیل ڈول
تیزی کے ساتھ بڑھنے لگے گا اور آپ بڑے لڑکوں میں شمار
ہوتے لگیں گے۔ آپ کا اور یہاں کے لڑکوں کا جوڑ بے میل
رہے گا۔ کھیل کھلاتے وقت، جلسے اور ڈرامے کراتے وقت۔
مدرسہ کے سب لڑکوں کو جمع کر کے سمجھاتے وقت اُستادوں کو
دُشواری رہے گی اگر ثانوی اول اور دوم والے بھی یہیں جم کر
بیٹھ جائیں۔ لڑکے کہنے لگے "ہمیں منظور ہے مگر یہ بات تو پکی ہو گئی نا
کہ ششم جماعت یہیں رہے گی !!" میں نے کہا "ہاں اِس شرط
کے ساتھ پکی بات ہے"

ایک طرف ششم جماعت بڑھی دُوسری طرف نئے منئے
داخلے ہوتے گئے اب طلبار کی تعداد سو سے اوپر ہونے پر چھٹی
کا سوال نہیں رہا۔ یہ چیز تو پچھلے سال ہو چکی تھی دیکھتے دیکھتے
لڑکوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ گئی۔ اس دفعہ یہ اعلان ہوا
کہ ترانہ میں طلبار کی حاضری ایک سو پچاس ہونے پر ایک دن کی
چھٹی دے دی جائے گی کُل تعداد ایک سو باون تھی اس لئے یہ
مشکل نظر آ رہا تھا کہ حاضری ایک سو پچاس کی ہو جائے پھر بھی

لڑکوں نے کوشش شروع کر دی. تقریباً ایک سو پچاس کی حاضری ہو جاتی تھی مگر باقی پانچ چھ لڑکوں کی حاضری پوری کرنی مشکل ہوگئی تھی۔ اِتنی بڑی تعداد میں پانچ سات لڑکوں کا غیر حاضر ہونا معمولی بات ہے مجھے تو اُس وقت بڑا مزہ آیا کہ ایک دن ترانہ کی حاضری ایک سو اُنچاس ہوگئی تھی لڑکوں نے بہت شور مچایا کہ "ماسٹر صاحب ایک لڑکے کی کمی کوئی بات نہیں ہے چھٹی کر دیجیے"! میں نے بھی کہا کہ لینے کو چھٹی لے لو مگر دیکھ لو کہ یہ چھٹی "ڈیڑھ سو کی حاضری پر" کہلائے گی لڑکوں نے کہا اچھی بات ہے" دیکھیے" ہم بھی کوشش کرتے ہیں سب نے آپس میں عہد و پیمان کیا کہ کل کوئی لڑکا بھی غیر حاضر نہ رہے گا دوسرے دن دو بیمار لڑکوں کو اُٹھا لائے اب اعلان کی محتاجی کیسی جس وقت لڑکے زور زور سے گنتی کر رہے تھے ایک ——— دو ——— تین ——— پھر آخری لڑکے نے کہا ایک سو اکیاون ———

بڑے زوروں کی تالی بجی۔ میں نے چھٹی کی تصدیق کر دی

احمد علی صاحب موگا سے آگئے تھے ان کی بجائے جامعہ کے ایک اور طالب علم عبدالواحد صاحب کو بھیج دیا گیا۔ احمد علی صاحب نے پانچویں جماعت لی۔ میں بدستور پہلی اور آخری جماعت میں کام کرتا رہا یہ وقت پچھلے سال کی طرح اب بھی دو جگہ تقسیم تھا

(دو پیریڈ اول میں اور دو ششم میں) کیونکہ دفتری ذمہ داریاں بڑھ گئی
تھیں اور ان کارروائیوں میں بھی دلچسپی لینے لگا تھا ششم میں صرف
دو پیریڈ ہونے کی وجہ سے پروجیکٹ چلانے کا وقت میرے لئے
محدود ہو گیا تھا۔ تاہم حساب معلومات عامہ کے اُستاد کی مدد سے
اس کام کو جاری رکھا

ششم کے یہ لڑکے پروجیکٹ کے ذریعہ کام کرنے کی نہج
سے واقف ہو گئے تھے ان کی خواہش تھی کہ اب کی دفعہ "میلاد النبی
پروجیکٹ" پر اس طرح کام کریں کہ پچھلی خامیاں دور ہو جائیں اور ایک
ہی کام کو نئے رنگ میں پیش کرنے اور نئی نئی باتیں سیکھنے کا موقع
مل جائے ویسے بھی مدرسہ والوں نے طے کر لیا تھا کہ ہر سال خاص
خاص چیزیں نئے نئے رنگ میں جس طرح دُہرائی جاتی ہیں مثلاً
"قومی ہفتہ" "جامعہ کی سالگرہ" وغیرہ اسی طرح "میلاد النبی" کو بھی
شامل کر لیا جائے۔ بات بھی ٹھیک ہے جن چیزوں سے ہمارا خاص لگاؤ
ہے ان کی یاد تازہ رکھ کر ہمیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ آنحضرت
کی زندگی ہمارے لئے نمونہ ہے۔ آپ نے ہمیں بتایا ہے کہ اپنی
نیک نامی اور دوسروں کی بھلائی کے لئے کیا کچھ کرنا ہو گا۔ زندگی محض
کھانے پینے اور دن گزارنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں وہ کوششیں بھی

داخل ہیں جو بُرائیوں کو دُور کرنے اور اچھائیوں کے اختیار کرنے کے لیئے کرنی پڑتی ہیں۔ ان ہی کوششوں کو سمجھانے کے لئے ہر سال "میلاد النبیؐ" منایا جاتا ہے کوششوں کا یہ طریقہ اگر کسی بڑے آدمی کی زندگی کو سامنے رکھ کر سمجھایا جائے تو بات جلدی سمجھ میں آجاتی ہے ہمارے لئے آنحضرتؐ سے بڑی زندگی اور کس کی ہوسکتی ہے؟ آپؐ کی زندگی میں محنت، شجاعت، قربانی، آزادی، زندہ دلی محبت، اپنے محسن یعنی خدا کی عبادت —— محسن کے بندے یعنی لوگوں کی خدمت، ان سب چیزوں کے نمونے موجود ہیں۔ جامعہ کی تعلیمات کی بنیاد ہی ان چیزوں پر ہے قرآن شریف اس لئے نازل ہوا ہے کہ اس تعلیم کو پھیلائیں یہ تعلیم کسی ایک خاص جماعت کے لئے نہیں اُتری ہے یہ تو سب انسانوں میں پھیلانے کے لئے ہے اِس لئے ہندو، سکھ، عیسائی سب پڑوسیوں کے ساتھ ہمارا میل ملاپ رہتا ہے ہم "میلاد النبیؐ" کے جلسہ میں خاص طور پر اس بات کو بھی دہراتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے پڑوسیوں کے بارے میں کون سے فرائض ہمارے ذمہ کئے ہیں اب یہ دیکھو کہ اِن ہی چیزوں پر تمہارے ساتھیوں نے کس طرح کام کیا اور اسے کس رنگ میں پیش کیا

۱۹۳۲ء میں ربیع الاول کا مہینہ اگست ہی میں پڑتا تھا
لڑکے ہمارے اس ارادے سے واقف ہو گئے تھے کہ اس مہینہ
میں ہم کون سا کام کرنا چاہتے ہیں
"پھر کیا صورت ہوگی؟" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا
"کام شروع کر دیں گے" لڑکوں نے کہا
"کیسے"؟
"تقریریں لکھیں۔ نظمیں یاد کریں" ایک لڑکے نے کہا
"گلیوں کی صفائی کریں" دوسرے نے کہا
"ابھی سے"!!! تیسرے نے دوسرے کی طرف گھورتے
ہوئے کہا
ہر ایک لڑکا کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔ اچھا خاصا شور ہو گیا
"بھائی ایسے تو کام نہیں چلے گا، ایک ایک بات طے
ہو" میں نے کہا
"ہاں صاحب آپ بتائیے" ایک آواز آئی
"بتایا تو جائے گا مگر یہ بھی سوچا ہے کہ اگر ہم نے بالکل
ایسا ہی جلسہ کیا جیسا پچھلے سال ہوا تھا تو لوگ کیا کہیں گے؟
"کہیں گے نقل کی ہے" ایک نے کہا

" کہیں گے بس دیکھ لیا آتا واتا کچھ نہیں " دُوسرے نے کہا

" اوَر " ؟

" دلچسپ نہ ہوگا " تیسرے نے اِس جملے کو یوں پورا کیا

" اور لوگ کہیں گے چلوجی یہ تو پچھلے سال دیکھا تھا "

ایک لڑکے نے ڈسک پر ہاتھ مارکر کہا " بس نئے نئے

کام ہوں " دُوسرے نے کہا " اور رنگین بلب ہوں " تیسرے نے

کہا " نئے نئے نقشے ہوں "

مَیں نے پوری جماعت سے مخاطب ہوکر کہا

" کیا یہ سب کی خواہش ہے ؟ "

" برابر ——— بے شک ——— اور کیا " ——— ایک ہی

وقت میں خلط ملط یہ جملے سُنائی دئے

" اچھا تو یوں کرو پچھلے سال میلا ڈُلبنی پروجکٹ پر

جو کتاب شائع ہوئی ہے پڑھ کر اس کے چار حصے کرو

(۱) اُردو کے سلسلہ میں مضامین اور نظمیں لکھنے پڑھنے

کا کام

(۲) معلومات عامہ میں نقشے بنانا اور ان سے متعلق

معلومات

(۳) حساب کا کام

(۴) ڈرائنگ میں عرب کی تصویریں۔ دعوت ناموں کے

ڈزائن اور آرائش کا کام

اب یہ دیکھو کہ ہر ایک حصے میں ہم نے پچھلے سال کیا کام

کیا تھا اور اب کیا ہونا چاہیئے - یہ بھی دیکھو کہ پچھلے سال کا وہ

کون سا کام ہے جسے تم رکھنا چاہتے ہو وغیرہ

یہ کام ایک ایک حصے کو لے کر کئی دن میں کیا گیا لڑکوں

نے اپنی اپنی تجویزیں پیش کیں میں حیرت میں رہ گیا ایسی ایسی

تجویزیں سامنے آئیں جو میرے ذہن میں بھی نہیں تھیں اور

نہ اتنی اچھی تجویزیں میں اکیلا سوچ سکتا تھا - ان میں سے

چند دلچسپ تجویزیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں جس سے

تمھیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے ساتھیوں نے سوچا

کس طرح ہے

آفتاب احمد

پچھلے سال چھوٹی بڑی ایسی کئی کتابوں کی فہرست تیار

کی تھی جو آنحضرتؐ سے متعلق تھیں اور ان میں سے ہر ایک

کے متعلق لکھا تھا مگر یہ کام ہمارے لئے زیادہ ہے - سب

کتابیں سرسری طور پر بھی نہیں دیکھ سکتے آپ ایسی کتابیں
بتلا دیجیے جو ہمارے لئے آسان اور دلچسپ ہوں ان میں سے
کسی ایک کے بارے میں ہم اپنے خیالات ظاہر کریں گے
محمد نور خاں

" آنحضرت کی رحمدلی - آنحضرت کا صبر و استقلال
آنحضرت کا دشمنوں کے ساتھ برتاؤ " ان پر مضامین
لکھے جا سکتے ہیں
ابوالکلام

" نظمیں بہت سی ہوں جس میں حضور کے گیت ہوں
اور پیدائش کے سال کا ایک مضمون ہو " ہال میں بلب سے
" محمد " لکھا جائے
عبدالسمیع

ہندوستان اور عرب کا راستہ آنحضرت کے مختصر
حالات کے ساتھ ، یہ پچھلے سال ہو چکا تھا تو اس کو ہٹا کر
دوسرا نقشہ بنا کر وہ ملک دکھائیں جن میں اسلامی حکومت ہو
ہال میں بلب سے " محمد " لکھا جائے (معلوم نہیں آخری جملہ
ابوالکلام سے سمیع نے نقل کیا ہے یا سمیع سے ابوالکلام نے

عبدالعزیز

پچھلے سال ایک نقشہ ایسا بنایا گیا تھا جس میں عرب اور ہندوستان کا بحری اور برّی راستہ دکھایا گیا تھا اب کی دفعہ ایشیا کا نقشہ ہر ایک سے بنوایا جائے جس میں صرف مُقدّس مقامات کو ظاہر کریں

اسلام اللہ

عرب کا ایک بڑا نقشہ ہونا چاہیئے اس نقشہ میں پہاڑی کے پیچھے سے سورج نکل رہا ہو جس میں لکھا ہو "آفتاب رسالت" اور اس کے آس پاس رنگین بلب ہوں اور ان کا تعلق بجلی سے ہو اور اس نقشے کے اوپر ہار پڑا ہوا ہو جس وقت جلسہ شروع ہونے والا ہو تو تمام بجلیاں گُل کردی جائیں تب چھوٹے چھوٹے بلب جلا دئے جائیں نیچے آنحضرتؐ کی تعریف میں کوئی شعر لکھا ہو روشنی کرکے جلسہ شروع کیا جائے

فرّخ عزیز

اب کی دفعہ تقریریں اوپر گیلری سے ہوں کام کرنے والوں کا لباس یکساں ہو

خلیل الرحمن

مدد لینے کے لئے پچھلے سال کی مانند کوئی خاص اعلان نہ لگائیں بلکہ جن لوگوں سے مدد لینا ہے ان سے کہیں درخواست لکھیں

اس وقت تک چھٹی جماعت میں "کلاس ٹیچر سسٹم" رائج نہیں ہوا تھا۔ معلومات عامہ۔ حساب۔ ڈرائنگ کے کام کے متعلق میں نے لڑکوں سے کہا کہ یہ کام تو متعلقہ استاد صاحبان سے مشورہ کرکے ان ہی کی نگرانی میں کریں البتہ اردو کا کام میں کراؤں گا

"کس موضوع پر تقریریں لکھیں" میں نے ایک دن جماعت میں کہا سب نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق موضوع بتلائے

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ پچھلے سال کے نظم و نثر کے پروگرام کو سامنے رکھ کر ایک پروگرام بنائیں پھر اسی کے مطابق کام کریں ؟"

"ہاں ہاں یہ ٹھیک رہے گا" لڑکوں نے جواب دیا

کئی لڑکوں کے پاس "میلاد النبی پروجکٹ" کی مطبوعہ کتاب تھی پرانا پروگرام ان کے سامنے تھا لڑکوں کو سمجھایا گیا کہ اس

پروگرام میں ذیل کی باتیں پائی جاتی ہیں

۱۔ آنحضرت کی سیرت سے تعلق رکھنے والے مضامین

۲۔ جغرافیائی مضامین

۳۔ آنحضرت کے ارشادات

۴۔ نظم کا حصہ

۵۔ دُعا

اس تقسیم سے لڑکوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ پروگرام میں قسم قسم کی چیزیں ہونے سے سُننے والوں کی دلچسپی قائم رہے گی اور ہماری معلومات بھی ایک طرح کی نہ رہیں گی لڑکوں کو اپنی اپنی تجویزیں پیش کرنے میں سہولت رہے گی اور وہ بھٹکینگے نہیں ۔ بات چیت کے بعد پروگرام تیار ہوگیا ایسا پروگرام جو جماعت کے کام میں بھی مدد دے اور جلسے کے لئے بھی کام آئے ایسے نمونے کے طور پر درج کئے دیتا ہوں تاکہ ضرورت کے وقت حوالے کا کام دے سکے

۱۔ تلاوت قرآن شریف

۲۔ ہمارے رسول کے دیس تک جانے کے اخراجات (نقشے کے ذریعہ سمجھاتے ہوئے)

۳۔ نظم۔ "زمیں تمہارے ہی قدم سے رشکِ خلد بن گئی
تم ہی نے پیکرِ جہاں میں آکے روح پھونک دی"

۴۔ تین مشہور لڑائیاں (حُنین، خندق۔ خیبر)

۵۔ نظم۔ "سنسار کو پاپ نے گھیرا تھا ہر اور نپٹ اندھیرا تھا
باگوں کی طرح لڑتے تھے منش اتیائے کا گھر گھر ڈیرا تھا"
(محمود حسین صاحب اسرائیلی)

۶۔ آنحضرت کی نظر میں محنت کرنے والے

۷۔ بچے کی دُعا

۸۔ رسول خدا کی بچوں پر مہربانیاں

۹۔ نظم "وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مُرادیں غریبوں کی بر لانے والا"
(حالی)

۱۰۔ ہمارے رسول کے بارے میں بچوں کی کتابیں

۱۱۔ عربی کورس "طلع البدر علینا" الخ

۱۲۔ آنحضرت کا پہلا خطبہ

۱۳۔ ہم نے "میلادُ النبی پروجکٹ" کا کام کس طرح چلایا

۱۴۔ صدر جلسہ کی مختصر تقریر اور مٹھائی کی تقسیم کا

اعلان

یہ تمام کام ہر ایک لڑکے سے کروایا جاتا تو بہت زیادہ ہو جاتا اور ٹھیک سے نہ ہو پاتا۔ جماعت کی کئی ٹولیاں بنا دی گئیں اور ہر ایک کے ذمے واجبی کام دے دیا گیا۔ لڑکوں نے،
۱۔ کتابوں ۲۔ اُستادوں اور ۳۔ بڑے لڑکوں کی مدد سے اپنا اپنا کام مکمل کیا۔ ساتھ کے ساتھ اصلاح ہوتی گئی پھر جس کا مضمون سب سے اچھا تھا وہ سنانے کے لئے رکھ لیا گیا اُردو کا یہ سب کام مجھ سے متعلق تھا، اسلامیات کے گھنٹے میں توحید اور رسالت کا بیان۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر اعزہ کے لئے فاتحہ پڑھنے کا طریقہ۔ درود شریف اور اس کی اہمیت آنحضرت جنگ وغیرہ کے موقع پر کس طرح تیمم کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ یہ سب باتیں بتلائی گئیں۔ معلومات عامہ والوں نے ہمارے رسول کی جائے پیدائش اور مدفن کے بارے میں ضروری معلومات عرب کا دارالسلطنت وہاں کے باشندوں کی خوراک، رہنے سہنے کا طریقہ، ہندوستان اور عرب کا راستہ یہ سب باتیں بتلائیں ایشیا کا نقشہ بنوا کر مقدس مقامات کو دکھایا

حساب والوں نے بھی جہاں تک ہو سکا اس کام سے

اپنا تعلق قائم رکھا بسنہ ہجری اور عیسوی کا آغاز اور ان کا فرق۔ طلباء کی پیدائش اور ان کی عمروں سے متعلق سوالات، جلسے کے اخراجات کا تخمینہ، اشیاء کی خرید و فروخت کے سوالات، ہمارے رسول کے دیس تک آنے جانے اور وہاں رہنے کے اخراجات کا نقشہ۔ عرب کے سکے۔ ان کے بارے میں ضروری ضروری باتیں بتلائی گئیں

ڈرائنگ کا حال تو کچھ نہ پوچھو۔ اختر صاحب کو کھانے تک کی فرصت نہ ملتی تھی۔ ہر لڑکا پرچہ لئے کھڑا ہے کہ ہمیں اصلاح دے دیجئے کہیں رنگ بھرے جا رہے ہیں، کہیں پنسل کا کام ہو رہا ہے کسی کا پرچہ خراب ہو گیا ہے وہ منہ بنائے بیٹھا ہے، باوجود مصروفیتوں کے اختر صاحب اس بات کو بھولے نہیں ہیں کہ اس لڑکے نے کئی پرچے خراب کر دئے ہیں اس لئے وہ پرچہ دینے میں دیر لگا رہے ہیں۔ لڑکا دل ہی دل میں کڑھ رہا ہے کہ اور لڑکوں کی طرح صاف ستھرے طریقہ سے کام کرنے کا سلیقہ کب آئے گا اوروں کی ڈرائنگ دعوت ناموں کے ساتھ بھیجی جائے گی، ہال میں لگے گی، میرے کام کا کیا ہوگا!! اسے یکایک خیال آتا ہے۔ وہ دکان سے دو پیسے کا کاغذ لے کر اپنے پسند کی

چیز بناتا ہے، اختر صاحب بھی دنگ رہ جاتے ہیں اور خوش ہو کر اصلاح دیتے ہیں وہ دوڑا دوڑا میرے پاس پرچہ لاتا ہے کہ اب اس کی ڈرائنگ بھی ہال میں لگے گی۔ جب کبھی میں تھک جاتا ہوں تھوڑی دیر کے لئے ڈرائنگ کی جماعت میں جاکر بیٹھ جاتا ہوں یہاں کا رنگ برنگ کا کام دیکھ میری طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ کام کرتے ہوئے لڑکوں کو چھیڑ دیتا ہوں وہ غصہ میں میری طرف دیکھتے ہیں پھر مسکرا دیتے ہیں غرض کہ تازہ دم ہو کر کسی اور جماعت میں چلا جاتا ہوں۔ اُستاد صاحب مجھے دیکھتے ہی کہتے ہیں "غالباً آپ میلا دُلہنی کی نظم سُننے آئے ہیں" اقرار کر لیتا ہوں۔ لڑکا نظم سُناتا ہے۔ جماعت کے لڑکے مجھ سے پوچھتے ہیں" اور جماعتوں کا کیا حال ہے" جو کچھ اور جماعتوں میں دیکھا ہے بیان کر دیتا ہوں۔ ہال میں جاکر یہ سوچتا ہوں کہ یہاں کس قسم کی تصویر ہونی چاہیئے پھر اُس جماعت میں جاتا ہوں جہاں اس کام کے لئے لڑکوں کو فرصت ہے ان کے سامنے اس معاملہ کو رکھتا ہوں، وہ نہ صرف اچھی اچھی تجویزیں بتلاتے ہیں بلکہ اس کے کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اقامت گاہوں میں جاتا ہوں وہاں بھی یہی چرچے ہیں

اگر کچھ اور لکھوں تو عابد صاحب کہیں گے "آپ کے صفحے بڑھتے ہی جاتے ہیں" اس کا بھی خیال رکھئے کہ آٹھ سال کی کہانی باقی ہے لکھنے کے لیے اور موقعے بھی ملیں گے" خیر اور باتیں اور موقعوں پر ہی صحیح یہاں ڈرائنگ کے کاموں کی ایک فہرست درج کرتا ہوں جس سے تمھیں یہ معلوم ہوجائے گا کہ میلادُالنبی کے سلسلے میں کس قسم کی ڈرائنگ بنائی جاتی ہے یہ صرف نمونے کے طور پر ایک فہرست ہے اس سے تمھارے لئے اور باتیں سوچنے میں مدد ملے گی

۱۔ شام کا وقت ہے، چاند نکلا ہوا ہے بچے چاند کی طرف اشارے کرتے ہوئے " ربیع الاول کا چاند" کی آواز لگا رہے ہیں

۲۔ مدرسے کے سامنے کا منظر، چاندنی چھٹکی ہوئی ہے کہیں کہیں ابر دکھائی دیتا ہے، لوگ جلسے میں شریک ہونے کے لئے چلے آرہے ہیں

۳۔ جلسے میں داخل ہوتے وقت عطر لگایا جارہا ہے

۴۔ "روشن ستارہ" دکھائی دیتا ہے ستارے یعنی ہمارے رسول کی تعریف میں چند جملے لکھے ہوئے ہیں

۵۔ صفا کی پہاڑی سے "آفتاب رسالت" کی شعاعیں

تمام دُنیا میں پھیل رہی ہیں

۶۔ آنحضرت اور صحابۂ کرام کے ناموں کا طغرا

۷۔ حضرت فاطمہؓ کے چکّی پیسنے کا مُقام

۸۔ ہمارے رسولؐ کے مزار کا نقشہ

عرب کا ایک بہت بڑا نقشہ بھی بنایا گیا تھا جس میں یہ دکھایا گیا کہ پہاڑی کے پیچھے سے سورج نکل رہا ہے، اس کی شعاعیں تمام دنیا میں پھیل رہی ہیں۔ جوں جوں روشنی بڑھتی جاتی ہے دُنیا کی تمام بلائیں دور ہوتی جاتی ہیں۔ بلائیں دور ہونے کے خیال کو سانپ بچھو اور دیگر زہریلے جانوروں کے بھاگنے کے ذریعہ ظاہر کیا گیا

تصویریں بنانے میں ہر ایک جماعت نے حصہ لیا تھا بہت سا سامان جمع ہوگیا تھا اِن میں سے اچھی اچھی تصویریں تو ہال میں لگانے کے لئے رکھ لیں باقی کے استعمال کی ایک صورت یہ بھی نکالی گئی کہ چہارم سے لے کر ششم تک ہر ایک لڑکے نے دعوت نامے لکھے ان دعوت ناموں کے ساتھ ڈرائنگ کے پرچے منسلک کرکے اُستاد صاحبان اور مہمانوں کے پاس بھجوائے گئے۔ لڑکوں کے ہاتھ کے بنے ہوئے اِن رنگین دعوت ناموں نے جلسہ کی اہمیت

اور بھی بڑھا دی اور لوگ یہ سمجھے کہ جب دعوت اس اہتمام سے
دی جا رہی ہے تو جلسہ بھی بہت اہم ہوگا۔ ان کا یہ خیال صحیح نکلا
کیونکہ اس جلسے کی تیاری کوئی دو دن کی تو تھی نہیں پورے مہینہ بھر
لکھنے پڑھنے اور ڈرائنگ بنانے کا کام ہو رہا تھا۔ جب جلسے میں دو
دن رہ گئے تو ہال کی سجاوٹ شروع ہو گئی۔ اختر صاحب نے ناپ
ناپ کر تصویریں لگائیں۔ لڑکے ان کی ہر کام میں مدد کرتے رہے اور
یہ دیکھتے گئے کہ ہال کو کس طرح سجایا جاتا ہے بیچ بیچ میں لڑکے اپنی
رائے بھی دیتے تھے کہ فلاں تصویر اس جگہ لگے فلاں اس جگہ بڑا نقشہ
صدر کے پیچھے یعنی سننے والوں کے سامنے لگایا گیا تھا اختر صاحب
مصروفیت کا کام کرتے وقت کچھ خفا سے رہتے ہیں ان کی خفگی کا
ایک فائدہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ تصویریں لگاتے وقت ہنگامہ نہیں
ہوتا ہے اور فریم کے شیشے ٹوٹنے نہیں پاتے ہیں لڑکے چپ چاپ
اپنے کام کرتے ہیں لیکن یہ کام بغیر خفگی کے اور طریقوں سے بھی ہو سکتا
ہے مثلاً ایک دو فریم ٹوٹ جائیں تو خیر کوئی بات نہیں لیکن دو
چار شیشے ٹوٹ جائیں تو لڑکوں کو جمع کرکے یہ بات ان کے سامنے
رکھیں کہ یا تو لڑکے اسی طرح سلیقے اور احتیاط سے کام کریں جس طرح
سمجھایا جاتا ہے یا ان باتوں کے سیکھنے تک جلسہ کے ملتوی ہونے کا

اعلان کر دیں لڑکے اتنے ناسمجھ تو ہوتے نہیں کہ وہ اس موٹی سی
بات کو نہ سمجھیں۔ مجال ہے کہ جلسہ ملتوی کرنے کی نوبت آئے
میرا تجربہ تو یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر بعض لڑکے خود ہی نگرانی
کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ کام خراب نہ ہونے پائے اور اپنے
ساتھیوں کی خبر لیتے رہتے ہیں، استاد کو بیچ میں دخل دینے کی نوبت ہی
نہیں آتی ہے لو بات پھر بڑھ گئی کہاں ہال میں تصویریں لگائی
جا رہی تھیں کہاں یہ شیشے ٹوٹنے کا جھگڑا سامنے آ گیا لیکن میں نے
کوئی فرضی بات تو لکھی ہی نہیں واقعہ جیسے پیش آیا ویسے ہی
لکھ دیا۔ اگر لڑکے ایسا نہ کرتے تو میں کیوں لکھتا! دوسری طرف
جلسے میں تقریریں اور نظمیں سنانے والوں کی مشق ہوتی رہی۔ جلسے
سے ایک دن پہلے مدرسہ کے آخری گھنٹے میں سب لڑکے ہال
میں جمع ہو گئے تھے۔ جلسے کی تمام کارروائی اسی طرح پوری کی گئی
جس طرح اصل جلسے میں ہونے والی تھی تمہیں یاد ہو گا کہ ڈرامہ
دکھانے سے پہلے بھی اسی قسم کی آخری مشق ہوتی ہے جسے فائنل
ریہرسل کہتے ہیں آخر میں سننے والے لڑکوں نے اپنی رائے
بتائی اس طرح غلطیوں کو ٹھیک کیا گیا جس چیز کے متعلق لڑکے
کہہ دیں کہ یہ ٹھیک ہے تو سمجھئے بھی اس میں مشکل ہی سے غلطی

نکال سکتے ہیں، جب لڑکوں نے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے تو اطمینان
ہوگیا تھا کہ چلو ایک بات تو طے ہوگئی ہاں کہیں یہ بات بھول
نہ جاؤں کہ مشق تو ویسے جماعت کے ہر ایک لڑکے نے کی تھی مگر
سُنانے کے لئے احتیاطاً دو دو لڑکے چُنے گئے تھے کہ خدانخواستہ
ایک لڑکا وقت پر نہ آئے اور بیمار ہو جائے تو جھٹ دوسرا لڑکا
اس کام کو انجام دے اس طرح کہ لوگوں کو پتہ بھی نہ چلے۔ دیکھو
ریل گاڑی کا کام کہیں رُکتا ہے حالانکہ کام کرنے والے چھٹی بھی
لیتے، بیمار بھی ہوتے ہیں بہر حال ان چیزوں پر پہلے سے دھیان
دیں تو اوروں کو تکلیف نہیں ہوتی ہے اور یہ کام کوئی مشکل
بھی نہیں ہے ذرا سی توجہ سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ شروع
شروع میں ذرا ان چیزوں کی عادت ڈالنی پڑتی ہے
عین جلسے کے دن صبح کی ورزش سے کچھ لڑکوں کو
اجازت دلوادی تھی کہ وہ ٹھنڈے ٹھنڈے کچھ اور کام کریں
کام کرنے والوں کی کیا کمی تھی۔ جدھر نظر اُٹھائی لڑکے ہی لڑکے
نظر آتے تھے اگر آس پاس لڑکے نہ ہوں تو سیٹی بجانے پر
اچھی خاصی ٹولی جمع ہو جاتی تھی مجھے اس بات سے بہت خوشی
ہوتی ہے بلکہ بعض دفعہ پیار کرنے کو جی چاہتا ہے کہ لڑکے "کام" کا

نام سُنتے ہی چونکتے ہوکر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہر لڑکا یہ
کہتا ہے کہ اس کام کو "میں کروں گا" اور تو اور یہ اوّل اور دوم
والے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیتے ہیں "ہم بھی کریں گے" اور
بڑے لڑکوں کے ساتھ ساتھ لگے رہتے ہیں۔ دھوپ اور گرمی
میں انھیں کھینچ کر کوئی سائے میں لائے تو یہ مشکل سے راضی
ہوتے ہیں تم جانو پیار و محبت سے کام لینے والے جہاں ایک
طرف یہ خیال رکھتے ہیں کہ لڑکے زیادہ سے زیادہ اور اچھے
سے اچھا کام کرنے کے عادی ہو جائیں وہاں اس بات کو بھی
دیکھتے ہیں کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے ان کو نقصان
پہنچے البتہ غیر ضروری احتیاط سے مجھے نفرت ہے۔ میرا خیال ہے
کہ لڑکے اس طرح اپنے دل کی بات پوری نہیں کر سکتے۔ ہمیں
انھیں سب کچھ کرنے دینا چاہیئے۔ بس یہی کافی ہے کہ ان کے پیچھے
پیچھے رہ کر دیکھتے رہیں کہ یہ نا سمجھی سے اپنا کوئی نقصان تو نہیں
کر رہے ہیں اگر ایسے موقعوں پر ان کی ٹھیک سے رہنمائی کی گئی
تو وہ گرویدہ ہو جائیں گے اور اُستاد کی یہ رہنمائی دونوں کی
محبت میں اضافہ کر دے گی۔ بھلے اور بُرے کی پہچان ساتھ ساتھ
ترقی کرتی رہتی ہے میرا خیال ہے کہ لڑکوں کی خفگی اور محبت بیجا

نہیں ہوتی ہے ۔ میرا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ لڑکوں کی جا و بیجا
ہر خواہش کو پورا کیا جائے اِس صورت میں خرابی پیدا ہوگی اور
لڑکوں کے دلوں سے خود بخود استاد کا احترام جاتا رہے گا ۔ تو
بچو! میں اِس بات کو بھی پسند نہیں کرتا ہوں کہ تمہیں ہر وقت دھوپ
میں پھرنے اور گندی چیزیں یا کئی کئی دن کے دہی بڑے
اور چاٹ کھانے کی اجازت دی جائے ۔ ہاں تو اصل بات کیا
ہو رہی تھی یاد آیا صبح کی ورزش سے کچھ لڑکوں کو اجازت
دلوادی تھی کہ وہ ٹھنڈے ٹھنڈے ایک کام کو نبٹائیں ۔ یہ کام
تھا خوبصورت پھاٹک بنانا ۔ آنحضرت کی پیدائش کی مناسبت
سے ہری ہری ٹہنیوں سے پھاٹک بنایا گیا ۔ زیادہ تر آم کی
ٹہنیاں اور کیلے کے پتے تھے ۔ بجلی والے نے رنگین بلب چاروں
طرف لگائے درمیان میں چھوٹے چھوٹے بلبوں سے " محمدؐ "
بنا دیا تھا پھاٹک سے ہال تک راستے میں دونوں طرف گملے
رکھ دئے تھے جلسے میں کام کرنے والوں نے پہلے سے کھانا کھالیا
تھا رضا کار مختلف راستوں میں کھڑے ہوگئے تھے جس راستے
سے کوئی بڑا مہمان یا اُستاد گزرتا اِدھر کا رضا کار سیٹی بجا
دیتا ۔ سیٹی کو سُن کر بیچ والا پھر بیچ والے کی سیٹی سُن کر پھاٹک والا

اپنی سیٹی بجا دیتا اس سے جلسے کے کارکنوں کو معلوم ہو جاتا کہ
لوگ کس رفتار سے آ رہے ہیں ایک وقت ایسا آیا کہ سیٹیاں
بجنے کا تانتا بندھ گیا تھا۔ مطلب یہ کہ مہمان کثرت سے چلے آ رہے
ہیں ذرا سی دیر میں ہال بھر گیا۔ روشنی، تصویریں، لڑکوں کے
صاف ستھرے لباس اور صاف ستھرے چہروں سے ہال جگمگا رہا تھا جوتوں
کے انتظام پر لڑکے کھڑے تھے (حامد علی خاں صاحب بھی ان ہی کے ساتھ تھے)
ایک راستہ سے جانے اور دوسرے سے نکلنے کا انتظام تھا۔ جوں ہی مہمان
دروازہ میں داخل ہوتا ایک لڑکا عطر لگا دیتا، دوسرا تحفے
کے طور پر ایک پھول دے دیتا۔ سفید چاندنیوں پر آگے آگے
چھوٹے بچے، پھر بڑے لڑکے ان سے پیچھے بڑی عمر کے لوگ
بیٹھتے گئے اوپر گیلری میں عورتوں کا انتظام تھا دوسری جماعت
میں چند بچیاں بھی پڑھتی تھیں ذاکر صاحب کی بچی سعیدہ مہمان
عورتوں کو عطر لگا رہی تھیں۔ ہر طرف خوشبوئیں چل رہی تھیں
لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو کر اطمینان سے آئے تھے جوں ہی
گھڑی نے ٹن سے رات کے ساڑھے نو بجائے عبدالحی خاں نے
گرجتی ہوئی آوازمیں (کیونکہ لوگ خالی ہونے کی وجہ سے آپس میں
باتیں کر رہے تھے) کہا

"حضرات میں جناب خواجہ عبدالحئی صاحب ناظم دینیات سے درخواست کرتا ہوں کہ اس جلسے کی صدارت فرمائیں" عباس حسنی نے آہستہ سے تائید کی۔ قرآن شریف کی تلاوت کے ساتھ جلسہ شروع ہوا۔ جس وقت تقریریں ہوتیں لوگوں پر "گلاب" چھڑکا جاتا اور جس وقت نظمیں ہوتیں لوگوں پر پھولوں کی بارش ہوتی ملک عرب کے دو چھوٹے بچے اس وقت اسی مدرسہ میں پڑھتے تھے ان کے ساتھ دو اور بچوں کو شامل کرکے ان سب کو عربی لباس پہنایا گیا تھا وہی جُبّہ اور سر پر عُقال ان بچوں نے "طلع البدر علینا" کا ترانہ اونچی آواز میں گایا تھا تالیوں کی بجائے لوگوں نے "مرحبا" "واہ وا" خوش ہوکر کہا۔ تمام چہروں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پاک اور مقدس جگہ بیٹھے ہیں اور ہمارے دل خوشی سے بھرے ہوئے ہیں جسے صوفی لوگ دلوں کا نور سے معمور ہونا یا روحانی خوشی سے بھرا ہوتا کہتے ہیں آخر میں رنگین کاغذوں میں لپٹی ہوئی مٹھائی تقسیم کی گئی اس طرح لوگ خوشی خوشی گھروں کو لوٹے

دوسرے دن جماعت والوں سے انتظامی معاملات اور جلسہ کی کارروائی کی اچھائیاں اور کمزوریاں دونوں پہلوؤں پہ

مضمون لکھوایا گیا۔ اسلام اللہ کی تنقید پیام تعلیم والوں نے چھاپ بھی دی، ۱۹۳۲ء کے پیام تعلیم کا رکارڈ مکتبہ اور کتب خانہ دونوں جگہ نہیں مل رہا ہے ورنہ اِس تنقید کا ایک حصہ یہاں درج کر دیتا

میں نے اِس جلسے کے حالات قصداً تفصیل سے لکھے ہیں میں چاہتا ہوں ہر چیز کا ایک نمونہ درج ہو جائے اب آئندہ جلسوں کا ذکر ہوگا تو اس کی خاص خاص باتیں لکھ دوں گا تفصیل تم لوگ سمجھ گئے ہو

اگلے سال موگا سے واپس آکر عبدالواحد صاحب بھی میلادالنبی کے کاموں میں خاص دلچسپی لینے لگے اور دلچسپی کیوں نہ لیں موگا بھیجتے وقت اِن کے متعلق یہی خیال تھا کہ یہ واپس آکر بچوں کے لئے اسلامیات کی اچھی اچھی کتابیں لکھیں گے، مذہبی جلسوں میں خاص مدد دیں گے یہ اِسی کی کوشش کر رہے ہیں مذہبی باتیں سکھانے کا طریقہ مسٹر ہارپر سے خاص طور پر سیکھا ہے، چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے علاوہ بچوں کے لئے " اسلام کیسے شروع ہوا اور کیسے پھیلا " کے نام سے دو کتابیں لکھی ہیں " رسول پاک " کے عنوان سے ایسی کتاب لکھی ہے جس میں آنحضرتؐ کی سیرت پر

مواد زیادہ ہے۔ ایک اور کتاب میں بچّوں کو یہ سمجھایا ہے کہ قرآن پاک کیا ہے، کیسے اُترا، ہمارے رسول لوگوں کو قرآن کس طرح سمجھاتے تھے لوگوں پر اس کا اثر کس قسم کا ہوتا تھا وغیرہ

دوسرا کام بیت بازی اور مشاعرہ کا ہوا مقابلے میں ثانوی اوّل والے تھے۔ مدرسہ ابتدائی کے "بچّوں کی بیت بازی اور مشاعرہ" کا کام اور اس کا حال بہت دلچسپ ہے۔ یہ اگلے سال کی کہانی میں لکھوں گا ورنہ اس سال کی ضروری چیزیں رہ جائیں گی

یوم تاسیس پر حسب معمول "تعلیمی نمائش" ہوئی خاص بات یہ تھی کہ اِس دفعہ ابتدائی جماعتوں کے بچّوں کا کام نمایاں تھا کیونکہ یہ بچّے طرح طرح کے کاموں سے واقف ہوگئے تھے ان کے کاموں کے لیۓ ایک کی بجائے دو کمرے سجائے گئے تاسیس کے جلسہ میں عبدالسمیع متعلم ششم نے مدرسہ کی طرف سے رپوٹ سُنائی

تاسیس کے لیۓ ذاکر صاحب نے ایک چھوٹا سا ڈراما "دیانت" لکھ دیا تھا۔ ظالم بادشاہ غریبوں کو تنگ کرتا ہے، محل کا بوڑھا ملازم اور اس کا چھوٹا بیٹا "چُنّو" جنگل میں جھونپڑی ڈالے

لکڑیاں بیچتے پھرتے ہیں۔ بونوں کے بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوتا ہے وہ ایک چال چلتا ہے جس میں ظالم بادشاہ لالچ کے مارے پھنس جاتا ہے خدا کا کرنا دیکھو کہ عین موقع پر اسی ملک کا رحمدل بادشاہ جسے ظالم نے نکال دیا تھا پہنچتا ہے ظالم مقابلے میں ہار جاتا ہے چھنو اور اُس کے باپ کو دوبارہ محل میں جگہ مل جاتی ہے ذاکر صاحب کی باتوں میں غصہ، نرمی، مذاق، سنجیدگی، سبھی چیزیں پائی جاتی ہیں اس لئے کہانی ایسی سوچی ہے کہ اس میں یہ سب باتیں آجائیں ڈاکٹر صاحب کی زبان سے بھی یہ چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں اس لئے لکھنے میں بھی یہی رنگ ہے۔ پھوس کے دو تختے بنا کر بانسوں میں ڈھلوان لٹکا دو۔ جھونپڑی بن جائے گی لکڑہارے اور اُس کے بیٹے کا لباس مشکل نہیں ہے البتہ رحم دل بادشاہ کو اچھی سی اچکن پہنا دو اور ظالم جنگ کے سر پر بالوں والی گُپھے دار ٹوپی اور بڑی بڑی مونچھیں لگا دو بونوں کے لئے پہلی اور دوسری جماعت کے چند لڑکوں کے کُرتے لال کرکے ان کو پہنا دو سر پر کاغذ کی گاؤدُم لمبی سی ٹوپیاں پہنا دو ان کاغذوں پر لال پیلی دھاریاں بھی بنا دو لیجئے صاحب بونوں کی فوج تیار ہوگئی البتہ ان کا سردار

اونچی جماعت سے ہونا چاہیئے تاکہ سب کام دیکھ بھال کر کرے
چھوٹا سا ڈراما ہے اِس لئے جب جی چاہتا ہے لڑکے کھیل
لیتے ہیں

مدرسہ کی فضا پر پڑھنے پڑھانے کا ایک خاص رنگ چھا
گیا تھا۔ باغبانی، میلاد النبی، بیت بازی تعلیمی کھیلوں کے کام کو
جلسوں کے ذریعے "نمونتاً" لوگوں کے سامنے رکھا گیا تھا بنک کے
سالانہ دو جلسے ہو چکے تھے حاضرین نے بچّوں کے کاموں کی دل
کھول کر داد دی تھی۔ حوصلے بڑھ گئے بنک اور دُکان کا کاروبار
وسیع کرنے کا ارادہ پیدا ہو گیا۔ شلف خریدے گئے، کتابوں کی
خرید و فروخت کمیشن کی بجائے ملکیت پر شروع ہوئی، قاعدے
قانون بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی پانچ کی بجائے پندرہ
قاعدے بنے، پاس بُک کا دوسرا "مجلد ایڈیشن" شائع ہوا،
کچی رسیدوں کی بجائے "چیک بُک" تیار ہوئی، لڑکوں نے
چندہ جمع کرکے ایک رُکن کے حساب میں رقم جمع کی اور اِس
رُکن نے بچّوں کی طرف سے پہلا چیک شیخ الجامعہ صاحب کے
نام کاٹا۔ شیخ الجامعہ صاحب بنک میں خود ہی تشریف لائے ا
کھاتہ نویس کو چیک دیا اس نے چیک کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد

کھاتہ کھولا، یہ اطمینان کر لیا کہ جس رقم کا چک ہے اس سے زیادہ
کی رقم جمع ہے۔ پھر بنک کی مُہر لگا کر یہ چک خزانچی کو دے دیا۔
خزانچی نے نقدی کی کتاب میں اندراج کرنے کے بعد شیخ الجامعہ صاحب
سے چک کی پُشت پر دستخط کرنے کے لئے کہا۔ شیخ الجامعہ صاحب کے
پاس فاؤنٹین پین تو تھا نہیں اُنھوں نے ایک کونے میں رکھی ہوئی
دوات قلم لے کر دستخط کئے پھر دام لے لئے گویا چک کے ذریعے
لین دین کا "افتتاح" کی رسم منائی گئی ۳۰ اپریل کو بنک و دُکان
کا تیسرا سالانہ جلسہ ہوا مضامین پڑھے گئے نفع تقسیم ہوا۔ بنک
کے اَراکین اور جامعہ کے استادوں کو "عصرانہ" دیا گیا۔ اس
سال کی رپوٹ سُناتے وقت بنک کی تحویل ایک سو دس روپئے
چار آنے تین پائی تھی جس کا پچیس فی صدی کے حساب سے
تئیس روپئے تین آنے نفع دیا گیا

عثمانیہ کلب پانی پت کے انتظام میں ہر سال دسویں جماعت
تک کے طلبا ء کا تقریری مقابلہ ہوتا ہے اس مقابلے میں زیادہ تر
نویں اور دسویں جماعت کے لڑکے حصہ لیتے ہیں لیکن ۱۹۳۱ء
میں ہمارے ہاں کے پانچویں جماعت کے دو لڑکے محمد نور خاں
نے اوّل اور رحیم الدین خاں نے تیسرا انعام حاصل کیا تھا۔ یہ لڑکے
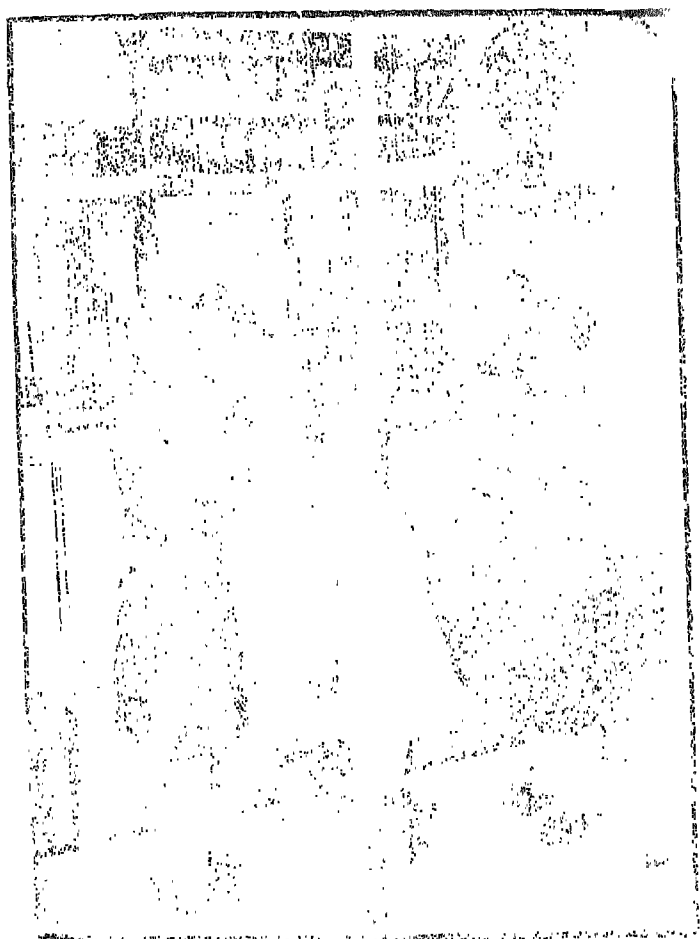
کاروبار جاری ہے

ششم میں آ گئے تھے اگر ہم چاہتے تو ان ہی لڑکوں کو اس سال
کے مقابلے کے لئے بھیج سکتے تھے لیکن ہمارا پہلا مقصد انعام
حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ نئے نئے لڑکوں کی ہمت بڑھانا
تھا اس لئے اب کی دفعہ عبدالناصر اور اسلام اللہ
بھیجے گئے (جو ششم میں پڑھ رہے تھے، انھوں نے
صرف انعامات ہی حاصل نہیں کئے بلکہ بحیثیت مجموعی
اپنے مدرسے کو اوّل رکھنے کا "کپ" حاصل کیا۔
یہ کام محمد حفیظ الدین صاحب کی نگرانی میں ہوا تھا، آپ
اس وقت تک اردو اکادمی میں کام کر رہے تھے لیکن مدرسہ کی
دلچسپیوں کو غور سے دیکھ رہے تھے اور یہاں کی آزاد اور پرمسرت
فضا کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے میں بھی اس تاک میں تھا کہ موقع
لگے تو انھیں حاصل کر لوں۔ بالآخر مدرسہ ابتدائی کو ایک ایسا شخص
مل گیا جس کی بول چال اور "آزاد پسند طبیعت" کا اثر بچّوں پر
پڑنے لگا۔ حفیظ صاحب کی یہ عادت ہے کہ چاہے وہ اپنے
ساتھیوں سے لڑ لیں لیکن بچّوں کے دلوں میں سب استادوں
کی عزّت کا خیال دلاتے ہیں۔ لڑکوں کی حمایت اس طرح کرتے
ہیں کہ وہ دوسروں کو بھلی معلوم دیتی ہے آپ کی خوش طبعی

سے لڑکے فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ بے تکلفی کے اوقات میں لڑکے
اور اُستاد دونوں کو محظوظ کرتے ہیں ۔ باتوں باتوں میں سب کچھ
کہہ دیتے ہیں ۔ مولانا ابوالکلام کی تحریر و تقریر کے مدّاح ہیں
طبیعت موزوں ہو، خوش ہوں تو مولانا کا رنگ غالب آجاتا
ہے ۔ جلسوں کی ٹیپ ٹاپ ، ملنے جلنے ، بات چیت کرنے کے
آداب سے خوب واقف ہیں

اس سال ایک اور نئے اُستاد سید مجتبیٰ حسین صاحب زیدی
کا اضافہ ہوا ۔ آپ میٹرک کامیاب ہیں ۔ اس جگہ کے لئے کتنے ہی
بی ۔ اے اور ایم ۔ اے کامیاب آئے لیکن کسی کا کام میری
نظر میں جچا نہیں ۔ بعض دفعہ تنگ آکر ذاکر صاحب کہا کرتے کہ
"آپ کے نزدیک کام کا جو معیار ہے وہ تو رفتہ رفتہ نظر
آئے گا ۔ میں آخر کام کے لوگ کہاں سے لاؤں ؟" یہ دشواری
یوں پیش آتی ہے کہ پڑھتے وقت بہت سے لوگ یہ خیال
کرتے ہیں کہ جہاں اچھی نوکری ملے گی کر لیں گے اگر نوکری کرنی
ہے تو یہ نہیں سوچتے کہ میں بھی کسی جگہ کے لئے تیاری کر رہا ہوں
یا نہیں کسی درسگاہ سے سند کا حاصل کر لینا کافی نہیں ہے ۔ ہاتھ
پیر ہلانے ، سوچنے ، سمجھنے سے کام آگے بڑھتے ہیں مجھے اس

شعبہ دینیات کے ناظم بھی ہیں بڑوں کے لئے تفسیر اور بچوں کے لئے سیرت کی کتابیں لکھی ہیں

اب مہمانوں کا حال سُنو۔ اس سال کے مہمانوں میں ہندوستان کے لوگوں میں سے ڈاکٹر محمدؐ اقبال، راج گوپال آچاری، عبداللہ یوسف علی، سیّد سلیمان ندوی ہیں۔ سلیمان صاحب نے اُردو اکادمی کے جلسے میں "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم" کے عنوان سے اپنا مقالہ (مضمون) سُنایا اور ڈاکٹر محمدؐ اقبال نے انجمن اتحاد کے انتظام میں اپنے یورپ کے سفر کے حالات سُنائے اسپین میں مسلمانوں کے مشہور مشہور لوگوں کی بہت سی چیزیں ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کو ان چیزوں سے دلچسپی ہے اس لئے اسپین کے حالات آپ نے تفصیل اور دلچسپی کے ساتھ سُنائے۔ انجمن والوں نے آپ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا اور انجمن کا اعزازی رُکن بنالیا۔ ڈاکٹر صاحب نے خوشی سے قبول کیا

ہندوستان کے باہر کے لوگوں میں سے حُسین رؤف بے بیرن عُمر ایرن ظلنتہ ڈاکٹر کپ نس خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ حسین رؤف بے کو تو دنیا کے لوگ جانتے ہیں یہ ٹرکی کے ایسے ہی بڑے آدمی ہیں جیسے ہمارے یہاں

گاندھی جی، مولانا محمد علی وغیرہ۔ کمال پاشا۔ انور پاشا۔ کی طرح انھوں نے
بھی تکلیفیں اٹھائیں اپنے ملک کے لئے لڑتے رہے اور وزیر اعظم
بنے۔ گیارہ برس کی عمر تک تمھاری طرح پڑھتے رہے لیکن بارھویں
سال فوجی مدرسے میں داخل ہوگئے اور جہاز چلانا سیکھتے رہے
کمال بے اٹھارہ برس کی عمر میں حکومت نے سمندری افسر
مقرر کر دیا اس طرح آپ کو ہمت کے ساتھ کام کرنے کا اور بھی
موقع مل گیا جب پانی کے نیچے نیچے چلنے والی کشتیوں کا رواج
ہوا جیسے آبدوز کشتی کہتے ہیں تو حکومت نے آپ کو امریکہ
بھیجا کہ وہاں جا کر ان کا پورا پورا حال معلوم کریں۔ امریکہ سے
واپسی پر ایک مشہور جہاز حمیدیہ کے کپتان مقرر ہوگئے۔ ۱۹۱۵ء
کی پہلی جنگ عظیم میں یونان کے پاس بڑے بڑے جنگی جہاز بے شمار
تھے لیکن رؤف بے کی سرداری میں حمیدیہ جہاز نے ان کو
وہ وہ چکمے دئے اس طرح تنگ کیا کہ لوگ انھیں جادوگر
سمجھنے لگے یونان کے سات جنگی جہازوں کو سمندر میں ڈبو دیا
بہت سے جہازوں میں آگ لگا دی، یونانی کھسیانے ہو ہو کر
حمیدیہ کا پیچھا کرتے تھے مگر رؤف بے ہر دفعہ صاف نکل
جاتے تھے

رؤف بے صرف لڑنے والے ہی نہیں تھے بلکہ انصاف
پسندی - امن پسندی اور بیچ بچاؤ کرانے میں بھی آگے آگے
رہتے تھے - روس اور کوہ قاف کی ریاستوں سے ترکی کی
دوستی کرانے کے لئے آپ نے خاص حصہ لیا تھا
ترکی میں جب نئی طرح کی حکومت قائم ہوئی تو پہلے صدر
آپ ہی بنائے گئے اس کے بعد آپ سب سے بڑے وزیر
بھی ہوئے - مگر تم جانو سلطنت کے جھگڑے چلتے رہتے ہیں،
مصطفےٰ کمال پاشا سے اَن بن ہوگئی ترکی والے آپ کو بہت
چاہتے تھے آپ چاہتے تو اپنی پارٹی بناکر کمال پاشا کے مقابلے
میں لڑتے مگر سمجھ دار لوگ پہلے سے یہ دیکھ لیا کرتے ہیں کہ اس کا
اثر لوگوں پر کیا پڑے گا - پھر آپس کی پھوٹ سے دشمنوں کو موقع
مل جاتا ہے کہ وہ چاہے جیسی کاروائیاں کریں آپ نے سوچا
کہ اپنے علٰحدہ ہونے کے باوجود ملک کی ترقی کا کام چل سکتا ہے
تو جھگڑوں سے بچنے کے لئے خود ہی الگ ہوگئے - معمولی زندگی
بسر کرنے لگے - پچھلی باتوں کا غم نہ کیا کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا
رنج کرنے سے کیا فائدہ !! ہر وقت ہشاش بشاش اور خوش
رہنے لگے

نیک اور سمجھدار آدمی کا دل بھی بڑا ہوتا ہے خفگی کے
باوجود کمال پاشا کی بُرائی لوگوں کے سامنے نہ کی کیونکہ وہ
اپنے ہی آدمی تھے بلکہ لوگوں نے کمال پاشا کے بارے میں
کچھ پوچھا بھی تو ان کی اچھی باتوں کو بیان کرتے رہے

ڈاکٹر انصاری جب بلقان کی لڑائی میں زخمیوں کی
مرہم پٹی کے لیئے وہاں تشریف لے گئے تھے تو رؤف بے
سے دوستی ہوگئی۔ آپ نے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ ہندوستان
بھی آئیں گے جب انھیں فرصت ملی تو جامعہ کی طرف سے
ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر جامعہ میں آئے اور ترکی کے
حالات چار دن تک لوگوں کو سُناتے رہے

محمد حفیظ الدین صاحب کی نگرانی میں ثانوی اور کُلیہ
کے لڑکوں نے چاروں جلسوں کا انتظام کیا تھا ٹکٹوں کی
پابندی کے باوجود ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی رؤف بے
نے تُرکی کی تاریخ اس طرح بیان کی گویا وہ واقعات لوگوں کے
سامنے پیش آ رہے ہیں یا ان واقعات کو لوگ دیکھ رہے
ہیں ایسا کیوں نہ ہوتا بہت سے واقعات میں رؤف بے
خود ہی شریک تھے دیکھی اور سُنی ہوئی باتوں کے بیان

میں ایسا ہی فرق ہوتا ہے
اور سب لوگ تو تقریریں سُنتے رہے لیکن حفیظ صاحب اور ان کے رضا کار یہ دیکھتے رہے کہ جلسہ میں کسی قسم کی گڑ بڑ نہ ہونے پائے اور سب انتظام ٹھیک ٹھاک رہے ان لوگوں نے محنت کی تب جا کر تو رؤف بے کا شایان شان استقبال ہوا، رؤف بے نے بھی خیال کیا ہوگا کہ جامعہ کے لڑکے انتظام میں ترکی کے لڑکوں سے پیچھے نہیں ہیں

اس سال کی ایک رنج کی خبر بھی ہے - حافظ فیاض احمد صاحب (مسجد جامعہ) کے چھوٹے بیٹے مزمل احمد (جامعہ کے طالب علم) اللہ کے پیارے ہوئے - مزمل کو دستی کام کا شوق تھا حافظ صاحب کی یہ خواہش تھی کہ میٹرک تک تعلیم دلانے کے بعد حرفہ کے کالج میں داخل کرا دیں مگر خدا کے چاہے بغیر ہمارے کام تکمیل کو نہیں پہنچتے ہیں - دیندار لوگ ہر حال میں خوش رہتے ہیں

اس سال عید کے موقع پر میں بیمار تھا میری جگہ مدرسہ کی نگرانی کا کام سید احمد علی صاحب کر رہے تھے - آپ بھی جامعہ کے سابق طالب علم ہیں علی گڑھ میں جب یہ کھانے کے مانیٹر تھے تو عین اُس وقت جب کہ شوربہ اور دال ختم ہونے والی ہو

یہ زور سے آواز لگاتے (NO EXTRA) مطلب یہ کہ شوربہ اور دال اب نہیں مل سکتی۔ لڑکے انداز دیکھ کر پہلے ہی سے کہہ دیتے بس اب آواز لگنے والی ہے۔ لڑکوں کو کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھتے ہیں کا پیاں بہت توجہ سے دیکھتے ہیں۔ "کام" کے ذریعہ لکھنے پڑھنے کا کام لینے میں آپ کو ملکہ ہے

عید کے دن ڈراما کرانے کی روایت کو قائم رکھنے کے لئے سیّد نورشاہ صاحب نے پرانا ڈراما "اسکول کی زندگی" کرایا مدرسہ میں کوئی خاص بات ہو تو بیماری کی حالت میں بھی مجھ سے رہا نہیں جاتا ہے اور کچھ نہیں تو تماشائی کی حیثیت سے شریک ہو جاتا ہوں اس زمانہ میں جامعہ کے پاس موٹر تو تھی نہیں دو بڑے لڑکوں کے سہارے تانگے میں بیٹھ تماشہ دیکھنے کے لئے آیا یہ پہلا موقع تھا کہ میرا لکھا ہوا ڈراما کوئی اور کرا رہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں۔ اس سے پہلے بچّوں کے جتنے بھی ڈرامے ہوئے ان سب میں پردے کے اندر رہ کر انتظام کرنا پڑتا تھا ایک کو ہٹا کر دوسرے منظر کو لگوانا۔ اگلے کی تیاری کرنا اس بات کا خیال رکھنا کہ لُقمہ دینے والا ہوشیاری کے ساتھ کام کر رہا ہے لڑکوں پر نگاہ رکھنا کہ وہ اپنا لباس تبدیل کر رہے ہیں یا نہیں

اداکاروں کی طرف اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ اونچی آواز
سے بول رہے ہیں یا نیچی آواز سے کھڑے ہوتے میں غلطی
تو نہیں کرتے ہیں۔ مدرسہ کے جو اُستاد تماشہ دیکھ رہے ہیں
ان کے پیغامات سُننا کہ فلاں بات کا خیال رکھیے۔ فلاں
اداکار سے یہ کہیے وہ کہیے وغیرہ۔ ضرورت کے وقت کام
کرنے والوں کو ڈانٹنا ڈپٹنا۔ بعض دفعہ اس بات کا خیال
ہی نہیں رہتا تھا کہ میں اختر صاحب کو ڈانٹ رہا ہوں یا کسی
لڑکے کو ۔ سچ تو یہ ہے کہ لڑکے استاد کوئی بھی ایسے موقعوں
پر میری بات کا بُرا نہ مانتے تھے کیونکہ سب جانتے تھے کہ اس وقت
ٹھیک سے کام نہ کیا تو تماشائی شور کریں گے کہ آخر یہ پردے
کے اندر کیا گڑبڑ ہو رہی ہے —— آج کا ڈراما دیکھنے
میں بھی ان باتوں کا خیال رہتا تھا کہ اندر کوئی گڑبڑ نہ ہونے
پائے بعض دفعہ جی چاہتا کہ اُٹھ کر اندر جاؤں مگر بیماری
کہتی تھی کہ بس چپ چاپ لیٹ کر تماشا دیکھتے رہو۔ لمبی میز
پر تکیہ لگائے سب لوگوں کے پیچھے لیٹا ہوا تھا۔ ممکن ہے
بعض مہمان خیال کرتے ہوں کہ عجیب قماش کے آدمی ہیں
بیٹھا تو جاتا نہیں اور تماشا دیکھنے چلے آتے ہیں۔ اس "آپ بیتی"

میں دوسری دفعہ بیماری کا ذکر آیا ہے۔ پہلی بیماری میں ایک چھوٹا موٹا کام کیا تھا جو تم پڑھ چکے ہو اب یہ دیکھو کہ اس میں میں نے کیا کیا ہے۔ لیکن پہلے یہ بتا دوں کہ میری حالت کیا ہو گئی تھی

کچھ عرصے سے ناف کے نیچے ہلکا اور میٹھا درد کبھی کبھی ہو جایا کرتا تھا ایک دن جب کچھ بخار بھی تھا کھانے کے چند گھنٹے بعد ابکائی آئی اور دائیں کولھے سے اوپر پیٹ میں درد ہونے لگا۔ تکلیف بڑھتی گئی دہلی کے مشہور چیر پھاڑ کے ڈاکٹر جوشی ہماری اقامت گاہ کے قریب ہی رہتے تھے وہ آئے۔ خاص طور پر پیٹ کے دائیں حصے کو انگلیوں سے دبا کر دیکھا۔ کہنے لگے "اپنڈے سائٹسٹ" (زائد آنت کا پھول جانا) کا مرض ہے کوئی ثقیل چیز آنت کے اس حصے میں پھنس گئی تھی۔ اس نے ورم پیدا کر دیا ہے"۔ کھانے پینے کی سخت ممانعت کر دی گئی۔ صرف پانی جیسی چیزیں مثلاً دودھ پھلوں کا رس پینے کی اجازت تھی کیونکہ آنت کے اس حصے میں جو بھی ٹھوس چیز جاتی رک جاتی لیکن یہ حملہ اتنے زور کا تھا کہ دودھ بھی الٹے نکل آتا تھا میں بہت کمزور

ہوگیا تھا۔ چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی۔ ڈاکٹر جوشی نے کہا
ایسی حالت میں آپریشن ٹھیک نہ رہے گا پہلے دوا کے ذریعہ
علاج جاری رکھا جائے، دوا کے علاج میں ہمارے امیر جامعہ
ڈاکٹر انصاری کے مقابلے میں اور کون تجربہ کار تھا آپ اپنا
ہینڈ بیگ لے کر آئے پہلے اقامت گاہ کا چکر لگایا لڑکوں سے
باتیں کیں پھر ذاکر صاحب کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے
میرے کمرے میں داخل ہوئے میں اُٹھ تو سکتا نہیں تھا
بس ہاتھ سے سلام کر لیا ایک بہت بڑے حکیم ماہر کو دیکھ کر
مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اب میری تکلیف دور ہو جائے گی،
ڈاکٹر صاحب اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے
" اپنے بچپن سے لے کر اس وقت تک پیٹ کی تکلیف کے
بارے میں جو باتیں بھی یاد ہوں وہ بتائیے" میں سُناتا گیا
یہ سُنتے گئے۔ بیچ بیچ میں ٹوک کر کچھ اور بھی پوچھ لیتے تھے
آخر میں کہنے لگے " تو یہ قصہ ہے" پھر کان کے آلے سے سینہ
اور پیٹھ کا دیر تک معائنہ کیا۔ لمبی لمبی سانسیں لوائیں ایک
دو، تین۔ ایک، دو، تین کئی دفعہ کہلوایا ان آوازوں سے
اس آلے کے ذریعے کچھ اور بھید معلوم کرتے تھے۔ بیچ بیچ

میں ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہوکر انگریزی میں کچھ کہتے بھی
جاتے تھے۔ غالباً عادتاً وہ ایسا کرتے تھے کیونکہ معائنہ کے وقت
ہمیشہ کوئی نہ کوئی اور ڈاکٹر ان کے ساتھ رہتا ہے اور وہ
مریض کا حال ساتھ ہی ساتھ اس ڈاکٹر کو سمجھاتے جاتے ہیں
کوئی آدھے گھنٹے سے زیادہ دیکھتے اور پوچھتے ہی رہے مجھے
ایسا معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے ٹھان لی ہے کہ وہ اس مرض
کو بھگا کر رہیں گے۔ پہلے تو میرے چہرے پر اُداسی تھی مگر اب
خوشی ہونے لگی۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "بس جناب اب آپ
ٹھیک ہوگئے" انصاری صاحب کہنے لگے "ٹھیک کہاں سے
ہوگئے! ڈاکٹر جوشی کے منع کرنے کے باوجود آپ نے پرسوں
جو کھچڑی کھائی تھی وہ ابھی کہاں نکلی ہے!!" میں نے کہا
ڈاکٹر صاحب یہ تو پرسوں کا واقعہ ہے" کہنے لگے "اس کھچڑی
کی رفتار بہت سست ہے!" جو لوگ آس پاس اس لئے
کھڑے تھے کہ ایک نازک مریض کا معائنہ ہو رہا ہے سب
کے سب ہنس پڑے اگر اکبر صاحب ہوتے تو قہقہہ لگا کر
کہتے "لاؤ یار ایک سگرٹ نکالو" مس فلپبورن صاحبہ
کبھی تو مسکرا دیتیں لیکن پھر کسی گہرے سوچ میں پڑ جاتیں

ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھنا شروع کیا ساتھ ہی ساتھ "آپا جان" کو سمجھاتے جاتے تھے کہ یہ یہ دوا تو کیپسول میں بند ملے گی اسے حلق میں رکھ کر پانی کے گھونٹ کے ساتھ نگل لیں اور اِس دوا کو ڈبے سمیت پانی میں گرم کرنے کے بعد اِسے کپڑے پر لگائیں اور وہ پٹی درد کی جگہ رکھ کر بہت سی روئی رکھنے کے بعد اُس پر ایک کپڑا لپیٹ دیں پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کھانے میں ایسی چیزیں لکھواؤں گا جو کھچڑی سے کہیں بہتر ہیں۔ پھر آپا جان سے مخاطب ہو کر کہا لکھئے جناب صبح کے وقت تو ڈیڑھ پاؤ دودھ اِس میں ایک انڈے کی زردی لیکن انڈے کی زردی اُس وقت ڈالی جائے جب درد میں کمی ہو ورنہ صرف دودھ رہنے گا۔ پھر دس بجے کے قریب گوشت، ہڈی یا سبزی یا چوزے کی یخنی۔ خدا آپ کا بھلا کرے دوپہر میں دودھ اور جو کا آٹا سفوف ملا کر پکا لیں پھر شکر ڈال کر کھیر کی طرح کھائیں مجھ سے کہنے لگے کیوں ہے نا مزیدار ——— اچھا صاحب پھر لکھیے عصر کے وقت پھلوں کا رس۔ لکھتے وقت "آپا جان" میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھیں کیونکہ مزیدار چیزیں لکھائی جا رہی تھیں "پھر" ڈاکٹر صاحب نے

کہا "رات میں" کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر کہنے لگے "بس دُودھ پی لیں کافی ہے اگر محض دُودھ اچھا نہ معلوم ہو تو اولٹین ملا لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے چوبیس گھنٹوں میں چھ وقت کچھ نہ کچھ پینے کے لئے کہا تھا ایک وقت کی چیزیں بھولتا ہوں پھر اپنے سامان کو تھیلے میں بند کرنے کے بعد نہایت اطمینان سے فرمانے لگے ——— اب رہی احتیاط کی باتیں آپ کو مکمل آرام کرنا چاہیئے اُٹھتے وقت پیٹ پر زور دے کر نہ اُٹھیئے بلکہ تیمار دار سے کہیئے کہ وہ اُٹھا دے وہ بھی صرف حاجت کے وقت اس طرح کچھ عرصہ کھانے پینے اُٹھنے بیٹھنے میں احتیاط کی تو آپ میں طاقت آجائے گی چلنے پھرنے لگیں گے پھر کسی وقت ڈاکٹر جوشی کے پاس جا کر اس زائد آنت کو کٹوا لیجیئے۔ ولایت میں تو اس آنت کے نکلوانے کا رواج ہو گیا ہے تندرست لوگ جب موقع دیکھتے ہیں نکلوا لیتے ہیں۔ چند دنوں تک ٹانکے رہیں گے پھر کھول دئے جائیں گے آپریشن کے بعد زیادہ سے زیادہ تین ہفتے آرام کرنا ہو گا یہ سب باتیں وہ مزے لے لے کر کر رہے تھے گویا اس زائد آنت کا نکلوا لینا معمولی بات ہے

میری حالت میں پہلے سے افاقہ ضرور تھا مگر چلنے پھرنے کی طاقت نہیں تھی ابھی ایک عرصہ تک آرام کرنے کی ضرورت تھی مدرسہ کا اِس سال کا پروگرام پچھلے سال کے آخر میں طے ہو گیا تھا جس میں یہ چیز بھی شامل تھی کہ ابتدائی مدرسوں کے لڑکوں کی تحریر و تقریر کا مقابلہ سال میں ایک دفعہ کرایا جائے گا اوّل، دوم، سوم آنے والے لڑکوں کو تمغے دینے کے علاوہ بحیثیت مجموعی جس مدرسے کے نمبر زیادہ ہوں گے لئے چاندی کی "ٹرافی" (کوئی ایک خوبصورت چیز) دی جائے گی چونکہ مولانا محمد علی کی تحریر و تقریر بہت پائے کی تھی اس لئے اِس کا نام "محمد علی ٹرافی" رکھا جائے گا لیکن یہ محض خیال ہی خیال تھا اِسے عمل میں لانے کے لئے ایک ایک کام کرنا تھا۔ قواعد و ضوابط بنانا چھپوانا، پہلا موقع ہونے کی وجہ سے مدرسوں میں جاکر لوگوں کو سمجھانا، راضی کرنا، چندہ جمع کرنا، چاندی کی ٹرافی بنوانا، تمغے بنوانا پھر آخر میں بڑے پیمانے پر جلسہ کرنے کے لئے وہ سب کچھ کرنا تھا جیسا کہ میلاد النبی کے وقت ہوتا ہے مجھے یہ خیال آتا تھا کہ جلسے کا کام تو مدرسے والے کریں گے لیکن کسی چیز کو قائم کرنے کے لئے جو جو ابتدائی کام کرنے پڑتے ہیں

وہ تو میرے ذہن میں ہیں یہ ایک ایک کرکے لوگوں کو سمجھانے ہوں گے اور انھیں کرانا ہوگا۔ یہ کام تندرست ہونے کے بعد تیئے سال سے ہو سکتا تھا (کیونکہ ابھی اس کی بنیاد ہی نہیں پڑی تھی) مگر یہ خیال زوروں کے ساتھ آتا تھا کہ "جب ایک چیز اس سال کے لئے طے ہو گئی ہے تو وہ اسی سال کیوں نہ ہو اگر کوئی شخص بیمار پڑ جائے یا مرجائے تو کیا دنیا کے کاروبار بند ہو جائیں گے! آخر وہ کون سی مصیبتیں ہیں جن کی وجہ سے کاموں میں رکاوٹ ہو گی کیا ہم ان مصیبتوں پر قابو نہیں پا سکتے ہیں! میں نے جماعت میں لڑکوں کو سمجھایا تھا کہ اس پروگرام کی ایک ایک چیز اٹل ہے یہ تو ہو کر رہے گا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے ایک سال کا مکمل پروگرام بنایا ہے۔ کیا بسم اللہ ہی غلط ہو گی!" غرض کہ طرح طرح کے خیالات دل میں آتے تھے۔ بیماری کے زمانے میں اس قسم کے خیالات پیچ و تاب کی باتیں دماغ کو اور بھی گرم کئے دیتی ہیں میں ذرا ٹھنڈے ہونے کے لئے کروٹ بدل لیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کھانے کا تو نہیں البتہ پینے کا پروگرام ہی ایسا بنا دیا تھا کہ ہر تھوڑی دیر میں کوئی چیز پینے کے لئے مل جاتی تھی اس سے خیالات

میں کچھ سکون ہو جاتا تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی کیفیت پیدا
ہو جاتی تھی اس موقع پر خیال آیا کہ زیادہ سوچنا بیکار ہے۔ محض
سوچنے سے اِس کا حل نہیں ہوگا جو کرنا ہے شروع کر دینا چاہئیے
یہ کام اُن لوگوں سے لیا جو میرے خیالات سے واقف تھے
ان میں زیادہ تر ایسے ساتھی تھے کہ اگر کسی وجہ سے وہ انکار
کریں تو میں ڈانٹ ڈپٹ کر سکتا تھا خوشامد کر سکتا تھا سب سے
پہلے برکت علی صاحب کو بُلوایا اِن کے سامنے زیادہ باتیں
کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس "ہاں" کہلوا لینا چاہئیے پھر تو
کام تیار ہے میں نے اِن سے درخواست کی کہ آپ اور کچھ
نہ کیجئے بس "محمد علی ٹرانی" کے قواعد وضوابط بنا دیجئے اِس
سلسلہ میں جو باتیں میں چاہتا تھا وہ بتلا دیں یہ تیسرے دن
مسودہ لے کر آئے، شکریہ کے ساتھ رکھ لیا۔ عبدالواحد صاحب
اُن دنوں کسی کام سے موگا سے چھٹی لے کر آئے ہوئے تھے انھیں
بُلوا کر کہا "خدا کے بندے کبھی کبھی تو پُوچھ لیا کرو کہ کوئی
کام وام تو نہیں ہے"!! یہ کہنے لگے "ہاں ہاں بتلائیے میں نے
کب انکار کیا ہے" جھٹ قواعد وضوابط کا مسودہ دے دیا
یہ پڑھ کر خوش ہوئے اور لمبے لمبے ہاتھ کر کے کہنے لگے۔

"بس منٹوں میں چھپوا دوں گا" کوئی ایک ہفتہ میں سب چیزیں
چھپ کر آگئیں مجتبیٰ صاحب نئے نئے اُستاد ہوئے تھے میں اِن سے
زیادہ سے زیادہ کام لینا چاہتا تھا کہ اِن کا شمار بھی محنتی
اُستادوں میں ہو جائے اور یہ جان جائیں کہ اس مدرسہ
میں کام پیارا ہے انھیں سائکل چلانے کا بہت شوق ہے" ریلے
سائکل" کی بہت قدر کرتے ہیں میں نے اِن سے کہا کہ آپ
دہلی کے تمام مدارس کا چکر لگا کر یہ قواعد وضوابط تقسیم کیجئے
اور مدرسے والوں کو راضی کر لیجئے لیکن پہلی دفعہ "ہاں" یا
"نہ" کا جواب نہ لیجئے بلکہ یہ کام دوسرے یا تیسرے چکر میں
کیجئے یہ بات کو جلدی سمجھ لیتے ہیں کہنے لگے "آپ بے فکر رہئے"
پھر اختر صاحب اور عبدالحئیٔ صاحب کی باری آئی کوئی کام
شروع نہ ہوا ہو تب تو اختر صاحب کو اُکسانے کی ضرورت
رہتی ہے ورنہ کام ہوتا ہوا دیکھ کر یہ خود ہی شریک ہو جاتے
ہیں اتنا کام ہو جانے کے بعد انھیں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں
پڑی یہ ڈاکر صاحب کے پاس گئے اور ٹرافی کے لئے دہلی
کی جامع مسجد کا نمونہ طے کر لیا عبدالحئیٔ صاحب نے پہلے سے
کہہ دیا تھا کہ جو کام دیا جائے گا وہ کرنے کے لئے تیار رہیں اُنھوں نے

محمد علی تراقی
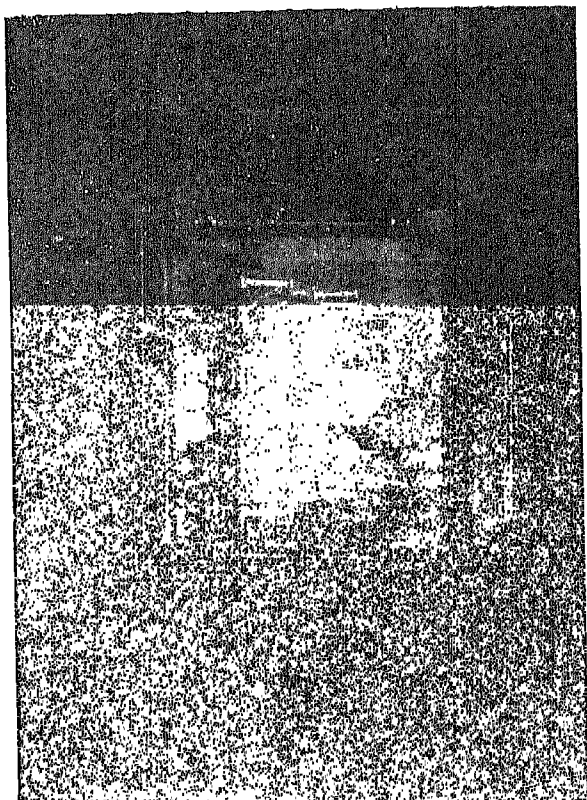
اپنی نگرانی میں چاندی کی خوبصورت جامع مسجد اور تمغے بنوائے
مسجد کے تینوں گنبدوں پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے اس سے
اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا ہے ان تمام کاموں کے لئے
نصف رقم تو جامعہ نے دی باقی نصف اُستادوں اور لڑکوں
نے مل کر چندہ کیا تھا چندہ کا یہ کام بھی مجتبیٰ صاحب ہی کے
سپرد تھا احمد علی صاحب جو سیری جگہ مدرسہ کی نگرانی کر رہے
تھے جلسہ کے انتظام میں مصروف رہے جب میں نے حفیظ صاحب
سے خواہش ظاہر کی کہ وہ بچوّں کو تقریریں سکھانے کا کام
اپنے ذمہ لیں تو فرمانے لگے
"بچوّں کی تقریریں !! پھلجھڑیوں کی کمی نہیں، بس
آگ دکھائی اور پھول برسنے لگے"۔ میں نے کہا مجھے آپ زیادہ
نہ ہنسائیے۔ پیٹ کی بیماری ہے اس میں بل تو پہلے سے پڑے ہوئے ہیں۔
لڑکے میرے پاس آ آ کر بتاتے تھے کہ کام کتنا ہوا ہے
اور آج کل کیا ہو رہا ہے
اب اور تفصیل کیا لکھوں بات لمبی ہوئی جا رہی ہے
غرض محمد علی ٹرانی کا پہلا جلسہ بڑی دھوم دھام سے دو دن تک
ہوتا رہا آخر میں مسٹر آصف علی نے انعامات تقسیم کئے میں بھی

بہرحال وقت جلسہ تک پہنچا اور ہال کے بازو کے کمرے میں
چارپائی پر لیٹ گیا اسٹیج پر کام کرنے والے دروازے سے
دکھائی دے رہے تھے یہی کافی تھا نتیجہ مرتب کرتے وقت
لوگ خالی تھے اِن کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیئے چند لڑکوں سے
نظمیں پڑھوائی گئی تھیں اِن میں سے احمد بن سالم ابتدائی پنجم
نے خوش الحانی کے ساتھ ایک نظم کے ایک ایک لفظ کو اِس طرح
گا کر سُنایا کہ سُننے والوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا نتیجہ مرتب کرنے
والوں کی گڑبڑ بند ہوگئی - ثمر میرٹھی کی یہ نظم رسالوں میں
تازہ تازہ چھپی تھی اس نظم کا ایک ایک لفظ پُکار پُکار کر مجھے
متوجہ کر رہا تھا کہ اِس بیماری کے زمانہ میں تو نے جو کچھ کیا
ہے میں اس کا آئینہ ہوں- ایسا کہنے سے اپنی تعریف کا پہلو
ضرورت سے زیادہ نکل آتا ہے مگر "آپ بیتی" سُنا رہا ہوں
میرے کاموں کا جو اثر خود مجھ پر پڑا ہے اگر انھیں چھوڑتا
جاؤں تو یہ کہانی بے جان ہو جائے گی میں دکھا یہی رہا ہوں
کہ آدمی سیکھتا کس طرح ہے یہ اللہ میاں کے قانون کی خوبی
ہے کہ ایک کام کے اثرات اسے نئے کاموں کے لیئے سوچنے
اصلاح کرنے آگے بڑھنے کا کام دیتے ہیں - خیر میں اب

کہانی کی طرف آتا ہوں۔ عید کا زمانہ قریب تھا شفیق صاحب نے اِس نظم کو جامعہ کی طرف سے چھپوا کر عید کے تحفے کے طور پر تمام لڑکوں اور جامعہ کے ہمدردوں میں تقسیم کروایا۔ اِس نظم کا نام رکھا ہے "پیغامِ عمل"۔ میری بیماری کی کہانی تھوڑی سی اور رہ گئی ہے اس کے بعد یہ نظم سناؤں گا تم بے چین تو ضرور ہوگے مگر بات مان جاؤ یہ چند ورق بھی روکھے پھیکے نہیں ہیں تمہاری دلچسپی کا اندازہ رکھ کر ہی لکھ رہا ہوں

—— ہاں صاحب تو بیماری کا اگلا حال یوں ہے کہ

ڈاکٹروں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ اچھا ہونے میں ابھی دیر ہے انتظام اور سہولت کی خاطر مجھ "بشیر منزل" سے طبیہ کالج منتقل کر دیا گیا اِس اقامت گاہ میں مِس فلپسبورن صاحبہ اور محمد حسین صاحب حیدر آبادی نے جس محبت کے ساتھ میری تیمارداری کی مَیں اِسے کبھی نہ بھولوں گا "آپا جان" ہر چند گھنٹے کے بعد اپنے ہاتھ سے چیزوں کو تیار کر کے کھلاتی پلاتی تھیں۔ حافظ صاحب نے بھی روپئے پیسے دینے میں کمی نہ کی۔ پانی جیسی چیزیں پیتے پیتے کئی مہینے ہوگئے تھے نمکین چیز اور کھچڑی کو جی ترستا تھا کبھی کبھی "آپا جان"

سے کہتا کہ کھچڑی کھلا دیجئے یہ زور سے چلاتیں "نانی! نانی!
ہرگز نہیں —— کبھی نہیں" مجھ سے کہتیں "ضدی بچہ" میں بھی
کہتا "ضدی بہن" کئی مہینے گزرنے کے بعد کھچڑی کو جی چاہتا
ہی ہے اس میں ضد کی کیا بات ہے!

طبیہ کالج میں ڈاکٹر شرما صاحب سے واسطہ پڑا ان کی
طبیعت اور ڈاکٹروں سے بالکل مختلف ہے کہنے لگے "فکر مت
کیجئے، میں آپ کو سب چیزیں کھلاؤں گا مگر ابتدا کھچڑی سے
کرنی ٹھیک نہیں ہے پہلے آپ دو توس کھائیے پھر مجھے نتیجہ
بتائیے کوئی گڑبڑ ہوگی تو میں سنبھال لوں گا" میں نے کہا
آپا جان خفا ہوں گی اس پر کہنے لگے "اگر مس صاحبہ کو ایک
ہفتہ تک پانی اور دودھ پر رکھیں تو یہ اپنی ضد چھوڑ دیں گی"

بہر حال پہلے دن اللہ کا نام لے کر دو توس کھائے،
پیٹ میں تھوڑی سی گڑبڑ شروع ہوئی شرما صاحب نے
جھٹ ایک نسخہ لکھ دیا کہنے لگے "میرے اس نسخے کی مدد سے
آپ توس کھاتے جائیے۔ بس میں بھی خوشی خوشی کھاتا گیا مجھے
ایسا معلوم ہوا کہ اور انسانوں کی طرح کچھ کھا سکتا ہوں
دماغ میں یہ بات جو بسی ہوئی تھی نکل گئی کہ کوئی چیز کھائی اور

مرا۔ گرمیوں کا زمانہ آ گیا تھا شرما صاحب نے کہا "الموڑے
میں میرے ایک دوست ہیں ڈاکٹر خان چند، وہاں کی آب وہوا
پاک صاف ہے پہاڑیاں چشمے ہرے بھرے درخت ہیں جب
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگے گی تو آپ کا دماغ کھلتا جائے گا مگر میری
ایک بات ضرور مانئے کہ کم سے کم چھ مہینے وہاں رہئے" میں نے
کہا "روپئے!!" اس پر زور سے بولے ــــــ دفتر والوں
سے زبردستی لیجئے اور نہیں تو اپنے آپ کو بیچ ڈالئے
زندگی بہت قیمتی چیز ہے غفار صاحب یہ سب بکواس ہے کہ
روپئے کہاں سے آئیں گے اور کیا ہوگا زندہ رہے تو
بہت کچھ کما سکتے ہیں مرگئے تو آپ کا کون کیا کرلے گا
بازی لگا کر تو دیکھئے یوں فکروں میں گھلے جانا مردوں کا
کام نہیں" شرما صاحب کی باتوں سے میرے تمام وہ خیالات
جاتے رہے کہ اتنے بڑے قرضے کو سامنے رکھتے ہوئے اگر
میں نے پہاڑ پر جانے کے لئے مزید قرضہ لیا تو کس طرح
ادا کروں گا اور دنیا کیا کہے گی!!

طبیہ کالج کے ایک بڑے ذمہ دار ڈاکٹر کی یہ باتیں سن کر
میری ہمت بندھی یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں اسی دن ششم

کی الوداعی پارٹی اور مدرسہ کی سالانہ تصویر میں شریک ہونے
کے لئے مدرسہ گیا تھا ——— ۳۰ راپریل تھی ذاکر صاحب کہنے
لگے "وسط مئی یا آخر مئی میں آپ پہاڑ پر چلے جائیے اور وہاں
زیادہ سے زیادہ عرصہ گزار دیجئے" میں خاموش رہا اس پر
ذاکر صاحب پھر بولے "غالباً روپیئے کا خیال ہوگا دام تو
اب بھی نہیں ہیں لیکن آپ چل دیجئے اللہ مالک ہے" میں
نے پس و پیش کرتے ہوئے کہا "اچھی بات ہے"

کمزوری زیادہ تھی الموڑے تک پہنچانے کے لئے عبدالواحد صاحب
کو لے کر مئی میں دہلی سے روانہ ہوگیا روانگی کے وقت آپا جان
نے فورس (گیہوں سے تیار ہونے والی ایک بہت ہی ہلکی غذا)
کا ڈبہ۔ جو کے آٹے کا ڈبہ۔ اولٹین کا ڈبہ۔ کویکر اوٹس کا ڈبہ پھر
پلستر کرنے کے لئے اینٹی فلوجسٹین کا ڈبہ۔ روئی اور دوسری ضروری
چیزیں ساتھ کر دی تھیں اور تاکید کی تھی کہ بے احتیاطی نہ کرنا
کاٹھ گودام تک ریل میں وہاں سے لاری میں پہنچا لاری کے
اڈے سے سینوٹوریم تک ڈولی میں گیا۔ ڈاکٹر خان چند ٹھہرے
شرما صاحب کے دوست کہنے لگے "میں اس شرط پر
آپ کو سینوٹوریم میں رکھوں گا کہ آپ زیادہ سے زیادہ کھائیں"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب مجھے آپ کی بات عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے۔ چار مہینے ہو گئے ہیں قسم لے لیجئے جو شوربہ اور چپاتی یا کھچڑی کی شکل دیکھی ہو، لوگوں نے تو یہی کہا کہ پہاڑ پر جانے سے زیادہ سے زیادہ یہ ہو جائے گا کہ ہلکی غذائیں کھانے کے قابل ہو جاؤں گا لیکن عمر بھر احتیاط کرنی ہو گی۔ اُنھوں نے بھی سٹرما صاحب کی طرح اس خیال کے لوگوں کو کھری کھری سُنائیں پھر باورچی سے کہا "کل کے کھانے میں چاول اور مچھلی کا سالن کِھلایا جائے۔" میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب ایک ہفتہ تو گزر جانے دیجئے" لیکن یہ چل دئے۔ پہاڑ کی آب وہوا کی وجہ سے ایسا کہا ہو گا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ڈاکٹر انصاری نے پانی جیسی چیزیں اُس وقت تجویز کی تھیں جبکہ خطرہ نیا نیا پیدا ہوا تھا اور حالت گرتی جا رہی تھی۔ بہرحال میں نے ڈرتے ڈرتے یہ چیزیں کھائیں۔ گرد سے پاک وصاف ہوا گھنے درختوں کی چھاؤں، چشموں کا پانی، اوسط درجہ کی حرارت نہ گرمی اور نہ سردی آس پاس کے خوبصورت مناظر اپنا کام کر رہے تھے جسم کے جتنے کل پُرزے بے جان ہو گئے تھے ایسا معلوم ہوا کہ اب یہ حرکت کرنے لگے ہیں ہوتے ہوتے حواس خمسہ (زبان

آنکھ، کان، ناک اور چھونے کی طاقت) جاگ گئے دل و دماغ
اپنا کام کرنے لگے پہلے دن جب وزن لیا تو سو (۱۰۰) پاونڈ کے قریب
تھا۔ ساڑھے پانچ فٹ قد والے آدمی کے لئے یہ کچھ بھی نہیں ہے
سیروں وزن بڑھنے لگا، کھچڑی کا کیا ذکر ہے، ساگ، ترکاری
گوشت روٹی سب کچھ کھانے لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ فٹ بال
کی طرح دن بدن ہوا بھرتی جا رہی ہے کسی کو یقین نہ آئے گا لیکن
یہ سب کچھ ایک مہینے کے اندر ہو گیا۔ ڈاکٹر خان چند کہنے لگے
"جناب بڑھنے کی یہ رفتار اس قدر تیز نہ رکھئے ورنہ سینٹوریم
کا دروازہ بڑا کرنا ہوگا!!"

کام کرنے کی طاقت تم با نور رفتہ رفتہ آتی ہے لیکن جو لوگ
کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں اُن کا دماغ آگے آگے اور طاقت پیچھے
پیچھے رہتی ہے بالآخر یہ دماغ اِس طاقت کو بھی اپنے جوئے
میں جوڑ لیتا ہے اور غریب طاقت کو ——— ساتھ دینا ہی
پڑتا ہے، ہندوستانی سینٹوریم میں مریضوں کی طبیعت کے مطابق
بھلا کہاں کے کام اور کہاں کا پروگرام ممکن ہے اب جا کر کچھ
ہونے لگا ہو، میرے سامنے کوئی مشغلہ نہ تھا دماغ طرح طرح
کی باتیں سوچنے لگا

میں اب تک بیمار کیوں رہا !
میں اتنی مصیبت میں کیوں ہوں !
جو لوگ محنت کرتے ہیں اُن پر مصیبتیں کیوں آتی ہیں!
جو لوگ آرام کرتے ہیں وہ مزے کیوں اڑاتے ہیں!
دُنیا میں اس قدر مصیبتیں کیوں ہیں !
غریبوں نے کیا قصور کیا !
امیروں نے کون سے نیک کام کیئے !
لوگ ستد کے پجاری کیوں ہیں !
کیا ولایت میں تعلیم پائے بغیر میں دنیا میں کچھ نہیں
کر سکتا !

غرض اسی اُدھیڑ بُن میں ایک دن گزرا دوسرا دن گزرا
کئی کئی راتیں سوچنے میں گزرنے لگیں۔ نیند اور آرام کا نام ونشان
غائب ہوگیا۔ سچ کہتا ہوں بعض دفعہ چوبیس گھنٹوں میں ایک
گھنٹہ بھی سو نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر خان چند مولوی صاحب کی نقل
میں جوابات دینے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر جان گیا تھا کہ
یہ جھوٹ موٹ کی تشفی کرانا چاہتے ہیں آخر تنگ آکر میری طرف
آنا ہی چھوڑ دیا۔ بعض دفعہ دل کی دھڑکن بڑھ جاتی تھی اور

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح کرنی مشکل ہو جائے گی
عبداللہ باورچی صبح صبح سورج نکلتے وقت گرم گرم ناشتہ کروا دیتا اس سے کچھ سکون ہو جاتا اسی طرح کھانے کے اوقات میں۔ باقی وقت میں پھلوں کی شکر یعنی گلوکوز ڈی کھانا (اس سے دل کی دھڑکن کم ہو جاتی ہے) پانی پینا اور سوچنا بس یہی کام تھا رات دن کی اُدھیڑبُن میں پھلوں کی شکر ہضم ہوتی گئی اس سے آنتیں صاف ہو کر مضبوط ہونے لگیں میں اسی بیماری میں مبتلا تھا عام حالت میں اتنی گلوکوز ڈی نہ تو کھائی جاتی اور نہ ہضم ہوتی لیکن یہ بات اب سمجھ میں آئی ہے (اسی لئے تو کہتے ہیں کہ اللہ میاں جو کچھ ہونے دیتے ہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک رہتا ہے جلدی میں ناشکری نہ کرنی چاہیئے)

اس وقت تو یہی بات سمجھ میں آئی کہ دہلی سے کسی ساتھی کو بلا لوں تاکہ یہ نئی بیماری جاتی رہے یکے بعد دیگرے برکت علی صاحب حامد علی خاں صاحب، حفیظ الدین صاحب کو تار دیا کہ حالت خراب ہے فوراً روانہ ہو جائیں مگر کسی نہ کسی وجہ سے ان میں سے کوئی شخص بھی میرے پاس نہ پہنچ سکا پھر محمد حسین صاحب حیدرآبادی کو تار دیا جو اُن دنوں لائلپور میں زراعت کی تعلیم پا رہے تھے

دوڑے۔ دوڑے آئے کہ نہ جانے حالت کیسی ہے مگر اچانک مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے

" ہیں ——— غفار صاحب ——— آپ اور یہ صحت!" قصہ کیا ہے میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں!!

میرا وزن ایک سو سولہ (۱۱۶) پونڈ ہو گیا تھا ڈاڑھی بڑھ گئی تھی کیونکہ اس اُدھیڑ بُن میں حجامت بنوانے کا موقع ہی نہ ملا تھا تندرستی کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ باوجود اس ہنگامہ کے زندہ تھا اُنھوں نے مجھے تاش کھلانے کی کوشش کی میرے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ اپنا دیوانہ پن ان پر ظاہر تو کر دیا تھا مگر عملاً ایسا کرنے سے شرم آئی اور گُم صُم رہنے لگا یہ سمجھے کہ اب ٹھیک ہو گیا ہے پھر یہ دہلی چل دیے، میں اکیلا رہ گیا پھر وہی کیفیت بس سوائے اس کے کوئی علاج نہ تھا کہ میں بھی دہلی بھاگ جاؤں یہاں پہنچا تو جو دیکھتا حیرت سے یہی کہتا "آپ عبدالغفار ہیں یا بھوت بن کر آئے ہیں۔ لوگ تو کہتے تھے دیکھو زندہ رہتے ہیں یا نہیں اگر واپس آنا ہے تو چھ مہینے سے پہلے کیا آئیں گے مگر ڈیڑھ مہینے میں اتنی تندرستی!!!"

میں نے کہا "اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے جو

اللہ میاں کا یقین دلانے والی ہے کہ آپا جان نے فورس کا ڈبہ جو کے آٹے کا ڈبہ۔ کوکر اوٹس۔ اوولٹین اور پلستر کرنے کا اینٹی فلوجسٹین کا ڈبہ یہ سب چیزیں جو ساتھ کر دی تھیں انھیں میں نے کھول کر دیکھا بھی نہیں جوں کی توں واپس لایا ہوں!!!"

اگست میں مدرسہ کھل گیا اور میں لڑکوں کے ساتھ ہنسی خوشی کام کرنے لگا

شاید کوئی لڑکا یہ پوچھے کہ آپ کے دل میں جو سوالات پیدا ہوئے تھے۔ آخر اُن کا کیا ہوا اور یہ دیوانہ پن ایک دم کیسے دور ہو گیا! تو بات اصل یہ ہے کہ تم لوگوں کی حرکتیں اور تمھارے روزانہ کے نئے نئے کام اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اِن چیزوں میں دلچسپی لے تو یہ سب خیالی باتیں ایک ایک کرکے غائب ہو جاتی ہیں، یہ تو ہوا دیوانے پن کا علاج لیکن میں بالکل ہی دیوانہ نہیں ہوا تھا بلکہ شروع میں میرے دل میں جو سوالات پیدا ہوئے تھے تو جاننے والے کہتے ہیں کہ ایسے سوالات تو لائق لوگوں کے دلوں میں بھی آتے ہیں۔ اِن کا علاج یہ ہے کہ اِن چیزوں کے متعلق آدمی کچھ تو جاننے والوں سے پوچھے مگر زیادہ تر اچھی اچھی کتابیں پڑھ کر

خود ہی ان کے جوابات تلاش کرے میں نے کچھ سوالات تو مولوی فضل الرحمٰن صاحب سے پوچھے مگر آپ کے جوابات سے تشفی نہ ہوئی اس لئے کہ یہ پُرانے انداز کے آدمی ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مطالعہ اچھّا ہے اور جوابات کو نئے انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں مگر بعض باتیں اپنے دل میں ایسی بیٹھا لی ہیں کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں[1]۔ یہ خیال کئی سال تک میرے دماغ میں چکّر لگاتا رہا بالآخر مولانا ابوالکلام صاحب کے ترجمان القرآن کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے میرے سوالات کا جواب ملتا گیا اور بات بھی سمجھ میں آتی گئی شاید تم میں سے کوئی یہ پوچھے کہ اس کتاب میں اِن سوالات کے جوابات کیا لکھے ہوئے ہیں؟ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ تم لڑکوں کو ابھی ان باتوں کے سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے جس طرح منزل ابتدائی کے بعد منزل ثانوی کا کام سیکھنا پڑتا ہے اسی طرح سے یہ کام ہوتے ہیں جب تم منزل اعلیٰ یعنی کلیّہ میں

---

(۱) خدا کی کہی ہوئی یا بنائی ہوئی چیزوں کو لوگ اپنے اپنے رنگ میں سمجھتے ہیں اس لیئے کسی کے متعلق یہ کہنے میں احتیاط کرنی چاہئے کہ یہ خدا کو ماننے والا ہے اور یہ خدا کو ماننے والا نہیں ہے

پہنچوگے تو تمھارے سامنے قرآن شریف کے بارے میں طرح طرح کے ترجمے اور نئے نئے انداز میں سمجھائی ہوئی باتیں ہوں گی مولانا ابوالکلام کا "ترجمان القرآن" بھی ہوگا جو بات دِل کو لگے وہی ٹھیک سمجھنا اُستاد سے صرف سُن لیا اور وہی چیز قبول کرنا جو تمھارا دل چاہے، جو شخص دل سے ایسا کرتا ہے میرا یقین ہے کہ اللہ میاں طرح طرح سے اِس کا اطمینان کرا دیتے ہیں۔ خدا کرے مولانا ابوالکلام قرآن کے باقی حصوں کا مطلب بھی لکھ کر چھپوا دیں۔ ہندوستان کی آزادی کی کوشش کرنے کے جُرم میں یہ آج کل جیل میں ہیں ممکن ہے وہاں یہ کام کر رہے ہوں کیونکہ سیاسی قیدیوں کو لکھنے پڑھنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ مَیں نے مولانا کو دیکھا ہے مگر ان سے باتیں نہیں کی ہیں۔ مولانا کے "ترجُمان القرآن" نے میری دوستی پکّی کرا دی ہے خدا کرے یہ ہمیشہ قائم رہے

پروفیسر محمد مجیب صاحب نے ایک دِن کہا بھی کہ مَیں اِن سب باتوں کی تفصیل کسی نہ کسی شکل میں لکھ لوں اِن باتوں پر کیا منحصر ہے "سیاسیات" کے بارے میں بھی بہت سے خیالات آیا کرتے ہیں مگر رات دن تمہارا ہی کام کرنے کی وجہ سے اتنے ہی الفاظ جانتا ہوں جتنے تمھیں سمجھانے کے لئے ضروری ہیں اِس لئے

مجیب صاحب کے کہنے کے مطابق کیسے لکھوں! اگر کسی بڑے
جاننے والے آدمی سے تعلیم، مذہب، سیاسیات، کے بارے
میں گفتگو کروں تو دو چار جملوں میں ہی وہ مجھے چت کر دیں گے
تو بھائی میری ڈھال تو تمہارا کام ہے۔ میں اس کی آڑ میں
چپ چاپ باتیں سُنتا رہتا ہوں اور اپنا کام کیے جاتا ہوں
ادھر کا حصہ پڑھنے میں تم میرا وہ وعدہ تو بھول ہی گئے
ہو گے جو میں نے نظم سُنانے کے متعلق کیا تھا۔ میں بھی بھول گیا تھا
ابھی ابھی یاد آیا ہے۔ لو سُنو

پیغامِ عمل

کچھ مقصد لے کر آتا ہے اس دُنیا میں جو آتا ہے
محرومِ عمل جو رہتا ہے وہ جیتے جی مرجاتا ہے
اس مزرعِ عالم کو سینچو تم جد و جہد کی بارش سے
جو بیج عمل کا بوتا ہے وہ پھل راحت کا پاتا ہے
رستے کی صعوبت سہہ کر ہی منزل پہ پہنچنا ممکن ہے
آگاہ حقیقت غم سے ہے جو وہ لذّت وعیش اُٹھاتا ہے

ہر ایک مصیبت دنیا میں پیغام خوشی کا لاتی ہے
گلشن میں خزاں کا آنا ہی امید بہار دلاتا ہے

دریا کی طرح جو چلتا ہے اور پھر چلتا ہی رہتا ہے
کہساروں کو میدانوں کو وہ خاطر میں کب لاتا ہے

ہر رات کے پچھلے حصے میں کچھ دولت لٹتی ہوتی ہے
جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے جو جاگتا ہے وہ پاتا ہے

چودھواں سال

اگست ۱۹۳۳ء سے جولائی ۱۹۳۴ء

پچھلے سال کی طرح اِس سال بھی بیت بازی اور مشاعرہ ہوا لیکن پچھلے سال کی کہانی میں اس کی نسبت کچھ لکھنے کا موقع ہی نہ ملا تو اب سُنو

عام رواج کے مطابق یہ صحبتیں جس طرح ہوتی ہیں اس سے سب ہی لوگ واقف ہیں لیکن ہم تو اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ مدرسہ میں جو چیز بھی ہو اس سے جتنی گنجائش نکل سکتی ہے لکھنے پڑھنے کا کام لیں تاکہ کام اور تفریح دونوں مل جائیں لڑکے اسی نہج کو پسند کرتے ہیں

میں نے ایک دن چھٹی جماعت والوں سے کہا (ان کی
اردو میرے ذمہ تھی) اور سب کام تو ہو رہے ہیں لیکن درسی
کتاب میں جو نظمیں ہیں یہ کب ختم کرو گے؟ اس پر ایک لڑکا بولا
"جی ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے صاف صاف کہیے نا کہ بیت بازی
کا جلسہ ہونے والا ہے ہم لوگ اِن سب نظموں کو پڑھ ڈالیں"!!
میں نے مسکرا کر کہا "ہاں صاحب میرا مطلب یہی ہے کہ اب
کی دفعہ بیت بازی کا کام درسی کتاب میں سے ہو" ایک لڑکا جو
اردو بہت اچھی جانتا تھا ناک بھوں چڑھا کر بولا "ماسٹر صاحب
یہ کیا!" پھر لہجہ بدل کر کہنے لگا "بیت بازی ہو تو بانگ درا
میں سے ہو۔ دیوانِ حسرت سے ہو۔ کلیات اکبر سے ہو" پھر پہلے
لڑکے کی طرف دیکھ کر کسی قدر خفگی سے کہنے لگا "جی کہیں کورس
کی کتاب سے بیت بازی ہوا کرتی ہے!!" "یہ سچ ہے مگر اس
سلسلہ میں درسی کتاب کے شعر آجائیں تو کیا حرج ہے پھر یہ کس نے
کہا کہ اِن کے ختم ہونے کے بعد بانگ درا، کلیات اکبر سے کام
نہ لو" میں نے دخل دیتے ہوئے کہا "ہاں یہ ہم مانتے ہیں"
پہلے لڑکے نے صفحوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا "یہ اشعار
ضرور پڑھیں گے" اس طرح ایک بات طے ہو گئی۔ "پھر یہ کام

کس طرح ہو؟" کام کو آگے بڑھانے کے لئے میں نے کہا
لڑکوں نے اپنی اپنی تجویزیں بتلائیں۔ میں نے کہا" کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ پہلے ہم یہ دیکھیں کہ 'الف' سے شروع ہونے والے شعر کتنے ہیں 'بے' سے شروع ہونے والے کتنے ہیں اسی طرح سارے حروف تہجی کے!!" "ماسٹر صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں کتنی اچھی تجویز ہے" ایک لڑکا خوش ہو کر بولا۔ سب لڑکے راضی ہوگئے

"تو یوں کرو ہر ایک طالب علم ایک چھوٹی سی کاپی جسے بیاض بھی کہتے ہیں۔ بنالے اور کھاتے کی وضع پر اس کے کنارے کاٹ لیں کنارے پر حروف تہجی اس طرح لکھ لیں کہ ایک ہی نظر میں سارے حروف سامنے رہیں" لڑکوں نے آمادگی ظاہر کی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا " بیاض میں کس حرف کے لئے کتنے ورق چھوڑیں گے؟" بس سب حرفوں کے لئے برابر ورق چھوڑتے جائیں گے" ایک لڑکے نے جواب دیا۔ اس پر میں چونکا ہو کر بولا " اُفوہ چھتیس حروف تہجی ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک بہت موٹی بیاض کی ضرورت ہے۔ بھلا ث، ٹ، ڈ، ذ، ز، ژ، ڑ، ط، ظ، ع، غ، ص، ض، ف، ق،

کے اشعار کہاں سے لاؤگے ؟" جھٹ سے میں نے ان حرفوں کو
تختہ پر بھی لکھ دیا لڑکے انھیں دیکھ دیکھ کر اس طرح سوچنے لگے جیسے
کہ انھیں دیوان کے دیوان یاد ہیں۔ کچھ لڑکے اپنی درسی کتاب میں
اشعار ڈھونڈنے لگے ایک لڑکے نے کہا "ہاں ماسٹر صاحب ان
حرفوں کے لئے زیادہ ورق چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے"
میں نے کہا "بھائی شُبہ کیوں رہے یوں کرو کہ ہر ایک لڑکا صرف
ایک حرف لے لے اور یہ دیکھے کہ اس حرف سے شروع ہونے
والے کتنے شعر ہیں جماعت میں لڑکوں کی دلچسپی بڑھنے لگی کسی نے
کہا 'الف' کا شعر دیکھوں گا کسی نے کہا 'ی' کے۔ میں نے تختہ پر
لڑکوں کے نام اور ان کے آگے حرف لکھ دیئے۔ لڑکے اپنے
کام میں مشغول ہوگئے۔ تھوڑی دیر میں نتیجہ تختہ پر لکھ دیا گیا
اور اسی کے مطابق لڑکوں نے بیاض میں ورق چھوڑ دیئے
"کیا یہ تمام شعر بیاض میں نقل کروگے ؟" میں نے کہا۔
اشعار کی تعداد لڑکوں کے سامنے تھی۔ کسی نے کہا "کیا پرواہ ہے
سب نقل کرلیں گے" کوئی ورقوں کو اُلٹنے پلٹنے لگا ایک نے
رُکتے رُکتے کہا "آپ کا مطلب یہ ہے کہ فقط کام کے شعر
نقل کریں" میں نے جھٹ سے اس لڑکے کی بات پکڑ لی اور

جماعت والوں سے کہا " سُنتے ہو آفتاب نے کیا کہا ؟ لڑکے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے میں نے کہا " آفتاب کا کہنا ہے کہ وہی شعر نقل کریں جنھیں بیت بازی کے جلسے میں سُن کر لوگ پھڑک اُٹھیں۔ جب ہماری طرف سے شعر سُنائے جائیں، تالیوں پر تالیاں بجیں " یہ کہتے ہوئے میں نے تالیوں کا اشارہ کیا ، لڑکوں نے تالیاں بجا دیں۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا " خود سُنانے والوں کو بھی لُطف آئے " آفتاب خوش تھے کہ ماسٹر صاحب میری بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے ہیں کہنے لگے " یہ بھی تو کہئے جو شعر سُنائیں لاجواب سُنائیں " میں نے اِس جُملے کو دُہراتے ہوئے زور سے کہا " ہاں ہاں جو شعر سُنائیں لاجواب سُنائیں " جماعت میں پھر ایک دفعہ تالی بجی میں نے کہا " بھائی تالیاں تو خوب بج رہی ہیں پر کام بھی ایسا ہی ہونا چاہیے " لڑکوں نے کہا " ہاں ایسا ہی کام کیجئے "

" اچھا تو یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں فلاں شعر زوردار ہے اور فلاں معمولی یا پھُسپھُسا ہے "!! ایک لڑکے نے کہا " یہ کیا مُشکل ہے اشعار پڑھتے جائیں گے جو پسند نہ ہوں ان پر × نشان لگا دیں گے "!!

"یہ ٹھیک ہے لیکن فرض کیجئے ایک شعر بہت اچھا ہے مگر ایک لڑکا محض اس وجہ سے × نشان لگاتا ہے کہ شعر اس کی سمجھ میں نہیں آیا؟" میں نے کہا۔ اس پر کئی لڑکے چونکتے ہوئے اور کہنے لگے "نہ سمجھ میں آنے والے شعر پر 'ن' لکھ دیں گے۔ میں نے لڑکوں کے مشورے سے تختے پر لکھ دیا کہ مطالعہ کرتے وقت کس بات کے لئے کون سی علامت استعمال کریں گے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی طے ہو گئی کہ کتاب پر یہ سب علامتیں پنسل سے لگائیں گے تاکہ کام ختم ہونے پر ربڑ سے مٹائی جا سکیں اچھے شعر کے لئے "۲" معمولی کے لئے "م" ناپسند کے لئے × نہ سمجھ میں آنے والے کے لئے "ن" کی علامتیں مقرر ہو گئیں۔ لڑکوں نے اس کام کو بڑی دلچسپی سے کیا۔ میں نے اقامت گاہ میں جا کر دیکھا کہ لڑکے نظموں کا مطالعہ اپنی اپنی جگہ پر اس طرح کر رہے تھے جس طرح کوئی بڑا "سخن فہم" کسی دیوان سے اچھے اچھے شعر منتخب کر رہا ہو تاکہ اس کا مجموعہ لوگوں کی دلچسپی کے لئے شائع کرے میں بھی باری باری سے چپ چاپ لڑکے کے قریب بیٹھ کر دیکھ لیتا تھا ایک موقع پر مجھ سے رہا نہ گیا ایک بات سے میں پھڑک اٹھا اور چلا کر کہا " لڑکو لڑکو سنتے ہو محمود الہ آبادی

نے کس شعر پر "۱" کا نشان لگا ہے"

معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس
سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجے

لڑکوں نے تالیاں بجا دیں۔ اِن دنوں نوازخاں کی آفتاب سے لڑائی تھی اُنھوں نے اِس شعر پر "۱" کا نشان لگایا

آ مثال آئینہ تو ہم سے ہو جا سینہ صاف
دُور کر دِل سے کدُورت ہے صفائی میں مزا

اِن دنوں گُگ اُردو پڑھائی جاتی تھی میں نے چند لڑکوں کی پسند کے دو دو شعر لکھ کر اپنے کاغذات میں رکھ لیئے تھے یہ تو مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن "آپ بیتی" لکھوں گا بس یوں ہی جمع کرتا گیا جب "آپ بیتی" لکھنے لگا تو کتنی خوشی ہوئی کہ بچّوں کی پسند کے یہ شعر اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے اور بھی بچوں کے کام کی اچھی اچھی چیزیں ملیں میں نے پُرانے کاغذات کے تمام ذخیرے کو ترتیب وار چھانٹا حافظ صاحب سے جو لڑائی ہُوا کرتی تھی اس کے کاغذات نکلے مجتبیٰ صاحب سے فقط ایک دفعہ لڑائی

ہوئی تھی اِن کا بھی ایک خط نکلا - جامعہ کے کاموں سے متعلق
کئی "اسکیمیں" نکلیں جو میں نے ڈاکر صاحب کے کہنے پر تیار
کی تھیں - مختلف شعبوں کے قواعد و ضوابط کے مسودے نکلے
جب میں علی گڑھ میں مطبع میں کام کرتا تھا اس کے منیجر صاحب
نے چھاپہ خانہ سے متعلق اچھے اچھے نوٹ لکھائے تھے یہ بھی
دیکھنے میں آئے - حافظ صاحب نے الجبرا کے تمام فارمولے
ایک کاپی میں حل کرائے تھے اسے حفاظت سے رکھا ہے - میٹرک
کا حساب مشق جاری نہ رہنے کی وجہ سے کہیں کہیں سے بھول تا
ہوں اگر کوئی لڑکا کسی فارمولے کو سمجھنا چاہے گا تو جھٹ کاپی
میں دیکھ کر بتا دوں گا - سب سے دلچسپ چیز تو بچوں کے خطوط
ہیں مگر اِس حصے میں تو ان کے درج کرنے کی گنجائش نہیں
نکلے گی البتہ دوسرے حصے میں اچھے اچھے خط درج کروں گا
قصہ مختصر جتنی بیکار چیزیں تھیں مثلاً لڑائیوں کی خط و کتابت
شکوے شکایتیں یہ سب تو آگ کی نذر کر دی ہیں صرف کام
کی چیزیں جس سے کسی کو یا خود مجھے فائدے پہنچیں حفاظت سے
رکھ لی ہیں جہاں جہاں موقع ہوگا ان کے حوالے دوں گا اس وقت
تو چند لڑکوں کے دو دو شعر نقل کرتا ہوں جو اُنھوں نے کمک اُردو

سے بیت بازی کے جلسے کے لیے '۲' کے نشان کے ساتھ نقل کیے تھے

سنا باد صبا کیا کیا خبر ہے ــــ قلمرو میں تری گل بحروبر ہے
سفینہ جب کنارے پہ آ لگا غالب ــــ خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

(فرخ عزیز)

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجیے ــــ اس فصل میں جو بھیجیے بس آم بھیجیے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا اڈریس ــــ سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجیے

(محمود الہ آبادی)

روش گل ہیں کہاں یار ہنسانے والے ــــ ہم کو شبنم کی طرح سب ہیں رلانے والے
ذرا دیکھ عبرت سے سوتے ہیں غافل ــــ مزاروں میں پہنے کفن کیسے کیسے

(ملک صدیق)

بت خانہ کھود ڈالیے مندر کو ڈھائیے ــــ دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے
آتش برا نہ مانیو حق حق جو پوچھیو ــــ شاعر ہیں ہم دروغ ہمارا کلام ہے

(عبدالناصر)

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
اے چشمۂ آب زندگانی ــــ گھٹیو نہ کبھی تری روانی
(عبدالحی خاں)

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالی

(ابوالکلام)

چل اے باد بہاری سمت گلزار
تمنائی ہے تیرا ہر گل و خار
ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے ہیں

(صدیق آزاد)

بن گئی جان پہ اور تو نے نہ جانا
ہائے تو اتنا مرے حال سے انجان بنا
کب تک اے ابر کرم ترسائے گا
مینہ بھی رحمت کا کبھی برسائے گا

(سید عباس حسنی)

غالب کہ ریل پر بھی ہو قطع سفر محال
یو قرض کے ٹکٹ سے ہوئے ہو سوار تم

آ مثال آئینہ تو ہم سے ہو جا سینہ صاف
دور کر دل سے کدورت ہے صفائی میں مزا
سُرمہ چشم عزیزاں نہ بنا ہیں اے چرخ
کیا بنا خاک غبارِ دلِ احباب بنا
(محمد نور خاں)

آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں
(آفتاب احمد)

او حیا او پاسبانِ آرزو
بیکسوں کی قوتِ بازو ہے تو
محبت کوڑیوں کے ہو اگر مول
بنی آدم نہ لے یہ دردِ سر مول
(عبدالسمیع)

رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خونفشانیاں ہیں یا گلفشانیاں ہیں

کیا مچائی اُس نے میرے دل کے کاشانہ میں دھوم
شور ہے جس کے لئے کعبہ میں بتخانہ میں دھوم
(محمود احمد دہلوی)

دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا
یارب بنے بنی میں ہمیشہ بنی رہا
ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
پر ہم سے تو تھمی نہ کبھی مُنہ پہ آئی بات
(عزیزالرحمٰن)

اشعار کا یہ انتخاب مُلک اُردو میں سے ہے اِس کتاب کا شُمار اب پرانی درسی کتابوں میں ہوتا ہے اس لیے نئی نئی ریڈروں میں بچّوں کی ضروریات کے مطابق نظموں کا انتخاب ہونے لگا ہے "درسِ عثمانیہ" کے سلسلے میں بچوں کے لیے "نظیر اکبرآبادی" کی نظمیں جگہ جگہ ملیں گی بچے اِن نظموں کو پسند کرتے ہیں اور لُطف لیتے ہیں اگر آج کل کی چھٹی جماعت والوں سے انتخاب کرایا جائے تو فہرست کا رنگ ریڈریں مرتب کرنے والوں کی مرضی کے مطابق نکلے گا

لڑکے نشان لگانے کا کام ختم کر چکے تو میں نے کہا

اب روزانہ وہ اشعار سمجھائے جائیں گے جو آپ کی سمجھ میں نہیں
ئے ہیں یعنی جن پر "ن" نشان لگا ہے باری باری سے ہر ایک
کا اپنے شعر پڑھتا جائے جب ایک شعر سمجھا دیا جائے تو وہ سب
کے جن کے ہاں اسی شعر پر نشان لگا ہے مٹا دیں" ایک ہی عمر
ر ایک ہی جماعت کے لڑکے ہونے کی وجہ سے نہ سمجھ میں آنے والے
ت سے اشعار مشترک نکلے ساتھ ہی ساتھ روزانہ گھر کا کام بھی
جاتا تھا یعنی سمجھانے کے بعد روزانہ پانچ چھ شعر دے دیئے
تے تھے کہ لڑکے اِن کا مطلب گھر سے لکھ لائیں

ایک دن موقع دیکھ کر پھر میں نے بات چھیڑی۔ "پڑھنے
ھانے لکھنے لکھانے کا کام تو ہو رہا ہے لیکن بیت بازی میں
پڑھ کر سناؤ گے یا زبانی؟" ایک دم بہت سے لڑکوں نے
"زبانی"۔ ایک لڑکے نے کہا "بیت بازی کہتے اسی کو ہیں
ر زبانی سنائے جائیں!!"

"ہاں ہاں یہ تو مجھے بھی معلوم ہے پر میرا مطلب یہ ہے
دوا دکرنا بھی ہے یا نہیں" میں نے جواب دیا۔ میں سمجھتا تھا
یلا میں ہی اِس کام کو سوچ سمجھ کر چلا رہا ہوں لیکن اِس
کے چھیڑنے سے معلوم ہوا کہ لڑکے روزانہ اچھے اچھے

شعر یاد کرتے جاتے تھے اتالیق صاحب سوتے وقت ہر ایک
لڑکے سے دو دو شعر سن بھی لیتے تھے۔ میں نے کہا "معاف کر
یہ بات بہت دیر میں یاد آئی ہے ہر ایک لڑکا اگر بے حساب
شعر یاد کرے تو ایک تو یہ مشکل کام ہے پھر بہت سے شعر ایسے
ہوں گے جو کئی لڑکوں کو یاد ہوں گے اور بعض شعر ممکن ہے
کوئی یاد ہی نہ کرے اس طرح بیت بازی میں گڑبڑ رہے گی
"پھر"؟ چند لڑکوں نے کہا
"جناب بہترین ترکیب یہ ہے کہ جماعت کے فریق
بن جائیں ہر ایک فریق چند حرف لے لے اس طرح کہ
کئے جانے والے شعر ہر ایک فریق میں برابر برابر تقسیم
ہو جائیں" یہ تجویز سامنے رکھتے ہی فریق بن گئے پھر میں نے
زور دے کر کہا "ایک بات کہے دیتا ہوں اگر کسی فریق کا
کام ڈھیلا رہا اور جماعت نے بیت بازی ہاری تو پھر
سارا الزام اس فریق پر رہے گا" لڑکوں نے کہا "آپ
نہ کیجئے ایک فریق میں کئی کئی لڑکے ہیں معاملے کو سنبھال لیں
ہم نے یہ ہوشیاری کی تھی کہ ایک فریق کو جو کئی حرف دئ
گئے تھے تو یہ نہیں کہا تھا کہ ان میں بھی ہر ایک لڑکا ایک ایک

حرف مجن سے اگر ایسا کرتے تو خرابی ہوتی فرض کیجئے وہ لڑکا عین موقع پر پیشاب کے لئے چلا جاتا ہے تب ؟

غرض ہنسی خوشی یہ کام ہونے لگا۔ میری طبیعت کچھ اس قسم کی ہے کہ جہاں لڑکوں کو کام کرتے ہوئے اور خوش دیکھا بس میری عقل بھی زوروں پر آجاتی ہے اور دنیا بھر کی اچھی اچھی باتیں سوجھنے لگتی ہیں میں ایک دن جماعت میں بہت خوش خوش داخل ہوا کہ لڑکے کہنے لگے " آج کوئی خاص بات ضرور ہے " میں نے کہا " خاص بات !! " خاص بات کیا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر !!! چند لڑکوں نے کہا " اچھا اس سے بھی بڑھ کر !!!

" جی ——— جب یہ بات مجھے معلوم ہوئی تو میں نے محمد عثمان صاحب سے کہا آخر آپ نے یہ بات اب تک مجھ سے کیوں چھپائی !!

" کیا بات ہے !! " لڑکوں نے کہا

عثمان صاحب کہتے ہیں " انّی شعر کہہ سکتی ہے " میں کہتا ہوں " انّی شعر کہتی ہے " یہ کہتے ہوئے میں نے یہ شعر تختہ پر لکھا

چاند چھپے بادل میں بدن چھپے ململ میں

"کیا یہ شعر نہیں ہے؟" میں نے مڑ کر پوچھا
"ہاں ہاں یہ شعر ہے" لڑکوں نے جواب دیا
"اسی لئے تو میں کہتا ہوں انّی شاعرہ ہے"
"ماسٹر صاحب صاف صاف بتائیے کہ بات کیا ہے"
"بات یہ ہے کہ عثمان صاحب ایک دن کہنے لگے میری
بچی جس کا نام انوری بیگم ہے وہ آٹھ سال کی ہے اسے یہ شوق
ہو گیا ہے کہ کوئی سا لفظ بتا دیں تو اس لفظ کے متعلق
ایک شعر کہہ دے گی ایک دن انھوں نے "چاند" کا لفظ
اس کے سامنے رکھا اس نے کچھ یوں ہی سا آسمان کی طرف
دیکھا اور جھٹ سے تختہ پر لکھا ہوا شعر کہہ ڈالا۔ لوگ اسے
پیار سے انّی پکارتے ہیں اس نے اپنا تخلص انّی ہی رکھ
لیا ہے بلّی پر جو شعر کہا ہے اس میں تخلص آیا ہے کہتی ہے
بلّی آئی جھٹ سے انّی نے مارا پٹ سے
کیا آپ لوگ ایسے شعر نہیں کہہ سکتے؟
"ہاں ہاں ضرور کہیں گے آپ لفظ تو بتائیے" لڑکوں
نے جواب دیا "لفظ میں کیا بتاؤں ہر ایک لڑکا اپنی
اپنی پسند کے دس لفظ کاپیوں پر لکھے اور پہلا لڑکا لفظوں

کی یہ فہرست سُنائیے جو جو لفظ اور لڑکوں کی کاپیوں میں مشترک
ہوں ان پر ✓ نشان لگائیں پھر دُوسرا تیسرا لڑکا سُنائے
اس طرح سے ایسے دس لفظ چُن لیں جنھیں سب لڑکے پسند
کریں ہر ایک لفظ کے متعلق زیادہ نہیں صرف ایک شعر لکھ لائیں
لفظوں کا انتخاب تو جماعت میں ہو۔ اور شعر گھر سے لکھ لائیں
سب کی پسند کے دس لفظ یہ تھے۔
طوطا، پھوُل، طاہر میاں کی غلیل، بلبل، شمع، سوُرج
ستارہ، بنک، دُکان، کسان
دُوسرے دن لڑکے کہنے لگے "ایک لفظ پر کئی کئی شعر
لکھوائیے۔ میں نے کہا "آپ لوگوں کی جیسی مرضی ہو بس اس کا
خیال رکھیے کہ شعر کہنے کے پیچھے کہیں بیت بازی کا کام
بھوُل نہ جائیں" لڑکے کہنے لگے "آپ نے ہمیں ایسا نادان
سمجھ لیا ہے ثانوی اول سے مقابلہ کرنا ہے آپ سے زیادہ
ہمیں فکر ہے"!
بڑے شاعروں کے چند شعر پچھلے ورقوں میں درج
کیے تھے ننھے شاعروں کے شعر یہاں لکھتا ہوں جس طرح
استاد اور لڑکے کے مضمون لکھنے میں فرق ہوتا ہے وہی

فرق یہاں بھی ہے اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ
شعر ہیں یا بھلن

۱۔ طوطا :۔

یہ طوطا کیسا پیارا ہے باغ میں آم یہ کھاتا ہے

عباس حسنی

یہ طوطا کیسا اچھا ہے باغ میں ٹیں ٹیں کرتا ہے

بلبل بابلی الکلام ـ بلبل ملبل کلام؟

تجھ سے کسان عاجز مالی بھی تجھ سے نالاں
ہاتھوں میں ہے غلیل اور پھرتے ہیں یہ پریشاں

اسلام اللہ مرحوم

۲۔ کسان :۔

کسان محنت کرتا ہے محنت کا پھل کھاتا ہے

خالد بخش

کسان یہاں جو کرتا ہے سب پیٹ کی خاطر کرتا ہے

رفیق احمد

کبھی کھیت میں بودئے بیج اس نے کبھی کھاد ڈالی دیا پانی اس میں

محمود احمد دہلوی

۳۔ پھول :۔

سب پھول یہ کیسے اچھے ہیں   دن رات یہ خوشبو دیتے ہیں

ابوالکلام ۔ بلبل بلبل کلام آزاد

بہت خوشبو ہے دیکھو پنکھڑی ہیں   تنے ہیں، جڑ میں، ٹہنی میں، شجر میں

خلیل الرحمٰن

صبح کا ہے وقت اور کلیاں ہیں کھلنے کے لئے

اور تھوڑی دیر ہے خوشبو میں بسنے کے لئے

عبدالحی خاں

۴۔ طاہر میاں کی غلیل :۔

اک دن غلیل لے کر   طاہر گیا جو باہر

دیکھا کہ چُگ رہا ہے   دانہ ہرا کبوتر

مارا جو ایک غُلہ   تڑپا وہیں زمین پر

طاہر میاں

طاہر کی اک غلیل سے جانیں گئیں ہزار

کوے مرے کہیں پہ تو چڑیا مری کہیں

فضل الرحمٰن

فاختہ کو دیکھ کے ماری جو ہم نے یہ غلیل لو   وہ بچاری مر گئی اور ہو گیا ہے اپنا کھیل

اسلام اللہ مرحوم

۵ - بنک :-

بنک ہمارا اچھا ہے ۔۔۔ ہم کو پیسے دیتا ہے
لڑکوں سے پیسے لیتا ہے ۔۔۔ اور ان کو منافع دیتا ہے
ہوں کسی کے آٹھ آنے ۔۔۔ نفع دے گا دو آنے

عبدالحی خاں

روپیہ تو ضائع نہ کر کیا فائدہ ۔۔۔ جب ہزاروں بنک یاں موجود ہیں

خلیل الرحمٰن

بچوں کا نرالا ہے یہ بنک ۔۔۔ کیسا اچھا ہے یہ بنک

محمود احمد دہلوی

۶ - دُکان :-

سجی ہے کیسی دُکان ہماری ۔۔۔ بنی ہے کیسی دُکان ہماری

خلیل الرحمٰن

شور کرتے ہوئے آتے ہیں دُکاں پر لڑکے
آ کے لیتے ہیں یہاں کھانے کی چیزیں لڑکے

محمود احمد بہاری مرحوم

ہماری دُکاں کیسی اچھی ہے یارو ۔۔۔ یہ بسکٹ دلاتی ہے اے میرے یارو

اسلام اللہ مرحوم

بچوں کی دُکان ہے چھوٹی   ہم نے ہے یہ کیسی بنائی
ایک ہے لڑ کا کھیلوں پر   دُوسرا بسکٹ دینے پر

محمدؐ احمد دہلوی

۷۔ شمع :۔

ہے سب شاعروں کا اسی پر گزارا   ہے حالیؔ و غالبؔ کا بس اس پہ یارا

عبد الحی خاں

محفل میں تو ہے زینت کُٹیوں میں تیری عزت
بجلی کی روشنی نے چھینی تری حکومت

اسلام اللہ مرحوم

۸۔ ستارہ :۔

اے خوشنما ستارے   کتنے ہو تم پیارے
ہوں روز تم کو تکتا   حیرت ہے مجھ کو پر یہ
تم سا نہیں میں ننّا   اس کی وجہ بتا دو
اے ننھے مُنّے تارے

عبد الحی خاں

چھائے ہوئے ہیں بادل تارے چمک رہے ہیں
دُنیا کی خاموشی پر یہ مُسکرا رہے ہیں

محمود احمد بہاری مرحوم

میرے ننھے منّے تارے　　جھم جھم جھم جھم کرنے والے
محمود احمد بہاری کامرحوم

۹ ۔ سوُرج :۔
صُبح ہوئی اور سوُرج نکلا　　گویا سُنہری گولا نکلا
فضل الرحمٰن

لڑکو دیکھو سوُرج نکلا　　کتنا اچھا کتنا پیارا
سوُرج کی روشنی سے روشن جہاں ہے سارا
سوُرج کی روشنی سے اچھا ہے ہر نظارہ
خلیل الرحمٰن

کل صُبح اسلام جو سویرے اُٹھا　　اک آگ کا گولا اُفق میں دیکھا
پُوچھا جو یہ کیا ہے ؟ تو کہا امّی نے　　سوُرج سب اِسے کہتے ہیں اچھے بیٹا
اسلام اللہ مرحوم

۱۰ ۔ بُلبُل :۔
ٹہنی پہ اک شجر کی بُلبُل کو بیٹھا دیکھا
دُم کو ہلاتے دیکھا نغمہ سُناتے دیکھا
فضل الرحمٰن

او چمن میں رہنے والے　　اچھے اچھے گانے والے
خلیل الرحمٰن

کیسی اچھی بلبل ہے　　پیاری پیاری بلبل ہے
اچھے اچھے اس کے ترانے　　پیارے پیارے اور سہانے

سید رفیق احمد خلف رشید احمد

ذاکر صاحب نے بھی ایک دن مجھے بتلایا تھا کہ ان کی بچی سعیدہ بھی شعر کہتی ہے ایک دو شعر سنائے بھی تھے لیکن مجھے یاد نہیں ہیں

میں نے ایک خط میں سعیدہ کو لکھا بھی تھا کہ میں "آپ بیتی" لکھ رہا ہوں اپنے دو ایک شعر اور تیسری جماعت میں پڑھتے وقت (جس نے اس بچی کو تیسری جماعت میں پڑھایا تھا) کا کام یاد ہو تو لکھ دیں مگر یہ سمجھیں کہ میں نے جھوٹ موٹ پوچھا ہے بھائی میرے کاموں کی ابتدا تو اسی طرح سے ہوتی ہے کہ وہ شروع میں تو جھوٹ موٹ کے نظر آتے ہیں پھر کوئی کچھ کہتا رہے میں آگے بڑھ جاتا ہوں بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سچ مچ کی بات تھی۔ خیر

اب کہانی کا اگلا حصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ ثانوی اول والوں کو پہلے سے علم تھا کہ ان کے مقابلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں لیکن رسم کے مطابق سب کچھ کرنا پڑتا ہے چھٹی جماعت والوں

کی طرف سے دوستانہ مقابلے کی درخواست بھجوا دی گئی اس کے جواب میں ثانوی اوّل والوں نے چند شرطیں رکھیں اور لکھا کہ یہ سب کے فائدے کے لئے رکھی جا رہی ہیں تاکہ اس کام کے کرنے والوں کو فائدہ ہو پھر بھی مقابلہ کا معاملہ تھا چھٹی جماعت والوں نے جماعت میں ان شرائط پر غور کیا، بحث کی، بالآخر اپنی منظوری دے دی۔ شرطیں اچھی تھیں اس لئے سب لڑکے راضی ہو گئے سب کی واقفیت کے لئے درج کرتا ہوں

۱۔ ہار جیت کا معیار اچھے اشعار کی تعداد ہو

۲۔ ایسے حروف پر اشعار کو توڑنے کی کوشش نہ کی جائے جن کے اشعار بہت کم ملتے ہوں مثلاً ث، ذ، ز، ڑ، ژ، ط، ظ، ع، غ، ص، ض، ف، ق، وغیرہ

۳۔ اگر کسی فریق کی طرف سے کوئی غلط شعر پیش ہو تو صرف صدر صاحب فیصلہ کر سکتے ہیں اور اگر اس فریق کا کوئی شخص بھی اس شعر کو صحیح پڑھ دے تو وہ شعر صحیح سمجھا جائے گا

۴۔ مقابلہ ختم کرنے کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا جائے جو ایک گھنٹے سے زیادہ نہ ہو

لڑکوں نے اپنے شوق سے اِدھر اُدھر کی کتابوں سے
اچھے اچھے شعر یاد کئے۔ انھیں اپنی بیاض میں لکھا جو شعر انھیں
پہلے سے یاد تھے ان میں سے اچھے اچھے اس بیاض میں درج
کرلئے جلسہ سے چند دن پہلے سوم جماعت سے ششم جماعت
تک کے طلبا نے دعوت نامے لکھے علٰحدہ علٰحدہ لفافوں میں
استادوں اور مہمانوں کے پاس بھیجے گئے تحفہ کے طور پر تقسیم
کرنے کے لئے لڑکوں کے کہے ہوئے اشعار میں سے چند ایک
چھپوا لئے گئے ایک کمیٹی نے مکتبہ جاکر انعامات کے لئے
کتابوں کا انتخاب کیا اور خرید لائے آپس میں بیت بازی
کرکے دیکھی کہ رنگ کیسا رہتا ہے میں نے یہ بات سمجھا دی تھی
کہ جلسہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ حصہ لینے والوں میں سے دو
تین لڑکے جو بہت سارے شعر جانتے ہوں اپنا کمال دکھائیں
بلکہ ہر ایک لڑکا اپنے شعر سُناتا جائے منصف صاحبان
اس بات پر فیصلہ دیا کرتے ہیں کہ کس فریق کے لڑکوں نے
حصہ زیادہ لیا ہے پھر سننے والے بھی اس بات کو پسند نہیں
کریں گے کہ چند ہی لڑکے بولتے رہیں۔ اس کے علاوہ چند گُر
کی باتیں بھی بتا دی تھیں جن سے سُننے والوں اور منصف صاحبان

پر اثر پڑے مثلاً شعر کو اسی انداز میں پڑھنا جس انداز کا وہ شعر ہے نڈر ہو کر صاف صاف پڑھنا کبھی کبھی ایسی حرکتوں سے کام لینا جو اس شعر سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً محمود الہ آبادی سے کہا گیا تھا کہ "م" کا شعر پڑھنے پہ

سیدھے الہ آباد میرے نام بھیجئے

کا ذکر آئے تو اپنی طرف اشارہ کرے وغیرہ وغیرہ

جلسہ سے ایک دن پہلے پھاٹک بنایا گیا لیکن یہ پھاٹک میلادالنبی کے جلسے سے مختلف تھا تاکہ نئے نئے نمونے سامنے آتے رہیں اس دفعہ لال کپڑے کی پٹیوں سے پھاٹک کے دائیں اور بائیں بازو اور اوپر کی پٹی سجائی گئی۔ مہمانوں کے ہال میں داخل ہوتے وقت ننھے ننھے شاعروں کا چھپا ہوا "کلام" تقسیم کیا گیا چونکہ ڈیڑھ دو مہینے سے درسی کتاب کی نظموں کا کام ہو رہا تھا لڑکے گُر کی باتوں سے واقف تھے بیت بازی کا کام ایک گھنٹہ تک اس طرح جاری رکھا کہ درمیان میں لوگ تالی بجاتے واہ واہ کرتے، اپنی جگہ سنبھل سنبھل کر بیٹھتے تھے اس کیفیت کو جلسہ میں "سماں بندھنا" کہتے ہیں فیصلہ پہلے سے نظر آ رہا تھا اعلان ہوا کہ ثانوی اوّل کے مقابلہ میں ابتدائی ششم جماعت جیت گئی پر لڑکے جانتے تھے

کہ مقابل کے فریق سے کھلاڑیوں کی طرح پیش آنا چاہیئے اس لئے
"بے جا خوشی" کا اظہار نہیں کیا پھر ثانوی والے یہ سمجھتے رہے کہ
ابتدائی والے ہمارے چھوٹے بھائی ہیں بہر حال اس فیصلہ پر
سبھوں نے تالیاں بجائیں جلسہ کا دوسرا حصہ مشاعرہ تھا پہلی
دفعہ یہ رواج قایم کیا گیا کہ جلسوں کی صدارت بھی لڑکے ہی
کیا کریں کیونکہ جب سیکھنا ہی ٹھیرا تو یہ کام کیوں رہ جائے
چنانچہ اسلام اللہ صاحب ابتدائی ششم میر مشاعرہ کی حیثیت
سے تشریف لائے نشستوں کا انتظام فرشی تھا اونچے سے
پلیٹ فارم پر سفید چاندنی اور اس پر گاؤ تکیئے رکھے تھے
دائیں بائیں اور بیچ میں تین چھوٹے چھوٹے قالین بچھے تھے
بجلی کی روشنی کے باوجود شمع جل رہی تھی ہال میں جس سمت
نظر ڈالو مشہور مشہور شعرا کی بڑی بڑی تصویریں لگی تھیں
آزاد، حالی، نذیر، شبلی، غالب، اقبال، اکبر
اجمل، جوہر، بلبل ہند، ٹیگور، سب نظر آرہے تھے
جلسہ کی تیاریاں، لڑکوں کا شوق اور سب سے بڑی
بات یہ کہ لڑکوں کا کام دیکھ کر ذاکر صاحب سے بھی نہ رہا گیا
بچوں کے لیئے ہر ایک شاعر کے حالات فقط دو دو تین تین

جملوں میں اور اس کے ساتھ ہی اپنی پسند کا ایک ایک شعر لکھ لیا
تھا میرے پاس چپکے سے آکر کہنے لگے "میری بھی ایک چیز اپنے
کسی لڑکے سے پڑھوا دیجئے" میں نے کہا "نیکی اور پوچھ پوچھ"
جلسہ شروع ہونے میں شاید دو تین گھنٹے رہ گئے تھے میں نے
بھی ایسے لڑکے کو پکڑا جو بات جلدی سمجھ لے۔ محمد نور خاں
سے کہا " اس وقت تکلف سے کام لینے کی ضرورت نہیں
ہال میں یہ تصویریں لگی ہیں، یہ رہا ڈاکٹر صاحب کا تازہ
لکھا ہوا مضمون

پہلے اسی شاعر کی تصویر کے پاس جاؤ جس کا بیان ہے
پھر اُس شاعر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مگر اپنا چہرہ
اور جسم کا زیادہ حصہ لوگوں کی طرف رکھتے ہوئے اس بیان
کو اس طرح پڑھو جیسے بات چیت کر رہے ہو۔ وہ غریب
سہما ہوا تھا اس خیال سے کہ غلطی کروں تو ماسٹر صاحب کہیں گے
اپنے آپ کو "علامہ" سمجھتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ کا
صاف لکھا ہوا مضمون پڑھا نہیں جاتا! ڈاکٹر صاحب
نے جلدی کے باوجود لکھا صاف تھا مگر ردی کاغذ ہاتھ لگا
تھا کیا کرتے اچھے کاغذ کی تلاش میں اور بھی وقت نکل جاتا

ایک دو شعر شاید انھیں یاد نہیں تھے دوڑے دوڑے نورالرحمٰن صاحب کے ہاں گئے کیونکہ جب مضمون لے کر آ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ اُدھر ہی کے راستے سے آ رہے ہیں بہرحال محمد نور خاں نے بھی دو دفعہ کی مشق میں اپنے آپ کو ٹھیک کرلیا یہ دلچسپ چیز ضرور درج کروں گا مگر چند سطروں میں اس جلسہ کی کاروائی تو ختم کر دیں

سب سے پہلے غریب نور خاں ہی کی باری آئی مگر یہ بھی اپنی گاڑی کھینچ ہی لے گیا ہاں صاحب ایسے موقعوں پر آدمی کو اپنے ہوش و حواس ٹھیک رکھنے چاہئیں۔ پھر باری باری سے ننھے ننھے شعرا بلائے گئے پڑھتے وقت شمع ان کے سامنے رکھی جاتی اور یہ کسی نہ کسی بڑے شاعر کے انداز میں اپنا کلام سناتے محفل میں بھی وہی سماں بندھ گیا جو بڑے مشاعروں میں ہوتا ہے آخر میں صدر صاحب کی باری آئی اُنھوں نے اپنا کام بڑی سنجیدگی اور متانت سے انجام دیا۔ آخر میں اپنا ایک شعر اس طرح پڑھ کر سنایا کہ تمام روشنی گُل کر دی گئی ہاں ہال میں اندھیرا تھا بس ایک شمع جل رہی تھی، کہنے لگے

محفل میں تو ہے زینت کٹیوں میں تیری عزت
بجلی کی روشنی نے چھینی تری حکومت

پھر روشنی کر دی گئی وہ لڑکے جو کھسر پھسر کر رہے تھے حیران تھے کہ قصّہ کیا ہے! بروشنی سے اندھیرا، اندھیرے سے روشنی، معاملہ سمجھ میں نہ آنے کے باوجود تالی بجانے میں انھوں نے بھی حصہ لیا گو یا ایسی چیزیں شریک ہو جائیں غنیمت ہے

اب میں چار صفحوں کا وہ مضمون درج کرتا ہوں جو ڈاکٹر صاحب نے جلدی میں لکھا تھا اور اسی جلدی میں مضمون کا نام لکھنا بھی بھول گئے تھے لیکن میں لکھے دیتا ہوں ڈاکٹر صاحب نے اس بات کو سامنے رکھ کر لکھا ہے کہ گویا ایک لڑکا اپنی طرف سے سُنا رہا ہے

ہمارے شاعر

۱۔ محمدؐ حسین آزاد مرحوم

اردو میں نئے طرز کی نظم کے بانیوں میں ہیں نثر بے مثل لکھتے تھے ان کی کتاب "آبِ حیات" بہت مشہور ہے ایک شعر سنئے

یوں پھوٹ کر جوں ہی گُل دریچاں نکل پڑے
کیا جانے کن دلوں کے ہیں ارماں نکل پڑے

۲۔ خواجہ الطاف حسین حالی

پانی پت کے رہنے والے تھے، جہاں حافظ فیاض صاحب

اور شیخ مفتاح الدین صاحب کا وطن ہے ان کی شاعری نے مسلمانوں کو سوتے سے جگا یا ان کا مسدس ضرور پڑھئے۔ اس وقت تو ایک رباعی سُناتا ہوں

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
ہر چیز کو یاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

۳۔ ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم

دہلی کے رہنے والے تھے تقریر و تحریر دونوں لاجواب تھیں۔ قومی نظمیں بھی لکھتے تھے ان کے شعر کچھ پسند نہیں اس لئے آپ کو نہیں سُناتا

۴۔ مولانا شبلی مرحوم

اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے جہاں خاکسار کا بھی وطن ہے (ڈاکٹر صاحب کا نہیں بلکہ نور خاں کا کیونکہ مضمون تو یہی سُنا رہے تھے) اردو کے بڑے مشہور مصنف تھے، ان کی "سیرۃ النبی" تو سب کو پڑھنی چاہیے۔ فارسی اردو دونوں میں شعر کہتے تھے ان کا مشہور شعر ہے

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھر آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

۵۔ اسد اللہ خاں غالب

ہماری زبان کے شاعروں کے سردار ہیں لوگ ان کے
شعر پڑھتے ہیں اور سر دُھنتے ہیں، دیکھیے کیا شعر کہا ہے

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

۶۔ ڈاکٹر اقبال

لاہور میں رہتے ہیں وہی جنھوں نے ترانہ لکھا تھا
پڑھنے والوں کے دلوں میں گرمی پیدا کرتے ہیں۔ اسی ترانہ
کا شعر ہے

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا   ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

۷۔ اکبر الہ آبادی

بڑے مزے کے شاعر تھے باتیں پتہ کی کہتے تھے ان کے
شعر پڑھو تو ہنسی آتی ہے اور ان پر غور کرو تو رونا، ایک شعر سنئے

شیخ جی کے دونوں بیٹے با ہنر پیدا ہوئے
ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی پا گئے

۸ - حکیم اجمل خاں مرحوم :-

ہماری جامعہ کے بانی تھے اِن کا دیوان بہت خوبصورت جرمنی میں چھپا ہے۔ مکتبہ میں ملتا ہے۔ کیا اچھا شعر ہے

آغوشِ مرگ ہی کو کیا ہم نے اختیار آخر یہ چارۂ مرض لا دوا کیا

۹ - مولانا محمد علی جوہر مرحوم

ہماری جامعہ کے سب سے پہلے شیخ الجامعہ تھے اِن کے کلام میں بڑا اثر تھا شعر دل میں اتر جاتے ہیں۔ سُنئے

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

۱۰ - سروجنی نائیڈو :-

بُلبلِ ہند کہلاتی ہیں مگر شعر انگریزی میں کہتی ہیں آج کل جیل میں ہیں

۱۱ - ڈاکٹر ٹیگور

ہندوستان کے ملک الشعرا مانے جاتے ہیں ساری دنیا میں آپ کا کلام ترجموں میں پڑھا جاتا ہے بنگالی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ مشہور کتاب "گیتا نجلی" ہے

لیتا ہے دل میں غم مرے آرام اس طرح
سنسان جنگلوں میں پڑے شام جس طرح

پچھلی طویل بیماری کی وجہ سے پہلی سی طاقت نہ رہی تھی
ڈاکٹر ذاکر صاحب کے کہنے پر چار کی بجائے تین پیریڈ کر لئے
اس صورت میں ایک ہی جماعت میں پڑھانا ضروری تھا اس لئے
چوتھی جماعت کی اردو اور معلومات عامہ کا کام اپنے ذمہ رکھا
معلومات عامہ کے نصاب کے مطابق مضامین لکھوانے، پمفلٹ
تیار کرانے میں اُردو کو مدد ملی اور اُردو میں معنی، مطلب اور
ادبی چٹخاروں سے معلومات عامہ کے کام میں جان پڑی۔ مدرسہ
کی نگرانی کا کام بدستور کرتا رہا

حسب معمول "میلاد النبی" "محمد علی ٹرافی" اور "ششم کی
الوداعی پارٹی" کے جلسے ہوئے البتہ اس سال کی ایک نئی اور
خاص چیز مدرسہ ابتدائی کے طلبا کے سرپرستوں اور جامعہ کے استادوں
کا جلسہ تھا جسے "یوم والدین" کہتے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ استاد
سرپرستوں کو یہ سمجھائیں کہ ہم لڑکوں کو کس طرح سمجھدار اور کام کا
آدمی بنا رہے ہیں اس کام میں کون کون سی دشواریاں پیش آرہی
ہیں اس کے لئے والدین کس طرح مدد کر سکتے ہیں پھر استاد یہ بھی معلوم
کرتے ہیں کہ سرپرست ہمارے کام سے کس حد تک مطمئن ہیں
وہ کیا چاہتے ہیں اگر بددل ہیں تو ان کی یہ بددلی کس طرح

دور کی جا سکتی ہے اگر ٹھیک سمجھتے ہیں تو ان کے لیے ہم اور
کیا کرنا چاہتے ہیں، سرپرستوں کی طرف سے کچھ لوگ ان باتوں
پر روشنی ڈالتے ہیں پھر مل جل کر کھانے پینے میں حصہ لیتے
ہیں۔مطلب یہ ہے کہ بچوں کو ٹھیک ٹھاک کرنے کا کام اکیلے
اُستادوں کا نہیں بلکہ ماں باپ بھی ہمارا ہاتھ بٹائیں یہ سب
باتیں اس جلسہ میں ہوئیں حاضری تھوڑی تھی وجہ ظاہر ہے
اِن چیزوں کا رواج ہوتے ہوتے ہوتا ہے پھر ہمارے سرپرست
کچھ مالدار نہیں ہیں بہت سا وقت گھر بار کی فکر میں گزرجاتا ہے
جامعہ بھی اس کام میں ذرا یوں ڈھیل دے رہی ہے کہ اور
ضروری باتوں کی طرف سے دم لینے کا موقع ملے، تو پھر
انشاءاللہ ہر سال جامعہ کی سالگرہ کے موقع پر ایسا پروگرام
رکھا جائے گا کہ سرپرستوں کے لیے کئی لحاظ سے مفید ہو تفریح
ہو جائے اور دہلی کی سیر بھی۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو یعنی جس سال
کی یہ کہانی لکھ رہا ہوں تین دن کا ایسا ہی پروگرام بنایا گیا تھا
طلبار قدیم کا جلسہ بھی ہوا تھا میں جب خیال کرتا ہوں کہ ہمارے
لڑکے آگے چل کر " طلبائے قدیم" کہلائیں گے پھر یہی لوگ
اُس زمانہ کے جامعہ کے لڑکوں کے والدین ہو جائیں گے اور

جامعہ کے سرپرست بھی، تو پھر ہمارے بہت سے کام ایک ہی
دفعہ کے پروگرام میں بڑی آسانی سے انجام پا جائیں گے سال
میں ایک دفعہ دہلی کی سیر مشکل نہیں ہے خصوصاً ایسے زمانے
میں جب کہ سردیوں کا آغاز ہو۔ نمونے کے طور پر اس سال کے
جلسہ کا حال سرسری طور پر بیان کرتا ہوں۔ کہانی لمبی ہوتی جا رہی
ہے لیکن اس کا ذکر نہ کیا تو تمہیں بھی خیال ہوگا کہ جلدی کے مارے
ایک اچھی چیز چھوڑ گیا

سنہ ۱۹۳۳ء کا یوم تاسیس

پہلا دن :- ۲۸ / اکتوبر کو مغرب کے بعد مسٹر آصف علی
بیرسٹر کی صدارت میں تعلیم بالغان کا جلسہ ہوا ، حامد علی صاحب
ندوی نے سال بھر کی رپورٹ سنائی اس کے بعد ڈاکٹر ظفریاب صاحب
نے حفظان صحت کے اصولوں پر لکچر دیا ملیریا کا فلم دکھایا اور
ساتھ ہی ساتھ سمجھایا بھی

دوسرا دن :- ۲۹ / اکتوبر کی صبح یوم تاسیس کا جلسہ
ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ کی صدارت میں ہوا
اسد ملتانی اور صفی لکھنوی کی دو ایک نظموں کے بعد شیخ الجامعہ صاحب
نے رپورٹ سنائی پھر مدرسہ ابتدائی کی طرف سے حسب معمول

یہاں کے ایک لڑکے آفتاب احمد ابتدائی ششم نے اپنی رپورٹ سُنائی، حیدر آباد کی امداد دوبارہ جاری ہونے کا اعلان ہوا، نمائش کا افتتاح ہوتے پر لوگوں نے جامعہ کے لڑکوں کا کام غور سے دیکھا۔ اسی دن شام کو اُردو اکادمی کی طرف سے شاندار مشاعرہ ہوا۔ دہلی کے شعراء کے علاوہ جن میں اِس مرتبہ بیخود کا اضافہ ہو گیا تھا صفی، ثاقب، ظریف، حسرت، جگر، بیدل، فہمی موجود تھے ہماری جامعہ کے شاعر مومن مرحوم تو انتظام میں حصہ لے ہی رہے تھے۔ بچوں کا مشاعرہ ہوئے چند دن ہوئے تھے لوگوں نے کہا ایک نمونہ یہاں کے اسٹیج پر بھی آجائے۔ احمد بن سالم نے اس دلکش آواز میں گایا کہ لوگوں کو سکتہ کا پتہ ہی نہ چلنے دیا اسٹیج پر بیٹھے ہوئے شاعروں نے جب داد دی تو احمد نے بھی اُن کو جھک جھک کر سلام کیا پھر تو بڑے شاعروں کی باری آئی اور رات کے ڈیڑھ بجے تک محفل گرم رہی

تیسرا دن۔ ۳۰ر اکتوبر کی صبح کو جامعہ کے قدیم طلباء کا جلسہ ہوا قواعد و ضوابط پر نظر ثانی ہوئی نئے عہدیداروں کا انتخاب ہوا پہلے برکت علی صاحب ناظم تھے اس دفعہ حامد علی خاں صاحب مقرر ہوئے

شام کو بیگم انصاری کی صدارت میں عورتوں کا جلسہ ہوا
بیگم آصف علی نے جامعہ کے مقاصد پر تقریر کی اور ایک فلم
بچوں کی پرورش کے بارے میں دکھایا گیا آپا جان بہت خوش تھیں
کہ پہلی ہی کوشش میں چار پانچ سو عورتوں نے حصہ لیا انتظام
کے لئے مدرسہ ابتدائی کے لڑکے تھے مرد بھی اس وقت بے کار
نہ رہے ایک خاص پروگرام کے تحت اوکھلا گئے ذاکر صاحب نے
جامعہ کی زمین دکھلائی، حد بندی کے لئے جھنڈیاں لگا دی گئی
تھیں پہلی دفعہ اس زمین پر چائے پینے میں کتنا لطف آیا۔ جامعہ کے
استاد جو ہمیشہ مصیبت میں رہتے ہیں انھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے
خواب دیکھ رہے ہوں زمین خرید لی گئی !! یہاں چائے ہو رہی ہے!!!
!!! ثاقب لکھنوی کئی سال سے جامعہ کے مشاعروں میں شریک
ہونے کی وجہ سے یہاں کے استادوں کی دلی حالت سے واقف
ہو گئے تھے غالباً اسی اثر نے ان سے یہ شعر اسی جگہ کہلوایا

مکاں منعم کا سونے سے یہ خونِ دل سے بنتا ہے
خس و خاشاک کا یہ گھر بڑی مشکل سے بنتا ہے

مغرب کے بعد لوٹے، کھایا پیا۔ رات کو جلسہ میں شرکت
کی جس میں مولانا احمد سعید صاحب نے بتلایا کہ "مسلمانوں کی

بھلائی مذہب کی باتوں پر پابند رہنے سے ہے"

یہ تھا ۱۹۳۳ء کا تاسیس کا پروگرام شاید تم میں سے کوئی پوچھے ڈراما!!! تو بھائی کاموں کی اس بھیڑ بھاڑ میں مجیب صاحب سے چوک ہوگئی اور مجھ سے بھی، کسی نے کوئی ڈراما نہیں کرایا البتہ عید کے دن مجیب صاحب نے اپنا تازہ لکھا ہوا ڈراما "انجام" کرایا، نبی احمد صاحب کو شروع ہی سے ڈراموں سے دلچسپی رہی ہے انھوں نے "سادہ لوح" لڑکے کا کام بڑی خوشی سے لیا اور لوگوں کو ہنسایا

محمد مجیب صاحب شور و شغب اور ہنگاموں سے دور ایک کونے میں بیٹھے کچھ نہ کچھ ٹھوس کام کرتے رہنا پسند کرتے ہیں دنیا کی تاریخ پر نظر ہے سیاست کے ہتھکنڈوں سے واقف ہیں باوجود اس کے ان میں دلچسپی نہیں لیتے، انسان کی نجات اسی میں سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی جگہ خلوص سے کچھ کرتا رہے اور بس ان کے دونوں ڈرامے کھیتی اور انجام میں یہی جھلک پائی جاتی ہے۔ مجیب صاحب کو پھول پھلواری کا شوق بھی ہے۔ فرصت کا وقت اس دلچسپ مشغلے میں گزارتے ہیں

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ آخر مدرسہ ابتدائی والوں نے بھی

کسی موقع پر ڈراما کھیلا یا نہیں! بھائی میں نے ایک ڈراما "محنت" لکھا تو ضرور ہے لیکن یوم تاسیس اور عید کا موقع نکل گیا تھا اس لئے اس کے کھیلے جانے کی طرف دھیان ہی نہ دیا

اس ڈرامے کے لکھے جانے کا سبب بھی دلچسپ ہے یعنی میں نے اپنے پچھلے کاموں پر ایک نظر جو ڈالی تو جی چاہا کہ ان سے ایک ڈرامے کا پلاٹ (کہانی) نکال لوں۔ فرصت نہیں تھی اس لئے روا روی میں جتنا بن پڑا لکھ لیا

بنک و دکان کے لئے تو یہ سال "انقلابی سال" کی حیثیت رکھتا ہے پچھلے سال تک بازار کے چھپے ہوئے رجسٹر فارم وغیرہ استعمال کئے جاتے تھے لیکن اب اپنے نمونے طبع کرانے کی ہمت ہوگئی تھی، کھاتے، کیش بک فارم وغیرہ سب کچھ اپنے چھپوا لیے گئے ان نئی نئی چیزوں کو دیکھ کر ہر شخص کا دل چاہتا تھا کہ حساب کھلوائے اِدھر کارکنوں کی طرف سے اعلان ہوگیا تھا کہ بنک کی تحویل میں پانچ سو روپے ہونے پر ایک خاص جشن منایا جائے گا جس میں بنک کا دستور باقاعدہ منظور ہوگا ایک مہینے کی کوشش نے تحویل کو پانچ سو سے بھی زیادہ کر دیا چنانچہ ۲۱ر فروری ۱۹۳۴ء کو خاص جشن منایا گیا جس میں بنک کا جدید دستور منظور ہوا اس جلسہ
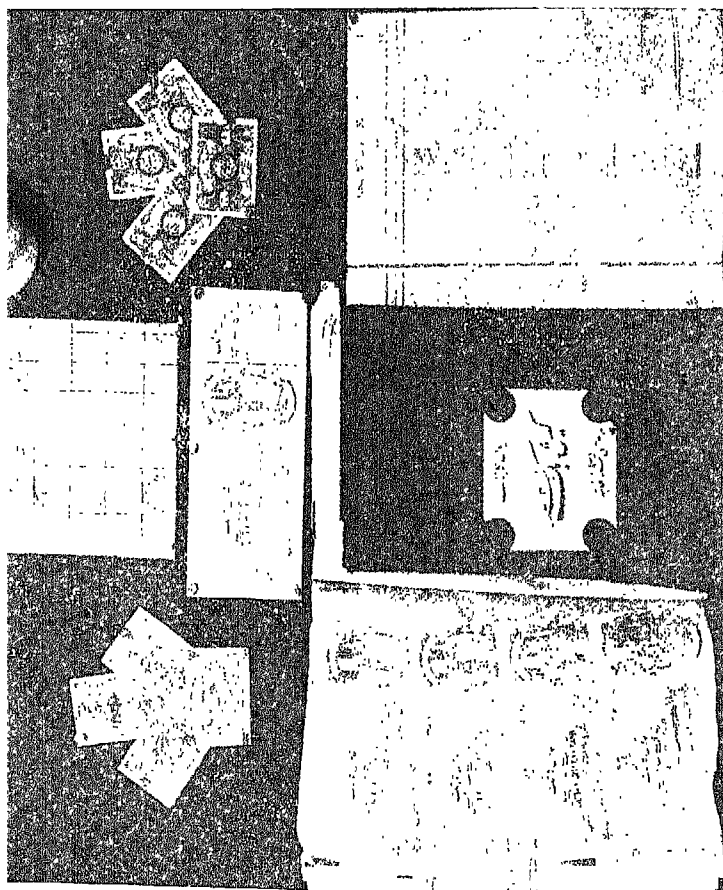
کی خاص بات یہ تھی کہ ہر رُکن کے پاس بنک کی پاس بُک موجود
تھی جب دستور کی منظوری کے لئے صدر صاحب نے رائے لی
تو سب نے اپنی اپنی پاس بُک لئے ہوئے ہاتھ اٹھائے اوّل
اور دوم والوں نے بھی ایسا ہی کیا اس وقت کا منظر دیکھنے کے
قابل تھا اوّل تو مدرسہ ابتدائی کا ہر لڑکا اس جلسہ میں موجود
تھا پھر شاید ہی کوئی لڑکا ایسا ہو جس کے پاس "پاس بُک" نہ ہو
ان چھوٹی چھوٹی کتابوں نے لڑکوں کے سروں کو ڈھک لیا
تھا جامعہ کے سب اُستاد اس جلسہ میں شریک تھے اس انقلابی
سال میں نوٹوں کا اجرا بھی خاص چیز ہے اب لوگ بنک کے
پُرزوں پر بھی ایسا ہی اعتبار کرنے لگے تھے جیسے سونے چاندی
کے سکوں پر چنانچہ ایک پیسے والے اور ایک آنے والے نوٹ
جاری کیے گئے۔ دفتر جامعہ، مکتبہ، بچوں کی دُکان، خوانچہ
اور بعض منظور شدہ دُکانوں پر ان کا لین دین بغیر کسی رکاوٹ
کے ہونے لگا سال کے آخر میں بنک کی تحویل (۱۱۷ روپے
۱۰ آنے ۹ پائی) تھی۔ حسب معمول پچھلے تین سالوں کی طرح
۳۰ اپریل کو چوتھے سالانہ جلسے میں ۲۵ فیصدی کے حساب سے
منافع تقسیم کیا گیا۔ ششم کی الوداعی پارٹی بھی اسی موقع پر

ہوئی اور مدرسہ کی سالانہ تصویر لی گئی

ہفتہ میں ایک گھنٹہ (جمعرات کے دن) اس بات کے لئے
مقرر کر دیا گیا تھا کہ اس گھنٹہ میں کوئی اُستاد جماعتوں میں نہ رہے گا
بلکہ پورا مدرسہ لڑکوں پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ اپنی اپنی جماعتوں
میں اپنی پسند کا کام کیا کریں لڑکوں نے اس کام میں بھی دلچسپی لی
اس طرح استادوں کو یقین ہو گیا کہ اگر کسی ضرورت سے سب اُستاد
کہیں چلے جائیں تو لڑکے مدرسہ کا کام جاری رکھ سکتے ہیں

لڑکے اب تک گھروں کو جو خطوط بھیجا کرتے تھے ان میں
بے ترتیبی تھی کوئی لڑکا مہینہ میں کئی خط بھیجتا کوئی اس کی پروا ہی
نہ کرتا نتیجہ یہ تھا کہ بعض سرپرست خطوط زیادہ لکھے جانے کی
شکایت کرتے بعض یہ طعنہ دیتے کہ " معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے
صاحبزادے کو جامعہ سے اتنی محبت ہو گئی ہے کہ والدین کی فکر ہی
نہیں " ذاکر صاحب اکثر صورتوں میں ایک بات کا حل پہلے سے
سوچ لیتے ہیں پھر وہ بات استادوں کے سامنے سوال کی صورت
میں رکھ دیتے ہیں اگر کوئی جواب بتا دے تو ٹھیک ہے ورنہ
اس کا حل خود ہی بتلا دیتے ہیں ۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے لڑکوں
کے خطوط میں بڑی گڑبڑ رہتی ہے اسے بھی قابو میں کر لیجئے

پھر منتظر تھے کہ میں اس کا جواب دوں۔ میں نے کہا "اس کا علاج آسان ہے مہینہ میں دو تاریخیں مقرر کر لیں گے پھر شکایت نہ رہے گی"۔ کہنے لگے "ہاں ایسا ہی کر لیجئے" اس وقت سے یہ معمول چلا آ رہا ہے کہ ہر مہینہ کی ۱۴ ، اور ۲۹ ، تاریخ کو ہر ایک جماعت میں خطوط لکھائے جاتے ہیں جس میں پچھلے پندرہ دن کے وہ واقعات بھی درج ہوتے ہیں جو مدرسہ اور اقامت گاہ کی زندگی میں پیش آئے ہوں اُستاد اصلاح دیتے ہیں پھر اتالیق صاحبان ۱۵ ، اور ۳۰ ، تاریخ کی ڈاک سے یہ خطوط لڑکوں کے سرپرستوں کے پاس بھیج دیتے ہیں ایک دفعہ یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ کوئی لڑکا کسی وقت راز کی بات گھر بھیجنا چاہے اور استاد کو نہ دکھانا چاہے تو کیا صورت ہو میں نے یہی جواب دیا کہ استادوں کو اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسا رویہ رکھنا چاہیئے کہ شاگرد اپنے اُستاد سے کوئی بات چھپائے نہیں اگر کسی وقت ایسا کرنا ضروری ہو تو لڑکا اپنا خط بند کرکے استاد کو دے دے اور استاد کو چاہیئے کہ وہ خط نہ پڑھے لیکن مجھے تو لڑکے راز کی بات خود ہی بتلا دیتے ہیں بلکہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ " ذرا اس خط کو غور سے پڑھ لیجئے " میں بھی ان کے بھید کی بات دوسروں سے نہیں کہتا ہوں بلکہ شکایت دور کرا دیتا

ہوں جب سالہا سال تک ایک جگہ رہنا ہے اور سیکھنا ہے تو میل ملاپ کی باتیں رکھنی چاہئیں خطوط نویسی کا یہ کام دلچسپی اور توجہ کے ساتھ ہوتا ہے اور نصاب کے مطابق درجہ بدرجہ اس کی سب چیزیں لڑکے سیکھتے رہتے ہیں

لڑکوں کے لئے ایک اور مگر سب سے دلچسپ چیز "خطرہ کی گھنٹی" تھی ذاکر صاحب کی تجویز کے مطابق خاص طرح کی گھنٹی خرید لی گئی تھی اور طلبار کو سمجھا دیا گیا تھا کہ فرض کرو کسی فوری اور اچانک ضرورت سے ذرا سی دیر میں تمام لڑکوں کو ایک خاص جگہ جمع کرنا چاہتے ہیں ایسی صورت میں لڑکوں کو جماعتوں سے بھاگ کر کسی خاص جگہ جمع ہونے میں دشواریاں پیش آسکتی ہیں مثلاً ایک ہی دفعہ میں بہت سے لڑکوں کا دروازہ سے نکلنا، پیروں میں جوتے نہ ہونے کی وجہ سے کانٹوں کا چبھنا، تنگ راستے سے گزرنا ناممکن ہے اس وقت سخت بارش ہورہی ہو یا سخت دھوپ چمک رہی ہو یا سردی زوروں پر ہو ان دشواریوں پر قابو پانے کے لئے موقع موقع سے مشق کی جائے گی جس وقت گھنٹی بجے لڑکے جس حال میں جہاں بھی ہوں فلاں فلاں راستوں سے گزر کر مقررہ جگہ پر پہنچ جائیں اور جس قدر تیزی کے ساتھ وہ بھاگ سکتے ہیں

بھاگیں لیکن اس بات کا خیال بھی رکھیں کہ بھاگنے والے ساتھیوں کو ان کی تیزی کی وجہ سے نقصان نہ پہنچے جس وقت اس گھنٹی کے فائدے میں لڑکوں کو سمجھا رہا تھا بعض کہنے لگے "آپ یہ فائدے بعد میں بتائیے گا پہلے کروائیے تو سہی"

اس گھنٹی کا استعمال ہوئے جب کئی دن گزر جاتے تو لڑکے مجھ سے کہتے "دیکھئے نا فرض کیجئے کوئی مصیبت، بہت دنوں سے گھنٹی کی مشق نہیں ہوئی ہے ہم لوگ کیسے بھاگ سکیں گے" گویا گھنٹی کے شوق میں میرا پڑھایا ہوا سبق مجھ ہی کو پڑھاتے تھے !!

موگا سے عبدالواحد صاحب کی واپسی پر عبدالخالق صاحب کو تعلیم پانے کے لئے بھیجا گیا۔ پکے اُستادوں کی تعداد کافی ہوگئی تھی اس لئے تقریباً ہر ایک جماعت کا کام "کلاس ٹیچر سسٹم" پر ہونے لگا یعنی ایک جماعت میں ایک ہی اُستاد کے گھنٹے زیادہ رکھے گئے اس طرح اُستاد اور لڑکے دونوں کو زیادہ کام کرنے کا موقع ملنے لگا

اسی سال سے پتاشوں کی تقسیم کا رواج بھی ہوا۔ سالانہ امتحان کا نتیجہ سُنانے میں یہی کافی دلچسپی ہے کہ طلبا ترقی پاکر اُسی وقت اگلی جماعتوں میں چلے جاتے ہیں البتہ ششماہی امتحان

کا نتیجہ روکھا پھیکا رہتا تھا یہ ترکیب سوچی کہ درمیانی سائز کے
بہت سارے بتاشے منگوائے جو لڑکا جتنے مضمونوں میں کامیاب
ہوتا اتنے ہی بتاشے دے دئے جاتے تمام مضمونوں میں ناکام
ہونے والا شاید ہی کوئی لڑکا نکل آتا اس لئے سب کے منھ
میٹھے ہو جاتے جن کے بتاشے کم ہوتے وہ منھ بنا کر چپکے چپکے
سے کھا لیتے البتہ زیادہ بتاشے پانے والے ادھر ادھر گھوم
کر اپنے اپنے بتاشوں کی تعداد بتاتے یہ تقریب بھی اہتمام
کے ساتھ ہوئی تھی

اسی سال کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب بھی اس تقریب
میں شریک تھے اتنے میں ایک منحوس پرچہ انھیں ملا کہ ان کی چھوٹی
بچی ریحانہ (جو کئی دن سے بیمار تھی) بہت نازک حالت میں ہے
فوراً بلایا ہے۔ تقریب ختم ہونے میں تھوڑی دیر تھی یہ اس انتظار
میں تھے کہ جلسہ ختم ہونے پر ہی جاؤں اتنے میں دوسری خبر آئی
کہ بچی کا انتقال ہو گیا ہے۔ پھر تو ڈاکٹر صاحب اطمینان سے بیٹھ گئے
اور اس واقعہ کی خبر کسی کو نہ دی جب لڑکے گھروں کو چلے گئے تب
ہم لوگوں کو انتقال کی خبر معلوم ہوئی مدرسے کے کاموں میں تو
ڈاکٹر صاحب کو اپنے گھر بار کی فکر ہی نہیں رہتی ہے نازک معاملات

کے لیے تو میں نہیں کہتا البتہ عام باتوں کے لیے گھر بار کے کاروبار
میں پھنسے رہنے کو میں بھی اچھا نہیں سمجھتا ہوں۔ اگر گھر والی اپنا
انتظام آپ نہیں کرسکتی ہے تو بے شک وہ تکلیف اُٹھائے۔
اس طرح اس کی بھی اصلاح ہوجائے گی

جامعہ کے استادوں کی دو طرح کی انجمنیں ہیں ایک تو "اسٹاف
کلب" یہ تمام استادوں کے لیے ہے اس میں اخبارات، کھیل کود
کا انتظام سیر و تفریح کا پروگرام اور دعوتوں کی چہل پہل رہتی ہے
دوسرے "انجمن اساتذہ" کے نام سے ہر منزل کے اُستادوں کی
الگ الگ انجمنیں ہیں اس میں مدرسہ کے معاملات دستورالعمل کی
تبدیلیاں نصاب کا معاملہ پڑھنے پڑھانے کے طریقوں پر گفتگو
ہوتی رہتی ہے اس انجمن کی حیثیت مدرسے کے کاموں میں مشورہ
دینے والی جماعت کی ہے دوسری قسم کی انجمن کی ابتدا مدرسہ ابتدائی
سے ہوئی اور اسی سال سے اس کی کاروائیاں باقاعدہ رکھی جانے
لگیں ویسے بے قاعدہ طور پر ۱۹۳۰ء سے اس کا کام شروع ہوگیا تھا

پنجم جماعت میں طلبار کی تعداد پچاس سے اوپر ہونے کی
وجہ سے اس کے دو فریق کرنے پڑے کہنے کو تو یہ چھوٹا سا واقعہ
ہے مگر اس کی اہمیت تو یہ ہے کہ جامعہ کو یہ کام پہلی دفعہ اسی

سال کرنا پڑا دوسرے یہ کہ ابتدائی چھ جماعتوں کے بچے
سال بسال بڑھتے جا رہے تھے گویا اس مدرسہ کا کام کرنے کا
نہج اس کی دلچسپیاں اس کی خصوصیات لڑکوں اور سرپرستوں
کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اس وقت ہمیں اس کا یقین ہوگیا کہ پڑھانے
کے لئے لڑکے بہت سے مل سکتے ہیں بس دو چیزوں پر دھیان
دینے کی ضرورت ہے ایک تو اپنی عمارتیں دوسرے ہمارا جوش
اور لگن ایک اندازہ یہ بھی ہوا کہ ہمارا کام ٹھیک ہو تو ہم سرپرستوں
کو اپنی طرف اسی طرح کھینچ سکتے ہیں جس طرح مقناطیس لوہے کو
اللہ میاں نے ایسے ایسے قانون بھی بنا رکھے ہیں

ایک موقع پر ڈاکٹر صاحب نے مولوی عبدالحق صاحب
کو تمام مدرسہ کا معائنہ کرانے کے بعد فرمایا " یہ مدرسہ بیمار
چلا رہا ہے" مولوی صاحب مجھے جانتے ہیں کہنے لگے " آپ نے
غلط اندازہ لگایا ہے اس میں بیماری کے جراثیم اتنے نہیں ہیں
جتنے تعلیم کے"

دو باتیں اور ہیں جس کی وجہ سے میں زندہ ہوں ایک تو
لڑکوں کا خوش رہنا اور خوش رکھنا دوسرے کچھ نہ کچھ کرتے
رہنے کا شوق

ایک طرف تو استاد اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے دوسری طرف ان کا خیال رکھنے والوں نے دو طرح کے گریڈ بنا دیئے ایک تو (۲۵ تا ۴۵) یعنی شروع میں پچیس روپئے۔ ہوتے ہوتے پینتالیس روپئے ، یہ اُن استادوں کو دیئے جانے لگے جو میٹرک کامیاب ہوں دوسرے (۴۰ تا ۶۵) کا گریڈ۔ یہ بی۔اے والوں کے لئے رکھا گیا مگر جامعہ سند سے زیادہ کام کا خیال رکھتی ہے اس لئے اگرچہ میرے پاس فقط مڈل کا امتحان کامیاب ہونے کی سند ہے مگر مجھے بی۔اے والوں کی برابر یعنی ۴۰ تا ۶۵ کا گریڈ دیا گیا اور ابتدائی تنخواہ بھی چالیس کی بجائے پینتالیس کر دی گئی

اُردو اکادمی نے پھر ایک دفعہ بحث کی محفل گرم کی جلسہ کے صدر نیشنل کال کے مُدیر جے این ساہنی تھے دہلی کے مشہور قومی کارکن مسٹر آصف علی صاحب بیرسٹر نے تجویز پیش کی کہ "موجودہ حالت میں قومی آدمیوں کو چاہیئے کہ لوگوں کی طرف سے نمائندہ ہو کر سرکاری اسمبلیوں میں چلے جائیں اور وہاں بحث میں حصہ لیں" نورالدین صاحب بیرسٹر نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ تو خوشامد کرنا ہوا ،

ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب اور سید محمد صاحب ٹونکی نے تائید میں اور ہمارے شفیق صاحب، فریدالحق صاحب انصاری، خواجہ احمد عباس صاحب نے مخالفت میں تقریریں کیں صدر صاحب نے کہا " برطانیہ والوں کا کچھ ٹھیک نہیں ہے ۱۹۳۵ء کا جو نیا قانون بننے والا ہے اسے دیکھنے کے بعد فیصلہ کرنا چاہیئے" چار سو کے قریب آدمی چار گھنٹے تک تقریروں کو سنتے رہے اور آدھی رات گئے سنسان گلیوں میں شور کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹے

یہ تو ہوا بحث سے متعلق عام جلسہ مگر ایک ایسی ہی بحث جامعہ کے اُستادوں میں ہو پڑی اسے ہم لوگ " تاریخی بحث " کے نام سے یاد کرتے ہیں برکت صاحب کو بیٹھے بیٹھے کوئی نہ کوئی بات سوجھتی رہتی ہے مجھ سے ایک دن کہنے لگے " میں اُستادوں کے جلسے میں ایک بحث چھیڑنا چاہتا ہوں مضمون یہ ہوگا کہ " جامعہ میں تعلیم کی بنیاد اسلامی باتوں پر نہیں ہے " کیا آپ اس کی مخالفت کریں گے ؟ میرے سامنے مدرسہ ابتدائی کے لڑکوں کا کام تھا میں نے کہا " جناب مخالفت کروں گا اور ضرور کروں گا " کہنے لگے " اچھا اچھا جوش میں کیوں آتے ہو اعلان کئے دیتا ہوں سب

باتیں سامنے آجائیں گی" برکت صاحب کی نیت یہ تھی کہ ثانوی اور کلیّہ کے نظام میں بھی ہلچل مچ جائے خیر صاحب ۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو پہلا جلسہ ہوا برکت صاحب نے اپنی تمام بھڑاس نکال لی پھر مخالفت کے لئے میری باری آئی تقریر کرنے کے لئے جوں ہی میں اُٹھا احراری صاحب فرمانے لگے "قطع کلام جناب صدر" مطلب یہ کہ صدر صاحب پہلے احراری صاحب کی ایک بات سُنیں صدر ذاکر صاحب تھے کہنے لگے "فرمائیے"!! احراری صاحب نے کہا "آج کے موضوع پر بحث کرنا اس وقت آسان رہے گا جب یہ معلوم ہو جائے کہ جامعہ کا مقصد کیا ہے؟" ذاکر صاحب نے کہا کہ "لوگوں کو اس کا پہلے سے علم نہیں تھا کہ موضوع اس طرح یکایک پلٹا کھائے گا" اور میری طرف دیکھتے ہوئے فرمانے لگے کہ "خیال ہے کہ جناب مخالف اس کے لئے تیار نہ ہوں گے" میں نے جھٹ سے کہا "جی ہاں بالکل تیار نہیں ہوں" اس پر احراری صاحب فرمانے "میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے حاضر ہوں" صدر صاحب میری طرف دیکھ کر کہنے لگے "کیا آپ اس سے متفق ہیں؟" میں نے کہا "بالکل متفق ہوں" پھر کیا تھا لوگوں نے تالی بجا دی اور احراری صاحب نے

تقریر شروع کی جس مجلس میں برکت صاحب بولیں وہاں
احراری صاحب کو بولنے میں لطف آتا ہے" پھر یہ جرمنی سے عربی کی
ڈگری لے کر حال ہی میں آئے تھے دل کھول کر ایک دن نہیں دو
دن تک (میرا مطلب ہے دو جلسوں میں) تقریر کرتے رہے
یہ تیسرے دن بھی بولنے کے لئے تیار رہتے لیکن صدر نے اجازت
نہ دی ان کی تقریر سے اتنا ہوا کہ لوگوں کی دلچسپی بڑھ گئی اور یہ
بات طے پائی کہ پہلے ہر ایک اُستاد یہ بتائے کہ وہ اپنے نزدیک جامعہ
کا مقصد کیا سمجھتا ہے پھر کیا تھا تقریروں کا سلسلہ بندھ گیا جلسہ ختم
ہونے کے بعد قرعہ اندازی ہوتی تھی کہ آئندہ کون بولے گا ایک
جلسہ میں صرف ایک ہی استاد کے بولنے کے لئے وقت ملتا تھا،
بالترتیب سعید انصاری صاحب، عبدالحمید صاحب زبیری (یہ بھی
ڈاکٹر ہو کر آئے تھے) پروفیسر محمد مجیب صاحب، سعید انصاری صاحب
مولانا فضل الرحمٰن صاحب، سید نذیر نیازی صاحب، ڈاکٹر
سید عابد حسین صاحب سید شرف الدین صاحب علی احمد صاحب
اور سب سے آخر میں ۲۱ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب
نے اپنی تقریر پر بحث کو ختم کیا گویا کم و بیش سوا دو مہینے تک بارہ
اُستادوں نے تقریریں کیں ہر تقریر کے آخر میں ان خیالات پر

گفتگو یا بحث ہوتی تھی' لطف یہ ہے کہ میری تقریر کی کہیں نوبت ہی نہ آئی۔ وقت پر جلسوں کا انتظام کرنا لمبی لمبی رودادیں لکھنا ناظم صاحب کا انھیں سُنانا حاضرین کا صبر کے ساتھ سُننا یہ سب کچھ برکت علی صاحب کی وجہ سے ہوا، جو ان جلسوں کے ناظم تھے

۶ ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا " میرے نزدیک جامعہ ایک اسلامی ادارہ ہے جس کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم ہے

اس تعلیم کی بنیاد دینِ اسلام اور تمدنِ اسلام ہے

دینِ اسلام سے مراد وہ دین ہے جو غیراللہ کی عبادت سے نجات دلاتا ہے ایک خدا کی عبادت کا پابند کرتا ہے اور اس طرح ایک عالمگیر برادری کی بنیاد ڈالتا ہے

تمدنِ اسلام سے مراد وہ روایات ہیں جو آنحضرتؐ نے نمونے کے طور پر ہمارے لئے قائم کی ہیں ماحول کی رعایت سے اس بڑے مقصد میں چند اور مقاصد بھی شامل ہو جاتے ہیں وہ یہ ہیں :۔

آزادی کی خواہش | یہ وطن کی پوجا کے لئے

نہیں بلکہ غیر اللہ سے ہٹ کر اللہ کی طرف راغب ہونے کے لئے
اُردو کی خدمت :۔ وہ اُردو جیسے مسلمانوں کا انصاف
پسند طبقہ قائم رکھنا اور پھیلانا چاہتا ہے
خلاصہ یہ کہ جامعہ کے کام کی بنیاد اسلامی تعلیمات، آزادی
کی خواہش اور اردو کی خدمت ہے
بحث والے جلسوں میں جو دیر تک ہوتے رہتے ہیں اگر
تھوڑی بہت چھیڑ چھاڑ نہ چلی جائے تو دلچسپی قائم نہیں رہتی ہے
اس لئے ہماری ان محفلوں میں سنجیدگی بھی تھی چھیڑ چھاڑ بھی،
واہ واہ کی داد تھی اور پھبتیوں کی گونج بھی۔ صدر صاحب کی
درخواست تھی اور ڈانٹ ڈپٹ بھی لوگوں کے اعتراضات صدر
کی چشم پوشی لوگوں کا ہنسنا بُرا ماننا ٹال دینا غرض کہ سب چیزیں
تھیں بس اس کا خیال رکھتے تھے کہ کارروائی میں بھونڈا پن نہ آنے
پائے یعنی کوئی بات بے موقع نہ ہو جائے زمانہ گزرنے پر
اِن چیزوں کی یاد ایک لطف پیدا کرتی ہے اس لئے لکھنے کو
جی چاہا
اس سال کے مہمانوں میں ڈاکٹر بہجت وہبی، سر اکبر حیدری
نواب ذوالقدر جنگ بہادر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ بہجت وہبی

ترکی کے مشہور عالم ہیں آپ نے اسلام کے بارے میں چار تقریریں جامعہ میں کیں۔ سر اکبر حیدری جامعہ کے خاص کرم فرماؤں میں سے ہیں

پچھلے دو سالوں میں مولوی عبدالحق صاحب (سکریٹری انجمن ترقی) مولوی عبدالماجد دریابادی، مولوی محمد محی الدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج اورنگ آباد (دکن)، محمد حسین صاحب انسپکٹر لاہور اللہ رکھا صاحب ڈپٹی انسپکٹر لاہور، ماسٹر لبھو ل صاحب موگا، نے مدرسہ کا تفصیلی معائنہ کرکے "کتاب الرائے" میں اپنی رائیں اچھی اچھی لکھیں کہانی لمبی ہوگئی ہے ورنہ ان لوگوں کے خیالات بھی تمہارے سامنے رکھتا

مکتبہ کی حالت بھی پہلے ایسی ہی تھی جیسے ۱۹۳۰ء سے پہلے چھوٹی جماعتوں کی۔ دو چار آنے کی منظوری کے لئے دفتر جامعہ سے منظوری لینی پڑتی تھی حامد علی خاں صاحب ۱۹۲۶ء میں جامعہ سے بی۔ اے میں کامیاب ہونے کے بعد پہلے تو اپنا گزارہ ٹیوشن پر کرتے رہے پھر مکتبہ کے کام میں لگا دیئے گئے ان سے کبھی نچلا نہیں بیٹھا جاتا ہے، کچھ نہ کچھ سوچتے گئے، کرتے گئے۔ خود تو کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی مگر دنیا بھر کے لوگوں سے سینکڑوں کتابیں لکھوا ڈالیں

ابتدائی لڑکوں کی کتابوں سے، اس لئے برکت بھی ہوئی اگر
شروع ہی میں افلاطون کی کتاب چھپوا دیتے تو دیوالہ نکل جاتا
امید تو یہی ہے کہ بچوں کی کتابیں لکھوانے کا کام جاری رکھیں گے
اس لئے کہ آگے چل کر یہی بچے پڑھے ہوں گے اور کتابیں پڑھنے
کا شوق قائم رہے گا۔ اب لوگ بچوں کی قدر سمجھنے لگے ہیں
یہ سمجھے بغیر والدین اور اُستادوں کے کام ادھورے رہ جائیں گے
حامد صاحب جیسے اولوالعزم شخص کے لئے یہ کام مشکل نہیں ہے

لڑکو مکتبہ کی ترقی کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ جہاں پہلے
دو تین آدمی کھٹ کھٹ کرتے نظر آتے تھے جن میں سے ایک
حامد صاحب تھے وہاں اب بیسیوں آدمی دن رات کام میں
مصروف رہتے ہیں، میں سالہا سال سے یہ دیکھتا چلا آرہا ہوں
کہ حامد صاحب بھی ہارپر صاحب کی طرح سورج نکلنے سے دو گھنٹے
پہلے جاگ جاتے ہیں اور دفتر کے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں
میں یہاں یہ بات صاف کر دوں کہ ہر شخص کے لئے اندھیرے منہ
اُٹھ کر کام کرنا ضروری نہیں ہے بات اصل یہ ہے کہ جن لوگوں کا
کام اس قسم کا ہے کہ دن بھر لوگوں سے ملتے اور معاملات طے
کرنے کا کام کرتے رہتے ہیں وہ اپنے لئے اس وقت کو بہتر

مکتبہ کے انتظام میں بچوں کی کتابوں کے اچھے اچھے سر ورق
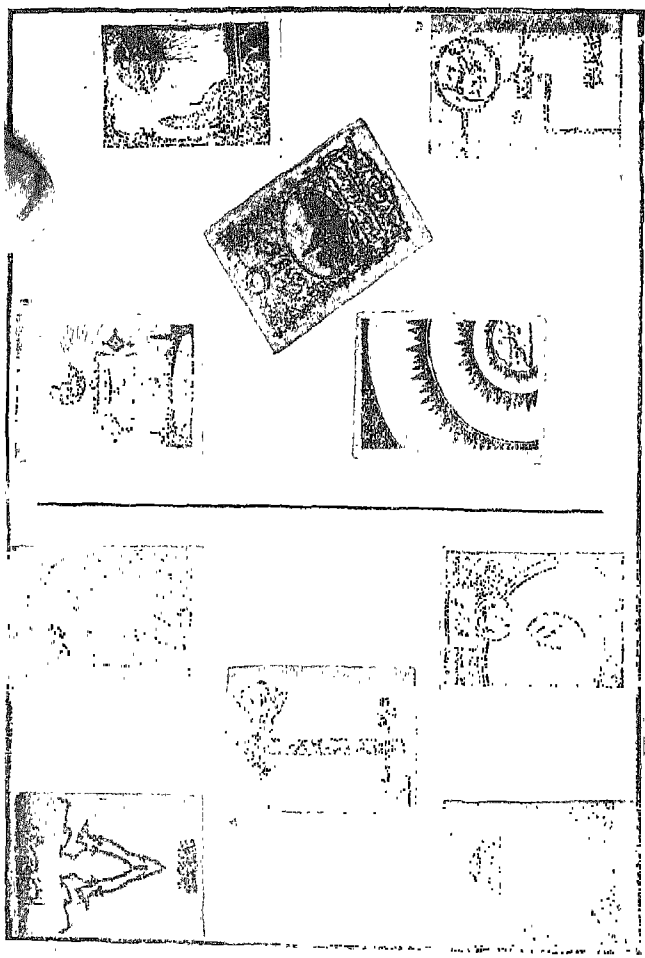
سمجھتے ہیں اب رہی تفریح تو وہ لوگوں سے ملنے ملانے سے ہوجاتی ہے

بس اب دو تین باتیں اور لکھ کر اس سال کی کہانی کو ختم کریں "آپ بیتی" تو اتنا وسیع مضمون ہے کہ جتنا خیال کرو کام اتنا ہی بڑھتا ہے

آئندہ سال کی تیاری کے لیے بھی کچھ کرنا چاہتا تھا سوچا کون سا کام ہو۔ خیال آیا کہ جب مدرسہ ابتدائی کے سب کام علٰحدہ سے ہورہے ہیں تو اس مدرسے کا "دستورالعمل" بھی علٰحدہ سے چھپنا چاہیئے لکھنے کی تو عادت ہے ہی بس اس کے لیے بھی ساٹھ صفحوں کی ایک چھوٹی سی کتاب لکھ ڈالی، دستورالعمل عام طور پر وہ لوگ دیکھتے ہیں جو پہلے سے یہ فیصلہ کرلیتے ہیں کہ ہمیں فلاں جگہ بچے کو بھیجنا ہے میں نے سوچا ایک دستورالعمل ایسا بھی تیار کردیں جسے پڑھ کر لوگ بچوں کو بھیجیں (۱۳۳۱ء میں ایک ایسی ہی کوشش حافظ صاحب نے کی تھی لیکن انھوں نے اس کام کو ڈیڑھ سو صفحوں تک پہنچا دیا تھا اور اس کی قیمت مقرر کردی تھی میں نے بہت مختصر لکھا تھا اس میں مدرسہ کا تخیل، طریقۂ تعلیم ذرائع تعلیم، نصاب (محض خاکہ) امتحانات اور جماعت بندی

داخلہ اور تعطیلات، اقامت گاہیں، اخراجات عام معلومات
ان سب چیزوں کے بارے میں صرف ضروری ضروری باتیں
لکھ دی تھیں آخر میں کتب درسیہ کا خلاصہ تھا پھر لوگوں کو یہ
دکھانے کے لیئے کہ یہ سب خیالی چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان پر عمل
بھی ہوتا ہے "ماہرین تعلیم" کی اس وقت تک کی رائیں بھی چھپادی
تھیں

جب میں "آپ بیتی" لکھنے لگا تو اس زمانہ کی "کتاب الرائے"
کی تلاش کی مگر معلوم ہوا کہ گم ہوگئی ہے پھر خیال آیا کہ ۱۹۳۴ء کے
آخر میں (جس کی یہ کہانی لکھی جارہی ہے) جو دستور العمل تیار کیا تھا
اس میں یہ سب رائیں چھاپ دی تھیں نسخہ نکال کر جو دیکھا تو وہ
رائیں موجود تھیں دیکھو ۱۹۳۴ء کی ہوشیاری کام آہی گئی اس دستورالعمل
میں ہر ایک عنوان کے ماتحت اچھی اچھی تصویریں بھی لگوا دی تھیں
ان میں زیادہ تر بچوں کے "کام" کی تھیں

مدرسہ ابتدائی کے کاموں کا پھیلاؤ ہوگیا تھا جس جگہ بہت سے
کام جمع ہو جائیں تو ضرورت اس بات کی رہتی ہے کہ ان کی جانچ
پڑتال کرکے یہ دیکھیں کہ کوئی کام غلط راہ پر تو نہیں جارہا ہے
پھر جانچ پڑتال کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ کام کو اور آگے بڑھائیں

اس کی ایک مثال یوں بھی سمجھو کہ جتنی دیوار اب تک تیار ہوئی ہے
اس پر اور مضبوط ردّے لگا کر دیوار اونچی کی جائے۔ یہ کام اور
مدرسوں میں جس طرح ہوتا ہے اس سے تو صرف لیپا پوتی ہو جاتی
ہے جامعہ نے اس سال پہلی دفعہ اس کام کو شروع کیا تو جانچ کی
بنیاد اس اصول پر رکھی کہ جانچنے والے استادوں کے مددگار کی
حیثیت سے کاموں کی ایک ایک تفصیل دیکھیں اس کام میں کئی
دن صرف کریں پھر اپنی تفصیلی رپورٹ اس انداز میں پیش کریں کہ
لوگ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں چنانچہ جامعہ کی اس پہلی
معائنہ کمیٹی کے رکن ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، خواجہ عبدالحی صاحب
عبدالحلیم صاحب احراری، برکت علی صاحب نے لڑکوں کے
سال بھر کے کاموں کی کاپیاں دیکھیں نئے اور پرانے کاموں کا
مقابلہ کیا۔ نصاب کے مطابق جو عادتیں لڑکوں میں پیدا ہونی
چاہئیں ان پر نظر ڈالی استادوں کو پڑھاتے اور لڑکوں کو پڑھتے
دیکھا شعبوں کا کام جانچا غرض دیکھنے میں اس بات کا خیال رکھا
کہ کیا کچھ ہوا ہے۔ آخر میں کچھ امتحان کی صورت میں بھی لڑکوں سے
پوچھا پھر اپنی تفصیلی رپورٹ شیخ الجامعہ صاحب کے سامنے رکھی
شیخ الجامعہ صاحب نے استادوں کے ایک جلسہ میں معائنہ کرنے

والوں کو بلا کر گفتگو کی کہ اب ہونا کیا چاہیے ؟

ہماری جامعہ کے پرانے طالب علم اکبر علی صاحب اسی سال
امریکہ سے تعلیم پاکر واپس ہوئے ان کے متعلق چوتھے سال کی کہانی
میں لکھ چکا ہوں کہ ۱۹۲۴ء میں جب ہم دونوں جامعہ کے طالب علم
تھے تو گرمیوں کی تعطیلات میں وحید اللہ صاحب، میں، اکبر صاحب
.... صاحب وغیرہ کھیتوں پر خربوزے کھانے کے لئے
چلے جایا کرتے تھے رات میں حاجی موسیٰ خاں صاحب کے ہاں
دلچسپ گپ شپ ہوا کرتی تھی جب جامعہ دہلی آئی تو ہماری ان
صحبتوں میں عبدالواحد صاحب بھی شریک ہو گئے ۱۹۲۷ء میں
تعلیم پانے کے لئے اکبر صاحب امریکہ چلے گئے انھیں کتابوں کے
مطالعہ کا شوق پہلے ہی سے تھا بیمار ہو کر وہاں کے ایک مشہور
ہسپتال میں داخل ہوئے تو دنیا بھر کی اچھی اچھی کتابیں پڑھ ڈالیں
اکبر صاحب دوسروں کی چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آتے ہیں
اس لئے اس مطالعہ کا اثر ان پر یہ ہوا کہ یہ بہترین نقاد بن گئے
آزادہ روی ان کی خاص صفت ہے دوستی کا بھید اسی میں ہے
کہ اگر کسی شخص کی ایک چیز بھی پسند آجائے تو آدمی کا دل ادھر
کھنچتا ضرور ہے اکبر صاحب کی آزادہ روی مجھے ان سے

جدا نہیں ہونے دیتی ہے اس لئے لڑائی ہونے پر بھی ہم دونوں سے
رہا نہیں جاتا ہے اور کسی نہ کسی عنوان سے بات چیت شروع
ہو جاتی ہے زیادہ تر حقہ اور سگریٹ اس خاموشی کو توڑ دیتے
ہیں ان کی اور بھی صفتیں ہیں اگر سب ایک جگہ لکھ دوں تو ایسا
معلوم ہو گا کہ جیسے اکبر صاحب پر مضمون لکھ رہا ہوں اس طرح "آپ بیتی"
کی خصوصیت جاتی رہے گی جس واقعے کے سلسلے میں اکبر صاحب کی
جو بات مجھے پسند آئے گی وہی لکھوں گا ایسا لکھنے میں مزا آتا ہے

اس سال گرمیوں کی یہ چھٹیاں میں نے کشمیر میں گزاریں۔
میرے ساتھ 'مالدیپ' کے تین لڑکے (جو جامعہ میں تعلیم پا رہے تھے)
شہاب الدین، محمد کمال، محمد دیاری بھی تھے۔ شہاب الدین کی
عمر کوئی دس سال کی ہو گی میں انھیں چوتھی جماعت میں پڑھا رہا تھا
مالدیپ کے ہونے کی وجہ سے اردو بہت کم جانتے تھے جامعہ کے
ماحول نے انھیں اردو بول چال سکھا دی اور کشمیر کے مناظر نے
مضمون نگاری

برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑوں کی چوٹیاں، پیچ در پیچ راستے
سرو کے اونچے اونچے درخت، چنار کے درختوں کی گھنی چھاؤں
ٹھنڈے اور میٹھے چشموں کا بہنا، شکاروں میں جھیل کی سیر، پانی

میں رہنے والے "ہاؤس بوٹوں" کی قطاریں، شام کے وقت ان کی روشنی کا عکس جھیل میں، باغوں کی سیر، رنگ برنگ کے پھول ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، گرم گرم حلوا، پھر ان چیزوں پر مضمون لکھنے کے لئے میرا اُکسانا۔ اِن سب باتوں نے شہاب الدین کو مضمون نگار بنا دیا۔ پیام تعلیم کے مُدیر نے اپنی رائے کے ساتھ اس مضمون کو چھاپ بھی دیا کہ وہ لڑکا جو دو سال پہلے اُردو لکھنا اور بولنا بالکل نہیں جانتا تھا اس کا یہ مضمون کم عرصہ میں زبان پر قابو حاصل کرنے کے لئے معیار کا کام دے گا